BNIS201DCT

قرآن اور حدیث

(The Qur'an and Hadith)

بی۔اے۔(آنرس)

چارسالہ پروگرام

دوسرا سمسٹر (اسلامک اسٹڈیز)

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

Copyright © 2025, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN : 978-81-993135-6-9
Course : The Qur'an and Hadith
First Edition : September 2025
Copies : 2100
Price : 180/ ((The price of the book is included in admission fee of distance mode students)

Course Coordinator

Dr. Alim Ashraf, Prof. (Arabic), Dept. of Arabic, MANUU

Editorial Board/Editors

Prof. Abdul Ali, Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh

Prof. Mohammad Ishaque
Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi

Prof. Mohammad Habib, HOD, Dept of Islamic Studies MANUU

Prof. Mohd. Fahim Akhter
Dept. of Islamic Studies, MANUU

Prof. Ghazanfar Ali Khan
Dept. of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU

Prof. Ziauddin
Dept. of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, Aligarh

Dr. Mohammad Haziq
Assistant Professor, Islamic Studies, CDOE, MANUU

Dr. Syeda Amina
Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, CDOE, MANUU

Production

Prof. Nikhath Jahan,
Professor (Urdu),
CDOE MANUU

Mr. P Habibulla,
Assistant Registrar, Purchase & Stores Section, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan,
Assistant Professor (C/Guest Faculty), CDOE MANUU

Mohd Abdul Naseer,
Section Officer, CDOE MANUU

Shaik Ismail, UDC,
CDOE, MANUU

Syed Faheemuddin, LDC
Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:
Centre for Distance and Online Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by Dr. Mohammad Haziq, Faculty of Islamic Studies, CDOE, MANUU
Printed at: Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

فہرست

پیغام		وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	5
پیغام		ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	6
کورس کا تعارف		کورس کو آرڈی نیٹر (اسلامک اسٹڈیز)	7
اکائی نمبر	**اکائی کا نام**	**مصنف**	**صفحہ نمبر**
1۔	وحی کا تعارف	ڈاکٹر محمد حاذق	9
2۔	قرآن کی بنیادی تعلیمات (حصہ اول)	مولانا اشہد جمال ندوی	25
3۔	قرآن کی بنیادی تعلیمات (حصہ دوم)	مولانا اشہد جمال ندوی	43
4۔	تدوین قرآن عہد نبوی میں	ڈاکٹر عاطف عمران	61
5۔	تدوین قرآن عہد صدیقی وعہد عثمانی میں	ڈاکٹر عاطف عمران	77
6۔	تفسیر کا تعارف	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	94
7۔	تاریخ اور مصادر تفسیر	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	112
8۔	اہم مناہج تفسیر: تفسیر بالماثور: ابن جریر طبری، تفسیر بالرائے: فخر الدین رازی	صالح امین	131
9۔	مشہور اردو تفاسیر: بیان القرآن، ترجمان القرآن	ڈاکٹر محمد حاذق	150
10۔	حدیث کا تعارف	ڈاکٹر محمد ارشد	166

11۔	اقسام حدیث: متواتر، مشہور، آحاد، صحیح، ضعیف	ڈاکٹر محمد ارشد	182
12۔	کتابت حدیث	پروفیسر غضنفر علی خاں	196
13۔	تدوین حدیث	پروفیسر غضنفر علی خاں	212
14۔	کتب حدیث کی اقسام:: مسند صحیح، سنن، جامع، معجم	ڈاکٹر سیدہ آمنہ	226
15۔	صحیحین: بخاری و مسلم کا تعارف	ڈاکٹر محمد ارشد ،ڈاکٹر محمد حاذق	243
16۔	سنن اربعہ: ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ کا تعارف	ڈاکٹر محمد ارشد ،ڈاکٹر محمد حاذق	257
	نمونہ امتحانی پرچہ		271

مصنفین کی تفصیلات

(Writer's Details)

Dr. Mohammad Haziq، Assistant Professor, Islamic Studies, CDOE, MANUU	ڈاکٹر محمد حاذق، اسسٹنٹ پروفیسر ،اسلامک اسٹڈیز، سی ڈی او ای، مانو، حیدرآباد
Maulana Ashad Jamal Nadwi, PGT teacher, Sr Secondary, Aligarh Muslim University, Aligarh	مولانا اشہد جمال ندوی، پی.جی.ٹی ٹیچر، سینیر سیکنڈری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Dr. Atif Imaran , Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Dept. Islamic Studies, MANUU	ڈاکٹر عاطف عمران، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، مانو، حیدرآباد
Maulana Khalid Saifullah Rahmani, Gen Secretary, Islamic Fiqh Academy & Head All India Muslim Personal Law Board	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، (جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی، صدر، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)
Dr. Saleh Ameen, Research Associate, DTTLP, MANUU.	ڈاکٹر صالح امین، ریسرچ اسوسیٹ، ڈی، ٹی ٹی، ایل پی، مانو
Dr. Mohd. Arshad, Asst. Prof, Dept. Islamic Studies, Jamia Millia Islamia	ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Ghazanfar Ali Khan, Dept. Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU	پروفیسر غضنفر علی خاں، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Syeda Amina, Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, CDOE, MANUU	ڈاکٹر سیدہ آمنہ، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، سی ڈی او ای ،مانو

نوٹ: زیر نظر کتاب کا علمی مواد (**Study Material**) مختلف مصنفین نے تیار کیا ہے اور اس سے کو آرڈی نیٹر و ایڈیٹر کا ان سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔

پروف ریڈرس(Proofreaders):

اول : ڈاکٹر محمد حاذق

دوم : ڈاکٹر سیدہ آمنہ

ٹائٹل پیج(Title Page):

ابراہیم اکرم صدیقی

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ +A حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد ہیں: (1) اردو زبان کا فروغ، (2) پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، (3) روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، اور (4) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 350 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری / گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعہ کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات و اطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثر انداز ہو گا۔

فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم و تدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلا معاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو / ہندی / انگریزی / عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھارہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والے عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا گیا جس کا خود اکتسابی مواد (Self Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیے جاچکا ہے۔

سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل انیس (19) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ سی ڈی او ای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2025-2026 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراؤتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جارہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارک (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضاﷲ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی او ای، مانو

کورس کا تعارف

موجودہ تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی(NEP-2020) کے تحت اسلامک اسٹڈیز کی کتابیں تیار کرائی جارہی ہیں۔ ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے استفادہ کا ذریعہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے چار سالہ (آٹھ سمسٹر) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں یونیورسٹی کو ملک بھر کے ماہرین اسلامک اسٹڈیز، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات حاصل رہیں، اور اس میں اسلامک اسٹڈیز کے تقریباً تمام موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامک اسٹڈیز کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ کے لیے معاون ثابت ہوگی۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق تیار کیا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم بی۔ اے۔ کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ سمسٹر دوم کے اس پہلے پرچہ کا عنوان ''قرآن اور حدیث'' ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت بی اے سمسٹر دوم کے لیے ہے۔ اس پرچہ میں کل سولہ اکائیاں ہیں۔ اس میں وحی، تدوین قرآن اور قرآن کے اہم مضامین سے آگاہی حاصل ہوگی، نیز فن تفسیر کے ارتقاء اور اس کے مختلف مناہج کے ساتھ حدیث کا تعارف اس کی تدوین اور اہم کتابوں سے متعلق تحریری مواد شامل کیا گیا ہے۔

پروفیسر سید علیم اشرف
کورس کوآرڈی نیٹر

اکائی 1: وحی کا تعارف

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 وحی

1.3 وحی کا مفہوم

1.3.1 قرآن کریم میں لفظ وحی کے استعمالات

1.3.2 نبیوں اور رسولوں پر وحی

1.4 تعلیمات وحی اور اس کی قسمیں

1.4.1 وحی متلو اور وحی غیر متلو

1.5 وحی نازل ہوتے وقت حضور ﷺ کی کیفیت

1.5.1 صلصلۃ الجرس

1.5.2 تمثیل ملک

1.5.3 فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا

1.5.4 رویائے صادقہ

1.5.5 کلام الٰہی

1.5.6 نفث فی الروع

1.6 فرہنگ

1.7 اکتسابی نتائج

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات
1.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات
1.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات
1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

اس اکائی میں ہم وحی کے متعلق جانیں گے کہ وحی کسے کہتے ہیں اور کس طریقے سے نازل ہوتی تھی۔ وحی اس کلام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی طرف نازل کرتے تھے۔ وحی کبھی خفیہ، کبھی ظاہری، کبھی رات کو، کبھی دن میں، کبھی فرشتے کا انسانی شکل میں، کبھی الہام والقا کرکے، اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں پر نازل کرتا ہے۔ نزول وحی پر غور کیا جائے تو حضرت آدمؑ سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک جتنے بھی انبیاء یارسول آئے۔ سب نے اللہ کی وحدانیت و کبریائی کی دعوت دی اور لوگوں کے سامنے حقیقی رب کا تصور پیش کیا۔ اس بات کی جانب بھی متوجہ کیا کہ ایک اللہ کی عبادت کرنے میں ہی دنیا و آخرت کی کامیابی مضمر ہے۔ نزول وحی کے بارے میں ظاہری اور جسمانی پہلو ہی منظر عام پر آئے کیونکہ یہی پہلو صحابہ کرام کے مشاہدے و تجربے میں آسکتا تھا۔ وحی کے تعلق سے جب ہم مشاہدہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ پر وحی کا ابتدائی دور اچھے سچے و پاکیزہ خوابوں سے شروع ہوا۔ جو کچھ بھی آپ خواب میں دیکھتے وہ دن کی روشنی کی طرح صحیح و سچا ثابت ہوتا۔ وحی کی ضرورت اس لیے پڑی کہ وحی انسان کو بہتر زندگی گزارنے کا طریقہ عطا کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ

- اس بات سے واقف ہو جائیں کہ وحی کیا ہے؟ اس کی شکلیں کیا ہوتی تھیں؟
- نزول وحی کے وقت رسول کریم ﷺ کی کیا حالت ہوتی تھی۔ وحی کی ضرورت کیوں پڑی؟
- اس میں وحی کی وضاحت کی جائے گی اور وحی کی قسموں کے بارے میں تفصیل سے جانیں گے۔

1.2 وحی

ارشاد ربانی ہے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إلا لِيَعْبُدُون" (ذاریات:56)۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے انس و جن کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان یا جنّات اللہ کی عبادت کیسے کریں؟ اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا چیزیں عبادت میں شامل ہے؟ کیا نہیں ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب سوائے اللہ کے اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ اللہ ہی ہے جو

ہمیں اپنی عبادت کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کیسے بتاتا ہے؟ اس کے بتانے کا طریقہ کیا ہو گا؟ کیونکہ وہ تو اپنے وجود اور ربوبیت کو مخفی (پوشیدہ) رکھا ہے، تو زمین والوں کو اپنا پیغام دینے کے لیے اس کا کیا طریقہ ہو گا؟ کس صورت میں وہ اپنا پیغام اپنے بندوں تک پہنچائے گا؟ اس کے لیے تو بس یہی کافی ہے کہ وہ کہہ دے کُن پس وہ ہو جاتا ہے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنے بندوں میں سے ہی کسی ایک کو منتخب کیا اور اس کو اپنا پیغمبر اور رسول بنایا اور اس کے پاس اپنے فرشتوں میں سے کسی ایک کے ذریعے اپنا پیغام پہونچایا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعے اسے مذکورہ باتوں کا علم ہوتا رہے۔

1۔ انسان کے حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، منھ اور ہاتھ وغیرہ

2۔ عقل 3۔ وحی

چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اس کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں اور بہت سی عقل کے ذریعہ اور جو باتیں ان دونوں کے ذریعہ نہیں معلوم ہوتی وہ وحی کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم حواس خمسہ کی بات کریں یا اس سے حاصل ہونے والے علم کی بات کریں تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص آپ کے سامنے بیٹھا ہو تو اسے آپ بتا سکتے ہیں کہ میرے سامنے ایک نوجوان یا بوڑھا شخص بیٹھا ہے۔ اس وقت آپ اپنے حواس خمسہ کا استعمال کرتے ہیں اور یہ پتہ لگا لیتے ہیں۔ اس طرح عقل کا استعمال کرکے آپ اس کے تخلیق کا اندازہ لگا سکتے ہیں، یہ پتہ کر سکتے ہیں کہ ضرور اس کو کسی نے جنم دیا ہے اس کو ضرور کسی نے پیدا کیا ہے لیکن آپ یہ بالکل بھی نہیں پتہ لگا سکتے کہ جو شخص آپ کے سامنے بیٹھا ہے اسے کس لیے پیدا کیا گیا ہے؟ اس کے پیدا کرنے کا مقصد کیا ہے؟ آپ کتنا بھی اپنی عقل اور حواس خمسہ کا استعمال کر لیں یہ چیزیں کبھی بھی پتہ نہیں لگا سکتے، اس کو وحی کے ذریعہ جانا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سوالات کا جواب دینے کے لیے جو ذریعہ مقرر کیا ہے اس کو "وحی" کہتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے یہ واضح ہو گیا کہ "وحی" انسان کے لیے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی کے معاملات کے مطابق جو اشکالات اور سوالات ہیں ان کو جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ کہہ لیجیے کہ وحی کی ضرورت پیش ہی وہیں آتی ہے جہاں عقل و حواس کام نہیں کرتے۔ جس طرح رنگ کا معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے اسی طرح بہت سے دینی معتقدات کا علم عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے اور ان کے ادراک کے لیے محض عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔

1.3 وحی کا مفہوم

وحی کے معنی: وحی کے لفظی معنی "خفیہ طور پر جلدی سے اشارہ کرنے" کے ہوتے ہیں اور 'ایحاءٗ' بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جلدی سے کوئی اشارہ کرنا۔ خواہ وہ اشارہ رمز و کنایہ استعمال کرکے کیا جائے یا کوئی بے معنی آواز نکال کر خواہ کسی عضو کو حرکت دے کر یا تحریر و نقوش استعمال کرکے ہر صورت میں لغوی معنی کے طور پر یہ صادق آتے ہیں۔

1.3.1 قرآن کریم میں لفظ وحی کے استعمالات

اشارہ کرنا:

حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ فرمایا گیا کہ: "فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا" (مریم:11)۔ (پس وہ اپنی قوم کے سامنے محراب سے نکلے اور انہیں اشارہ کیا کہ صبح و شام تسبیح کرتے رہا کرو)۔ اس آیت میں اشارہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ " وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ" (نحل:68)۔ (اور آپؐ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں اپنے گھر بنا...)۔ قرآن میں وحی کا لفظ "جبلت" (instinct) کے معنی میں اور فطری تعلیم کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی وہ اپنا گھر پہاڑوں، درختوں اور لوگوں کی چھتوں میں بنائے۔

الہام کرنا:

قرآن میں وحی کا لفظ الہام کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے یعنی یہ کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دینا۔ مثال کے طور پر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں ارشاد ہے: "وَأَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوسَى أَنْ أَرْضِعِيهِ" (قصص:7)۔ (اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی کی یعنی الہام کیا کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلائیں)۔

شیطانی وسوسہ:

شیطان جو دلوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں ان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ: "وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ" (انعام:112)۔ (اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے ایک نہ ایک دشمن ضرور پیدا کیا ہے جن وانس کے شیاطین [میں سے] جو ایک دوسرے کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں)۔ دوسری جگہ ارشاد باری ہے: "وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَى أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ" (انعام:121)۔ (اور بلاشبہ شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں تاکہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں)۔ اسی طرح اللہ رب العزت جب فرشتوں سے خطاب فرماتا ہے اس کو بھی "ایحاء" کہتے ہیں۔ فرمایا گیا: "إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ" (انفال:12)۔ (جب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اطلاع دیتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں)۔

1.3.2 نبیوں اور رسولوں پر وحی

قرآن کریم میں نبیوں اور رسولوں پر بھی وحی کا لفظ پیغام بھیجنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ" (نساء:163)۔ بے شک ہم نے آپؐ کی طرف بھی وحی بھیجی جیسا کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کے نبیوں پر بھیجی۔ لیکن یہ سب اس لفظ کے لغوی مفہوم ہیں۔

شرعی اصطلاح میں وحی کی تعریف یہ ہے: **كلامُ اللهِ المُنَزَّل على نبی من انبيائه**۔ اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر نازل ہو۔

لفظ "وحی" اپنے اصطلاحی معنی میں اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ اب اس کا استعمال پیغمبر کے سوا کسی اور کے لیے درست نہیں۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ "وحی" اور "ایحاء" دونوں الگ الگ لفظ ہیں اور دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے "ایحاء" کا مفہوم عام ہے اور انبیاء پر وحی نازل کرنے کے علاوہ کسی اور کو اشارہ یا کسی غیر نبی کے دل میں بات ڈالنے کو بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ نبی اور غیر نبی دونوں کے لیے مستعمل ہے بر خلاف "وحی" کے لفظ وحی صرف اور صرف انبیاء کے لیے خاص ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں لفظ ایحاء کا استعمال انبیاء اور غیر انبیاء دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن لفظ وحی سوائے انبیاء کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوا۔

وحی وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنا کلام اپنے کسی منتخب بندے اور رسول تک پہنچاتا ہے اور رسول کے ذریعہ تمام انسانوں کو پیغام پہنچایا جاتا ہے۔ وحی اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ایک مقدس تعلیمی رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا مشاہدہ صرف انبیاء وعلیہ السلام کو ہوتا ہے اس لیے اس کی ٹھیک ٹھیک حقیقت کا ادراک بھی ممکن نہیں البتہ اس کی اقسام اور کیفیت کے بارے میں قرآن وحدیث میں چند معلومات ہیں جن کو بیان کیا جا سکتا ہے۔

1.4 تعلیمات وحی اور اس کی قسمیں

وحی کی تعلیمات صرف خالص مذہبی نوعیت کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور دنیاوی ضرورت کے لیے بھی وحی کے ذریعے بندوں کو ان باتوں کی تعلیم ملتی ہے جو وہ محض اپنی عقل وحواس کے ذریعہ نہیں معلوم کر سکتا۔ انبیاء علیہ السلام کی وحی عموماً پہلی نوعیت کی ہوتی ہے لیکن بوقت ضرورت دنیاوی ضرورت کے لیے بھی۔ جیسا حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہے: "وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا" (ہود:37)۔ کشتی ہمارے سامنے ہماری وحی کے ذریعہ بناؤ۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ کشتی کی صنعت انہیں بذریعہ وحی سکھائی گئی اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھائی گئی اور آدم علیہ السلام کو خواص اشیاء کا علم بذریعہ وحی دیا گیا بلکہ ایک روایت کے مطابق علم طب بھی بنیادی طور پر بذریعہ وحی آپ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ وحی کی مختلف اقسام ہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ وحی کی ابتدائی تین قسمیں ہیں: (1) وحی قلبی، (2) کلام الٰہی اور (3) وحی ملکی۔

وحی قلبی:

وحی قلبی وحی کی وہ قسم ہے جس میں اللہ تعالیٰ براہ راست نبی کے قلب کو مسخر فرما کر اس میں کوئی بات ڈال دیتا ہے۔ اس قسم میں نہ فرشتہ کا واسطہ ہے اور نہ نبی کی قوت سامعہ اور حواس کا اور نہ ہی اس میں نبی کو کوئی آواز سنائی دیتی ہے بلکہ قلب میں کوئی بات جاگزیں ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ یہ کیفیت بیداری وخواب میں بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خواب کے ذریعہ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔

کلام الٰہی:

اس دوسری قسم کی وحی میں اللہ تبارک وتعالیٰ براہ راست انبیاء کرام سے ہم کلام ہوتا ہے اس صورت میں کسی فرشتے کا کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن نبی کو یہ آواز سنائی دیتی ہے اور یہ آواز ایک عجیب وغریب قسم کی ہوتی جس کا ادراک ہم انسانوں کی عقل سے پرے ہے۔ اس آواز کو ایک نبی ہی محسوس کر سکتا ہے۔ جس نبی سے اللہ رب العزت ہم کلام ہوتا ہے وہی اس کے سرور اور اس کی کیفیت کو پہچان لیتا ہے۔

یہ قسم وحی کی سب سے اعلیٰ اور افضل مانی گئی ہے کیونکہ اس قسم میں اللہ تعالیٰ براہ راست نبی سے ہم کلام ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے: ''وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا'' (نساء:164)۔ (اور اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے خوب باتیں کیں)۔

وحی ملکی:

یہ وحی کی تیسری قسم ہے اس قسم میں اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ نبیوں، رسولوں، پیغمبروں تک پیغام پہنچاتا ہے اس قسم کے اندر پیغام پہنچانے کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ اس میں کبھی فرشتہ نظر نہیں آتا صرف اس کی آواز سنائی دیتی ہے اور کبھی کبھی وہ انسانی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ اپنی شکل میں نمودار ہوتا ہے لیکن یہ شکل بہت ہی کم دکھائی دیتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے بھی وحی کی ان مختلف صورتوں کو بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے: ''وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولاً فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ'' (شوریٰ: 51)۔ (کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے، یا پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغمبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے، وحی کرتا ہے)۔

اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے وحی کی تمام اقسام کو بیان اور واضح کر دیا ہے۔ اس میں ''وحیا'' سے مراد دل میں بات ڈال دینا یعنی کہ وحی کی یہ پہلی قسم وحی قلبی ہے اور اسی طرح پردے کے پیچھے سے بات کرنا اس سے مراد وحی کلام الٰہی ہے اور جو تیسری قسم ہے اس سے مراد کسی پیغمبر یعنی فرشتے کے ذریعہ بات پہنچانا۔

اوپر ذکر کیے گیے تمام ذرائع وطرق نبیوں ورسولوں تک پیغام پہنچانے کے ذریعہ تھے لیکن اللہ کے رسول ﷺ پر جس طرح وحی نازل ہوتی تھی، ذرائع ابلاغ کے مطابق اس کی دو قسمیں تھیں:۔ وحی متلو اور دوسری وحی غیر متلو۔

1.4.1 وحی متلو اور وحی غیر متلو

وحی متلو اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت کی جاسکے یعنی کہ قرآن کریم جس کا ایک ایک لفظ تا قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے محفوظ کر دیا ہے اس میں کسی بھی طرح کا ردوبدل ممکن نہیں اس کا ایک نقطہ یا شوشہ بھی بدلا نہ جا سکا ہے اور نہ جائے گا اس وحی کو علماء کی اصطلاح میں ''وحی متلو'' کہتے ہیں۔

وحی کی دوسری قسم وہ وحی جس کی تلاوت نہ کی جاسکے جو قرآن کریم کا حصہ نہیں۔ ایسی وحی جس کے ذریعہ آپ ﷺ کو بہت

سارے احکامات عطا فرمائے گیے ہیں اس وحی کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔

وحی متلو یعنی کہ قرآن کریم میں اسلام کے اصولی قواعد اور بنیادی مسائل کی تشریح پر اکتفا کیا گیا اور ان تعلیمات کی تفصیل اور جزوی مسائل زیادہ تر وحی غیر متلو کے ذریعہ عطا کیے گیے اور یہ وحی غیر متلو صحیح احادیث کی شکل میں موجود ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''أُوتيتُ القرآنَ ومثله معه'' (مجھے قرآن اور اس جیسی دوسری تعلیمات بھی دی گئی)۔

اس حدیث میں دوسری تعلیمات سے مراد وحی غیر متلو ہے جیسا کہ ہم تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ بہت سارے ایسے مسائل ہیں یا ایسی باتیں ہیں جن کی تشریح ہمیں احادیث نبویہ سے حاصل ہوتی ہے اور ان کی تفصیل قرآن کریم میں موجود نہیں ہے مثلاً وضو کا مسئلہ، فرمایا گیا: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ'' (مائدہ: 7)۔ (اے ایمان والو جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو پہلے اپنے چہرہ کو دھولو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک اور مسح کرو سر کا اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھولو)۔

اس آیت کریمہ میں ایک مجرد حکم صادر فرما دیا گیا کہ نماز سے قبل یہ ساری چیزیں کرلو لیکن اس کی تشریح و تفصیل کے لیے ہمیں احادیث نبوی کا رخ کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ تفصیل کہ بدن کے کس حصے کو کتنی بار اور کس طرح سے دھوئیں۔ ان سب احکامات کی تفصیل حدیث میں ملتی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال جس سے ہر مسلمان واقف ہے کہ نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں ایک عرصے تک بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرتے رہے اور پھر حکم صادر ہونے کے بعد آپؐ نے بیت اللہ کی طرف رخ کیا۔ ارشاد فرمایا: ''وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ'' (البقرۃ: 143)۔ (اور جس قبلہ کی طرف آپؐ پہلے رخ کرتے تھے اسے ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ جان لیں کہ کون رسولؐ کی اتباع کرتا ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے)۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے تھے اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔ اب اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم صرف اس لیے دیا تھا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کون اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے اور کون نہیں۔ اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ اس امر کو اپنی جانب منسوب کرتا ہے کہ اس نے اس بات کا حکم دیا تھا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھو تو اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی وحی کے ذریعہ حکم دیا تھا جو قرآن میں کہیں مذکور نہیں اور اس وحی کا نام غیر متلو ہے۔

ایک اور مثال ارشاد ربانی ہے ''فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ'' (تحریم: 3)۔ (پس جب اس [عورت] نے آپ ﷺ کو اس کی خبر دی اور اللہ نے اس کو آپؐ پر ظاہر کر دیا)۔

اس آیت کی مختصر تشریح یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو وہ باتیں وحی کے ذریعہ بتلادیں جو آپؐ کی زوجہ مطہرہ نے چھپائی تھی۔ جب آپؐ نے ان کو یہ بات واضح کردی تو اس پر انہوں نے آپؐ سے پوچھا کہ یہ بات آپ کو کس نے بتلائی تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ بات مجھے علیم و خبیر اللہ تعالیٰ نے بتلائی ہے۔ حالانکہ یہ بات پورے قرآن کریم میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے اس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔

1.5 وحی نازل ہوتے وقت حضور ﷺ کی کیفیت

حضور ﷺ پر مختلف طریقوں سے وحی کا نزول ہوتا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ کبھی وحی کے نزول کا بوجھ اتنا شدید ہوتا کہ اگر آپ کسی جانور پر ہوتے تو وہ اس کی شدت برداشت نہیں کرپاتا تھا۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: "**أحيانا يأتيني مثل صلصلة الجرس وهو أشده عليَّ فيفصم عنّي وقت وعيت ماقال وأحيانا يتمثل لي الملك رجلاً**"۔ (کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے اور وحی کی یہ صورت میرے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ آواز نے کہا ہوتا ہے مجھے یاد ہوچکا ہوتا ہے اور کبھی کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک انسان کی شکل میں ظاہر ہوجاتا ہے)۔

اس حدیث کا مطالعہ کیا جائے تو وحی کے نزول کے دو ہی طریقے معلوم ہوتے ہیں پہلا طریقہ صلصلۃ الجرس یعنی کی گھنٹی بجنے کی آواز اور دوسرا طریقہ تمثیل ملک یعنی کی فرشتہ کا کسی مرد کی صورت میں سامنے آجانا لیکن دوسری حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو طریقوں کے علاوہ بھی کئی طریقے تھے۔ علامہ حلیمیؒ (متوفی 403ھ جن کی کتاب "المنہاج" اصول دین پر ایک جامع کتاب ہے) نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ پر وحی چھیالیس طریقوں سے نازل ہوتی تھی لیکن حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حامل وحی (یعنی کہ جبرئیل علیہ السلام) کی مختلف صفات کو وحی کی مختلف طریقے شمار کرکے ان کی تعداد کو چھیالیس تک پہنچادی ہے۔ ان کے علاوہ بھی دوسری حدیث سے نزول وحی کے دوسرے اہم طریقے ثابت ہیں جن کو درج ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔

1.5.1 صلصلۃ الجرس

یہ پہلا طریقہ ہے اس میں آپ ﷺ کو اس قسم کی آواز آیا کرتی تھی جس طرح گھنٹیاں بجتی ہیں حدیث میں صرف اتنا ہی مذکور ہے لیکن علماء کرام کا خیال ہے کہ یہ فرشتے کی آواز ہوتی تھی اور بعض کا خیال ہے کہ فرشتہ اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا تھا اس سے یہ آواز پیدا ہوتی تھی۔

علامہ خطابیؒ کا کہنا ہے کہ یہاں گھنٹی کی آواز کو ترنم میں نہیں بلکہ اس کے تسلسل کے مفہوم میں لیا گیا ہے جس طرح کسی گھنٹی کی آواز میں تسلسل ہوتا ہے وہ کہیں ٹوٹتی نہیں اس طرح وحی کی بھی آواز میں تسلسل ہوا کرتی تھی لیکن یہ تمام چیزیں محض قیاسات ہیں اور ان کی بناء پر کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری نے شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی سے نقل کرکے اس تشبیہ کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ ان سے مختلف

ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ تشبیہ صرف دو اعتبار سے دی گئی ہے۔ ایک تو آواز کے تسلسل کے اعتبار سے اور دوسرے اس اعتبار سے کہ گھنٹی جب مسلسل بج رہی ہو تو عموماً سننے والے کو کسی ایک جہت یا کسی ایک سمت کا تعین کرنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور باری تعالیٰ چونکہ جہت اور مکان سے منزہ ہے اس لیے کلام الہی کی یہ خصوصیات ہے کہ یہ کسی ایک جہت سے نہیں بلکہ ہر جہت اور سمت سے آتی ہے۔ اس کیفیت کا صحیح ادراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں لیکن عام فہمی کے لیے آنحضرت ﷺ نے اس کو گھنٹی کی آواز سے تشبیہ دی ہے۔ اس بات کا صحیح علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے یا آپ ﷺ کو جس پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "وهو أشده علىّ"، (یہ طریقہ میرے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے) اس الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ وحی کا ہر طریقہ سخت ہوتا تھا لیکن اس گھنٹی کی آواز والا طریقہ ان سب میں سب سے زیادہ بار ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ اس حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ: "**ولقد رايته ينزل عليه الوحى فى اليوم الشديد البرد فيفصم عنه وأن جبينه ليتفصد عرقاً**"، (حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت کڑاکے کی سردی میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی اور جب اس کا سلسلہ موقوف ہوا تو آپ ﷺ کی پیشانی پسینے سے شرابور تھی)۔

ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کی سانس رکنے لگتی، چہرہ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے اور اور آپ کو اتنا پسینہ ہوتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلنے لگتے تھے۔

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات بہت شدت پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اپنا سر اقدس حضرت زید بن ثابتؓ کے زانو پر رکھا تھا اسی حالت میں وحی کا نزول ہونے لگا اس سے حضرت زید بن ثابت کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی۔ مسند احمد کی ایک روایت میں آپ ﷺ خود فرماتے ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری روح کھینچ رہی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ نزول وحی کی آواز دوسروں کو بھی سنائی دیتی تھی جیسا کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کے چہرہ انور کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی۔ یہ تو وحی کی پہلی صورت تھی جس کے نزول کے وقت آپ ﷺ کو بہت زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

1.5.2 تمثیل ملک

یہ وحی کے نزول ہونے کی دوسری صورت ہے۔ اس صورت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپؐ کے پاس نمودار ہوتا تھا اور آپؐ کو اللہ کا پیغام پہونچا دیتا تھا۔ روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ ہمیشہ ایسے موقع پر مشہور صحابی دحیہ کلبیؓ کی صورت میں تشریف لاتے تھے۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ کا انتخاب شاید اس لیے کیا گیا ہو کہ وہ اپنے وقت کے حسین ترین انسان تھے۔ اتنے حسین کہ اپنے چہرے کو لپیٹ کر چلا کرتے تھے۔ البتہ بعض مواقع پر دوسرے انسان کی شکل

میں آنا بھی ثابت ہے۔ کسی اجنبی کی شکل میں آنا۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ کی مشہور روایت میں وہ بالکل ایک اجنبی کی شکل میں تشریف لائے تھے اور حضور ﷺ سے اتنی بے تکلفی سے بات کررہے تھے کہ وہاں پر موجود تمام صحابہ کرام اچنبھے میں پڑ گیے اور مقصد بھی یہی تھا کہ تمام لوگ جو آپ ﷺ کے پاس موجود ہیں وہ سب اچنبھے میں پڑ جائیں۔

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت جبرئیلؑ ہی آپؐ کے پاس وحی لاتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے: "قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ" (بقرہ:97)۔ (کہہ دو کہ جو شخص جبرئیل کا دشمن ہو تو[ہوا کرے]اس نے یہ قرآن آپؐ کے دل پر اتارا ہے)۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عموماً حضرت جبرئیلؑ ہی وحی لایا کرتے تھے۔ البتہ امام احمد نے اپنی تاریخ میں امام شعبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابتداء نبوت میں تین سال تک حضرت اسرافیلؑ وحی لاتے رہے ہیں لیکن ان کے ذریعہ قرآن کریم نازل نہیں کیا گیا قرآن کریم تمام کا تمام حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ نازل کیا گیا۔ لیکن علامہ واقدیؒ نے اس روایت کو رد کرتے ہوئے کہا کہ آپؐ کے پاس سوائے حضرت جبرئیلؑ کے کوئی بھی فرشتہ وحی لے کر نہیں آیا۔ حافظ ابن حجرؒ اس روایت کو قبول کرنے کی طرف مائل ہیں اور اسے زمانہ فترت کا واقعہ قرار دیتے ہیں۔ بہر حال ابو عوانہ کی روایت کے مطابق آپؐ نے وحی کی اس صورت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "وهو أهونه عليّ"، (اور یہ صورت میرے لیے سب سے آسان ہوتی ہے)۔ کیونکہ وحی کی اس صورت میں فرشتہ انسانی شکل میں موجود ہوتا تھا اسی وجہ سے آپ ﷺ کو اس میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوا کرتی تھی۔

یہ تو وہ صورتیں تھیں جو حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتی ہیں اس کے علاوہ دوسری قسمیں بھی ہیں جو دیگر حدیث میں مذکور ہے درج ذیل ہیں:

1.5.3 فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا

اس صورت میں فرشتہ یعنی حضرت جبرئیلؑ اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتے تھے ویسے اکثر وہ انسانی شکل میں ہی آتے تھے لیکن ان کے آنے کی ایک صورت ایسی بھی تھی لیکن یہ واقعہ آپؐ کی زندگی میں دو یا تین بار واقع ہوا۔ ایک مرتبہ اس وقت جب کہ خود نبی ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ دوسری بار جب آپؐ کو معراج کی سیر کرائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت جبرئیلؑ کو نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں مکہ مکرمہ کے مقام جیاد پر دیکھا۔ پہلے دو واقعات تو صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں البتہ تیسرا واقعہ سند کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔

1.5.4 رویائے صادقہ

یہ بھی ایک وحی کی صورت ہے۔ انبیاء کرام کو جو خواب دکھائے جاتے تھے وہ سچے ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو نبیوں کو خواب کے ذریعہ بھی پیغام پہونچاتا تھا جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ واقعہ جس میں انہوں نے اپنے فرزند

حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں۔ اسی طرح آپؐ بھی جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح سچ ہو تا تھا۔ آپؐ جیسا بھی خواب دیکھتے بیداری میں ویسا ہی ہو تا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "**اوّل مابدی به رسول الله من الوحی الرؤیا الصالحة فی النوم فکان لا یری رؤیا إلا جاءت مثل فلق الصبح**"، (آپ ﷺ پر وحی کی ابتداء نیند کی حالت میں سچے خوابوں سے ہوئی اس وقت آپ ﷺ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح سچ نکلتا۔

1.5.5 کلام الٰہی

یہ بھی اللہ تعالیٰ کے وحی کا ایک طریقہ ہے جس میں وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہو تا ہے اس سے ہم کلام ہو تا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوا تھا اسی طرح آپ ﷺ سے بھی اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوا تھا یہ واقعہ شب معراج کے وقت واقع ہوا۔

1.5.6 نفث فی الروع

یہ وحی کا وہ طریقہ ہے جس میں حضرت جبرئیلؑ کسی بھی شکل میں سامنے آئے بغیر آپ ﷺ کے قلب مبارک میں کوئی بات ڈال دیتے تھے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ: "**إن روح القدس نفث فی روعی**"، (روح القدس جبرئیلؑ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی)۔

اسی طرح مستدرک حاکم کی ایک روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "**إن جبرائیل ألقی فی روعی أن أحداً منکم لن یخرج من الدنیا حتی یتکمل رزقه**"، (جبرئیلؑ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ تم میں سے کوئی دنیا سے نہیں جائے گا تاوقتیکہ وہ اپنا رزق نہ پورا کرلے)۔

ان تمام صورتوں اور طریقوں سے وحی کا نزول ہو تا تھا۔ اب ان تمام صورتوں کو بیان کرنے کے بعد یہاں یہ جاننا ضروری ہو تا ہے کہ وحی کی ابتداء کیسے ہوئی؟ تو اس سلسلے میں صحیح بخاری کی ایک حدیث جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (نبی کریم ﷺ پر وحی کا ابتدائی دور اچھے سچے وپاکیزہ خوابوں سے شروع ہوا)۔ آپ جو کچھ بھی خواب میں دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح اور سچا ثابت ہو تا۔ پھر من جانب قدرت آپؐ تنہائی پسند ہو گیے اور آپؐ نے غار حرا خلوت نشینی اختیار کرلی اور کئی کئی دن اور رات وہاں مسلسل عبادت الٰہی وذکر وفکر میں مشغول رہتے۔ جب تک گھر آنے کو دل نہ چاہتا توشہ ہمراہ لیے ہوئے وہاں رہتے۔ توشہ ختم ہونے پر ہی اہلیہ محترمہ خدیجہؓ کے پاس تشریف لاتے اور کچھ توشہ ہمراہ لے کر پھر وہاں جاکر خلوت گزیں ہو جاتے۔ یہی طریقہ جاری رہا یہاں تک آپ ﷺ پر حق منکشف ہو گیا اور آپؐ غار حرا ہی میں قیام پذیر تھے کہ اچانک جبرئیلؑ نبی ﷺ کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے: "اے محمدؐ! پڑھو" آپؐ فرماتے ہیں کہ: "میں نے کہا: 'میں پڑھنا نہیں جانتا'"، پھر آپؐ کو فرشتے نے پکڑ کر اتنے زور سے بھینچا کہ آپ ﷺ کی طاقت جواب دے گئی۔ پھر آپ ﷺ کو چھوڑ کر کہا کہ: "اے محمدؐ! پڑھو"، آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا کہ: "میں پڑھنا نہیں جانتا"۔ فرشتے نے تیسری بار آپ ﷺ کو بھینچا اور چھوڑ دیا اور کہنے لگا کہ: "پڑھو اپنے رب کے نام کی مدد سے جس نے پیدا کیا، انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا"۔ جیسا کہ ہم سب جانتے

ہیں کہ پہلی وحی سورہ عَلَق کی ابتدائی چند آیتیں اتری ہیں۔ یہیں سے وحی کی ابتداء ہوئی اور یہی پہلی وحی آپ ﷺ پر حضرت جبرئیلؑ لے کر نازل ہوئے۔

وحی متلو کے ذریعہ جو خدا کا کلام نازل ہوا ہے اسے قرآن کہتے ہیں۔ قرآن کو بھی مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کے کئی نام ذکر کیے ہیں۔ جو اس کی بعض صفات اور خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قرآن تو ذاتی نام ہے باقی نام صفاتی ہیں۔ الکتاب، الفرقان، الذکر، التنزیل، المجید، الحکیم وغیرہ ان ناموں کے علاوہ اور بھی صفاتی نام ہیں جن کی تعداد تقریباً 55 بیان کی گئی ہیں۔

قرآن کے معنی: لفظ قرآن کے معنی کے بارے میں کئی اقوال ہیں، ان میں یہ سب سے زیادہ مشہور ہے ''قرء'' اس کے معنی پڑھنے کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بیان ہے کہ: ''لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ○ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ○ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ'' (قیامہ: 16 تا 18)۔ (اے نبی! آپ اس کو جلدی سیکھنے کے لیے اپنی زبان کو تیز حرکت نہ دیں بے شک اس کا جمع کرنا اور اس کا سنانا ہماری ذمہ داری ہے۔ پھر ہم جب اس کو پڑھ کر سنائیں تو آپ اس تلاوت کی پیروی کریں''۔

رب العزت نے قرآن مجید کو ماہ رمضان المبارک کی لیلۃ القدر میں لوح محفوظ سے بیت العزت سماء دنیا پر مکمل اتارا۔ اس نزول کے متعلق قرآن کریم میں مذکور ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِي لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ'' (قدر: 1)۔ (ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ''شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ'' (بقرہ: 185)۔ (وہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا)۔

قرآن کی اصطلاحی تعریف: علماء کرام نے قرآن کی درج ذیل اصطلاحی تعریف کی ہے ''**القرآن هو كلام الله المعجز المنزل على سيدنا محمد ﷺ بواسطة جبرائيل، المكتوب فى المصاحف، المستعبد بتلاوته والمنقول بالتواتر**''۔ قرآن اللہ کا وہ کلام ہے جو معجزہ ہے جسے حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ حضور نبی کریم ﷺ پر نازل کیا گیا۔ جو صحیفوں میں لکھا ہوا ہے جس کی تلاوت کرنا عبادت ہے اور جو تواتر سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

ہر کتاب کے کچھ نہ کچھ مضامین ہوا کرتے ہیں جس کے تحت وہ کتابیں لکھی جاتی ہیں اور وہ کتاب انہیں مضامین کا احاطہ کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں انسان کی ہدایت کے لیے بہت سارے مضامین ہیں۔ جس کو علوم قرآنی بھی کہا جاتا ہے لیکن اس کی صحیح تعداد کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی مستند تصنیف ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں قرآن کے جملہ مضامین، مباحث اور موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ نے کمالِ مہارت سے جملہ قرآنی علوم کو صرف پانچ علوم میں سمیٹ کے رکھ دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن مجید کے مضامین کی تعداد کل پانچ ہیں جس کو علوم پنجگانہ بھی کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن کے جملہ معانی یہ پانچ علوم سے باہر نہیں ہیں: 1- علم الاحکام، 2- علم مخاصمات، 3-

علم تذ کیر بالآء اللہ، 4- علم تذ کیر بایام اللہ اور 5- علم تذ کیر بالموت ومابعد الموت۔

- **علم الاحکام:** وہ علوم داخل ہیں جن کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور نہ کرنے سے منع کیا گیا ہے یعنی کی امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ امر بالمعروف جیسے کہ صوم وصلوٰۃ، سچ بولنا وغیرہ نہی عن المنکر جیسے کہ شرک کرنا، غیبت، چوری، زنا وغیرہ ان تمام چیزوں کو علوم احکام کے دائرے میں رکھا ہے۔
- **علم مخاصمات:** (ڈبیٹ) اس علم میں چار مذہبی فرقوں مشرکین، منافقین، یہود ونصاریٰ کے عقائد پر تنقید کی گئی ہے اور ان کے نظریات واعمال کی اصلاح کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں توریت اور انجیل بھی زیر بحث آئے ہیں۔
- **علم تذ کیر بالآء اللہ:** اس قسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو اور اپنے احسانات کا ذکر کر کے انسان کو اپنی عبادت کرنے کی تلقین کی ہے نعمت سے منعم کا تصور دیا ہے اور اللہ کے اس احسانات اور اس کی نعمتوں کے حوالے سے اس کی عبادت اور اس کا شکریہ ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ فرمایا گیا: ''لَئِنْ شَكَرْتُمْ لأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ'' (ابراہیم: 7)۔
- **علم تذ کیر بایام اللہ:** اس علم کے مطابق قرآن مجید کے اندر گذشتہ قوموں اور پیغمبروں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ انسان اپنے ماضی سے عبرت ونصیحت حاصل کرے۔ ان کے تاریخی احوال بیان کر کے کہیں عبرت دلایا گیا ہے، کہیں ڈرایا گیا ہے اور کہیں خوشخبری دی گئی ہے۔
- **علم تذ کیر بالموت ومابعد الموت:** اس قسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے مرنے کے بعد کی زندگی کا ذکر کیا ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد کیا کیا ہوگا۔ جنت ودوزخ کی کیفیات بیان کی گئی ہے۔

غرض یہ کہ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جو انسان کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے مرنے تک کہ تمام طریقہ زندگی کو بیان کر دیا ہے۔ ایمانیات، اخلاقیات، عبادت، معاملات وغیرہ۔ غرض قرآن نے زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کرنے کے لیے احکامات بیان کر دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم وحی متلو یعنی قرآن کریم اور دوسری قسم وحی غیر متلو ان دونوں میں فرق یہی ہے کہ وحی متلو یعنی قرآن کریم لفظ بہ لفظ پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کی طرف بعینہ نازل ہوا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں موجود ہے لیکن اس کے برعکس وحی غیر متلو اس میں مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئے ہیں اور انہیں تعبیر کرنے کے لیے لفظ کا انتخاب حضرت جبرئیل علیہ السلام کرتے تھے یا پھر آپ ﷺ کرتے تھے لیکن وحی متلو میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی دخل نہیں ہے جس طرح اس کے مضامین اللہ کی جانب سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی من وعن اللہ کی طرف سے نازل ہوئے اور یہی تمام اہل سنت اور اہل تشیع کا عقیدہ ہے۔ یہاں اس بات کا اشارہ اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ بہت سے مادہ پرست لوگوں کے اعتراضات اور وحی کے بارے میں مرعوب لوگوں نے بہت سارے دعوے کیے ہیں کہ قرآن کریم کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا تھا اور (معاذ اللہ) اس کی ترکیبیں انشاء وغیرہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف سے نازل ہوئی تھیں لیکن یہ خیال بالکل غلط اور مہمل ہے۔ قرآن خود اس بات کی تردید کرتا ہے چنانچہ قرآن کی بہت ساری آیات سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ قرآن کے معنی والفاظ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ ذیل میں چند

دلائل ملاحظہ کریں:

قرآن کریم نے اپنی ایک صفت عربی بتائی ہے یعنی یہ کہ اس کو عربی میں نازل کیا گیا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "إِنَّآ أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا" (یوسف:2)۔ (ہم نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا)۔ اگر اس کا مفہوم ومعانی بذریعہ وحی نازل ہوا ہوتا تو یہاں عربیاً کے معنی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہوتا کیونکہ اس میں عربیت الفاظ کی صفت ہے معانی کی نہیں۔

قرآن کریم میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے تین منصبی فرائض بتائے گیے۔ "يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ" (بقرہ: 129)۔ (ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کریں اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیں اور انہیں پاک وصاف بنائیں)۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی ذمہ داری وفرائض الگ الگ تھے۔ اللہ کی آیات کی تلاوت کرنا اور ان کی تعلیم لوگوں کو سکھانا اور بتانا۔ ظاہر سی بات ہے تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے نہ کہ معنی سے کوئی بھی شخص معنی ومفہوم کی تلاوت نہیں کرتا۔ لہذا آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے سب سے پہلے منصب فریضہ کا تعلق صرف الفاظ قرآن سے ہے۔

قرآن کریم نے اپنے لیے جابجا الکتاب کا لفظ استعمال کیا ہے اور لفظ کتاب کا اطلاق صرف ذہنی مضامین میں نہیں ہوتا بلکہ جب اس مضامین کو الفاظ کے پیرائے میں نہ ڈھالا جائے تب تک وہ کتاب نہ کہلائے گی اس لیے اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے لفظ اور معانی دونوں منزل من اللہ ہیں۔

سورہ قیامہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ○ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ○ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ" (قیامہ: 16 تا 18)۔ اس سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ جب بھی جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آتے تو آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اس کو جلدی جلدی یاد کرنے کی کوشش کرتے اور جلدی جلدی الفاظ دہراتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرمایا اس کو یاد کرنے، اس کو پڑھادینے کا اور اس کے معانی ومفاہیم اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔

ان واضح اور دلائل کی روشنی میں یہ گمان بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ الفاظ قرآن وحی کے ذریعہ نازل نہیں کیے گیے۔ شیخ محمد عبد العظیم زرقانیؒ نے بڑی اچھی بات لکھی ہے فرماتے ہیں کہ اس مقام پر بحث کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن کریم کے تو الفاظ اور معنی دونوں باتفاق بذریعہ وحی نازل ہوئے۔

قرآن اور حدیث قدسی میں فرق کے چند نکات درج ذیل ہیں:

- قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کے الفاظ ومعانی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں جب کہ حدیث قدسی میں مفہوم اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور الفاظ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے ہوتے ہیں۔
- قرآن کی تلاوت کرنا عبادت ہے جب کہ حدیث قدسی کا پڑھنا عبادت نہیں لیکن ثواب کا کام ہے گویا قرآن وحی متلو اور حدیث قدسی وحی غیر متلو ہیں۔

- قرآن کے ثبوت کے لیے امت کا اتفاق اور تواتر کا ہونا شرط ہے مگر حدیث قدسی کے لیے یہ شرط نہیں۔
- قرآن مجید جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ نازل ہوا لیکن حدیث قدسی میں اس فرشتے کا واسطہ اور ذریعہ ہونا ضروری نہیں۔
- قرآن معجزہ ہے اور حدیث قدسی معجزہ نہیں ہے۔
- قرآن مجید کو بغیر طہارت کے چھونا درست نہیں جب کہ اس کے برعکس حدیث قدسی کو بغیر وضو کے بھی چھونا جائز ہے۔

1.6 فرہنگ

ربوبیت	:	پروردگار یا خُدا ہونا، خُدائی، پروردگاری
وسوسہ	:	شیطانی خیال جو کفر اور گناہ کا باعث ہو، شک، شبہ، بدگمانی، جھوٹا خیال
توشہ	:	عموماً وہ کھانا جو مسافر کے ساتھ ہو، اس قدر خوراک جس سے زندگی قائم رہے
خلوت گزیں	:	لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنے والا، تنہائی میں بیٹھنے والا، گوشہ گیر

1.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کے الفاظ و معانی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں جب کہ حدیث قدسی میں مفہوم اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور الفاظ آپ ﷺ کے ہوتے ہیں۔
- وحی متلو جس میں الفاظ اور معنی اللہ تعالیٰ کے ہوں یعنی قرآن مجید یہ پورا کا پورا وحی متلو ہے اور اس کا ایک ایک حرف اللہ کی طرف سے ہے۔
- وحی غیر متلو جس کے معانی و مفہوم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں ادا فرمایا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حدیثوں کی نوعیت یہی ہے۔
- قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کے الفاظ و معانی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں جب کہ حدیث قدسی میں مفہوم اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور الفاظ آپ ﷺ کے ہوتے ہیں۔
- تمثیل ملک میں فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپؐ کے پاس نمودار ہوتا تھا اور آپؐ کو اللہ کا پیغام پہونچادیتا تھا۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. وحی کے لغوی معنی کیا ہیں۔

2. کلام الٰہی میں اللہ تبارک وتعالیٰ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہم کلام ہوتا ہے؟

3. ۔۔۔۔۔جس میں حضرت جبرئیلؑ کسی بھی شکل میں سامنے آئے بغیر آپ ﷺ کے دل میں کوئی بات ڈال دیتے تھے۔

4. وحی ملکی میں اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔پیغام پہونچاتا ہے؟

5. رویائے صادقہ میں جو خواب دکھائے جاتے تھے وہ۔۔۔۔۔ہوتے تھے۔

1.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. وحی کی قسم سلسلۃ الجرس کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔
2. وحی کا تعارف کرایے۔
3. وحی کا طریقہ نفث فی الروع کا تعارف کرایے۔
4. تمثیل ملک کے بارے میں لکھیے۔
5. وحی غیر متلو کو قلمبند کیجیے۔

1.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. کیا قرآن کے معنی صرف وحی کے ہیں؟ جامع نوٹ لکھیے۔
2. تعلیمات وحی اور اس کی قسموں کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔
3. نزول وحی کے طریقے پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. علوم القرآن : مولانا محمد تقی عثمانی
2. علوم القرآن : ڈاکٹر صبحی صالح
3. آسان علوم القرآن : پروفیسر مولانا محمد رفیق

معروضی سوالات کے جوابات

5. سچے	4. نبیوں، رسولوں اور پیغمبروں	3. نفث فی الروع	2. انبیائے کرام	1. خفیہ طور پر جلدی سے اشارہ کرنے

اکائی 2: قرآنی تعلیمات (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات

2.2.1 قرآنی اخلاق کے نمایاں پہلو

2.2.2 اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

2.3 قرآن مجید کی سماجی تعلیمات

2.3.1 قرآن کی نگاہ میں معاشرہ

2.3.2 سماجی ذمہ داریاں

2.3.3 نیکی کا ہمہ گیر تصور

2.3.4 برائیوں کے سر چشمہ پر قدغن

2.4 فرہنگ

2.5 اکتسابی نتائج

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

2.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

2.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

قرآن مجید روئے زمین پر اللہ کی سب سے بڑی نعمت اور انسانیت کی رہنمائی کے لیے سب سے اہم ضرورت ہے۔ قرآنی تعلیمات میں دین اسلام کے اصول و قواعد، انسانی اخلاق وآداب کی تشریح، فرد کی تربیت، سیاسی، سماجی، معاشی اور تمدنی احکام بیان کیے گیے ہیں اسی وجہ سے چودہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی قرآن مجید کی تعلیمات انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس اکائی میں قرآن کریم کی اخلاقی تعلیمات، سماجی تعلیمات سے متعلق احکام، آداب اور ذمہ داریوں کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ

- اس بات سے واقف ہوں گے کہ قرآن کریم میں کس طرح کی تعلیمات ذکر کی گئی ہیں۔
- زندگی کے مختلف میدانوں کے بارے میں قرآن کی اصولی ہدایات سے انہیں آگاہی ہوگی۔
- جان سکیں کہ قرآن کے پیش کردہ اخلاقی تعلیمات کیا ہیں؟ قرآن کی سماجی تعلیمات میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کیا مقاصد ہیں اس سے طلبہ واقف ہو سکیں گے۔

2.2 قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات

قرآن مجید زندگی کے ہر پہلو پر بہترین رہنمائی کرتا ہے۔ اخلاقیات اس کی توجہ کا خاص محور ہے، اس میں انسانی زندگی کی تہذیب و شائستگی کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قوم یا فرد کی زندگی کے لیے کس قسم کے آداب و اخلاق کی ضرورت ہے، اس نے وہ تمام ذرائع بھی تلقین کیے ہیں جن سے افراد کا کردار درست ہو اور وہ اس قابل ہو سکیں کہ معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں خوش اسلوبی سے حصہ لیں۔ قرآن مجید کے سب سے پہلے مخاطب نبی اکرم ﷺ قرآن کے مطلوبہ اخلاق کے اعلی ترین نمونہ تھے۔ (القلم: 4) آپ نے فرمایا: ”میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔“

1. قرآن کا نظریۂ اخلاق

اسلام کے دیگر ارکان کی طرح اخلاق بھی اسلامی نظام زندگی کا ایک شعبہ ہے۔ قرآن نے عقائد و عبادات کے بعد سب سے زیادہ درستی اخلاق پر زور دیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بندہ عقائد و عبادات میں جس طرح اپنے رب کی مرضی کا پابند ہوتا ہے، اسی طرح زندگی کے طور طریق، شب و روز کے معمولات اور حقوق کی ادائیگی میں بھی اس کی مرضی کا پابند ہو۔ قرآن نے مختلف طریقے اور اسلوب میں اخلاقی تعلیمات پیش کی ہیں، کبھی برائیوں کے اسباب کی نشاندہی کر کے، اس کے تدارک کی صورتیں بتائی ہیں تو کبھی اخلاق حسنہ کو عمدہ تشبیہات کے ذریعہ پیش کر کے مخاطب کو لبھایا ہے۔ اچھے اخلاق کے اچھے نتائج اور برے اخلاق کے برے نتائج کو بھی کھول کھول کر بیان کیا

ہے نیز فضائل اخلاق کو الوہیت اور ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان اور ابلیس کے خصائص میں داخل کیا ہے۔ اس سے فضائل کو اختیار کرنے اور رذائل سے بچنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً عفو ودرگزر کی تعلیم دیتے وقت فرمایا: إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا (النساء:149)(مظلوم ہونے کی صورت میں اگرچہ تمہیں بدگوئی کا حق ہے) لیکن اگر تم ظاہر وباطن میں بھلائی کیے جاؤ یا کم از کم برائی سے درگزر کرو تو اللہ بھی بڑا معاف کرنے والا ہے (حالاں کہ سزا دینے پر) پوری قدرت رکھتا ہے۔ قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو۔

قرآن کی رو سے بد اخلاقی کا سب سے بڑا سبب بروں کی صحبت ہے، اسی وجہ سے ایسے لوگوں سے بچنے اور نیک و صالح لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے: وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (التوبہ:119) یعنی نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔ برے افراد کی طرح براماحول بھی بد اخلاقی کا موجب ہوتا ہے اسی وجہ سے فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (التحریم:6) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً (الانفال:25) اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔

2.2.1 قرآنی اخلاق کے نمایاں پہلو

قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات دوسرے نظام ہائے زندگی سے بہت مختلف ہیں۔ قرآن کی تعلیمات انسان کی فطری ضروریات کے مطابق اور ہر پہلو سے انصاف پر مبنی ہیں۔ قرآنی اخلاقیات کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے انسانی قوتوں کے استیصال کی تعلیم نہیں دی ہے اور کہا ہے کہ کوئی قوت فی نفسہ بری نہیں ہے؛ بلکہ وہ موقع و محل کے خلاف استعمال کی وجہ سے بری کہلاتی ہے۔ اس نے غصہ کو ضبط کرنے کی تعریف کی، (آل عمران: 431) غصہ کو مٹادینے والے کی نہیں۔ دراصل دنیا میں نشاط کار، ولولہ وانبساط اور رونق و ترقی انسانی قوتوں کو کچل ڈالنے میں نہیں بلکہ ان کے صحیح استعمال میں ہے۔ قرآنی اخلاق کا دوسرے نظام ہائے اخلاق سے موازنہ کیا جائے تو قرآنی اخلاقیات کی درج ذیل خصوصیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔

1. توازن

دنیا کے کسی اخلاقی نظام میں اخلاقی حدود کی تعیین اور ان کے مقام و مصرف کی تجویز میں وہ توازن اور تناسب نہیں پایا جاتا، جو توازن و تناسب قرآن کے اخلاقی نظام میں ہے۔ مثلاً عفو و درگذر بلا شبہ اچھا اخلاق ہے، قرآن نے اس کی ترغیب و تلقین کی ہے؛ مگر بعض مواقع پر قرآن نے عفو ودرگذر کے بجائے تعزیر و سزا کو زیادہ مستحسن قرار دیا ہے تاکہ مفادِ عامّہ کا تحفظ ہو سکے۔

2. اخلاق کا بنیادی سرچشمہ

اچھے اور برے اخلاق کی تعیین انسانی حس پر نہیں چھوڑی گئی ہے؛ کیونکہ یہ ہر انسان میں کم و زیادہ ہوتی ہے اور اخلاقی حس کی یہی کمی و بیشی اخلاق میں اختلاف کا سبب بنتی ہے۔ بلکہ اس کا ماخذ اللہ اور رسول اللہ کو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید سے یہ بات بالکل دو دو چار کی

طرح عیاں ہے کہ اچھا اخلاق صرف وہی ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے اچھا قرار دیا ہو۔

3. نظام زندگی کی تشکیل و تعمیر

قرآن کا اخلاقی نظام انسان کی صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کو اجتماعی زندگی تک وسیع کر کے اخلاقیات پر اپنے پورے نظام زندگی کی تشکیل و تعمیر کرتا ہے اور زندگی کے کسی شعبہ کو بھی اخلاقی نظام کی گرفت سے آزاد نہیں کرتا۔ انسان کا ہر عمل اخلاقیات کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں ہر عمل کو اچھا یا برا نام ملتا ہے اور اس اعتبار سے اس کا انجام بتایا گیا ہے۔

4. مقصد اخلاق

قرآن جو اخلاقی نظام پیش کرتا ہے، اس کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہ مقصد و غایت میں بالکل مختلف ہے، اس نے رضائے الٰہی کو اپنا مقصد قرار دیا ہے، اس سے اخلاقیات کو معیار کی بلندی نصیب ہوتی ہے اور اخلاقی ارتقا کے امکانات لامحدود ہو جاتے ہیں۔ یہ مقصد اتنا عظیم ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ اس کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اس کے بر خلاف زندگی کے دوسرے نظام ہائے اخلاق صرف سماجی بہبود کو مقصد اخلاق قرار دیتے ہیں۔ یہ اتنی کمزور بنیاد ہے کہ جہاں سماج کی بہبود متاثر نہ ہوتی ہو، وہاں ایک لمحہ کے لیے بھی انسان ضابطہ اخلاق کا پابند نہیں رہتا۔

2.2.2 اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات کو مختلف عناوین کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اسے ”حقوق، فضائل ورذائل اور آداب“ جیسا جامع عنوان لگایا ہے اور پوری اسلامی تعلیمات کو ان تین عناوین کے تحت سمونے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں کے تئیں، بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کے لیے ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے، اس کا نام فضائل اخلاق اور اس کے بالمقابل کا نام رذائل ہے۔ مثلاً سچ بولنا، اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔ اخلاقیات کے دونوں پہلوؤں پر قرآنی تعلیمات کا خلاصہ آگے پیش کیا جارہا ہے۔

1. حقوق

حق کے لغوی معنی مطابق اور مکمل موافقت کے ہیں، جیسے دروازے کی چول اس کے گڑھے میں بیٹھ جائے کہ باقاعدگی کے ساتھ اس میں گھومتی رہے (المفردات بذیل ماد) حقوق لفظ حق کی جمع ہے، اسلامی شریعت میں قانونی حقوق یا مطالبات اور ان کے متعلقہ واجبات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

دنیا میں ہر چیز با مقصد پیدا کی گئی ہے اور ہر ایک کا دوسرے پر حق ہے۔ قرآن مجید نے ان حقوق کی طرف کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا: هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ:29) وہی تو ہے جس میں تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

جب انسان کا تعلق دنیا کی ایک ایک چیز سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داریاں بھی اسی ہر چیز سے متعلق ہوں گی۔ جمادات سے کہ اس کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کی نشو و نما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضہ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا بھی اپنے اوپر حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور پر وہ کام لے (سیرۃ النبی ششم، 207) رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا "تمہاری جان کا تم پر حق ہے، تمہارے بدن کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی اور تمہارے ملاقاتی کا تم پر حق ہے۔

2. والدین کے حقوق

ذوی الحقوق کی فہرست میں سب سے بلند مقام والدین کا ہے۔ ہر مذہب میں ان کو بلند تر مقام حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسل انسانی کی افزائش اور کائنات کی نیرنگی کا ظاہری سبب والدین ہی ہیں پھر انہیں کی محنت و جاں فشانی سے پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کے مراحل انجام پاتے ہیں، انہیں کی کوششوں سے انسانی وجود سوسائٹی میں باعزت زندگی گزارنے کے لائق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سب سے بلند مقام عطا فرمایا ہے اور اپنی شکر گزاری کے ساتھ ہی والدین کی شکر گزاری کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ سورہ لقمان میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جو وصیتیں کی ہیں اس کا ایک حصہ ہے۔ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ (لقمان:14) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا۔ والدین کی شکر گزاری کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔

3. حسن سلوک

واضح الفاظ میں یہ حکم بھی قرآن مجید میں ہی میں ایک سے زیادہ مقامات پر وارد ہوا ہے وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (الاسراء:23) یعنی والدین کے ساتھ بھلائی کرو۔ دوسری آیات میں احسان کی بھی تفسیر کر دی گئی ہے کہ ان کا حد درجہ ادب و احترام کرو ہمیشہ نرم لب و لہجہ میں گفتگو کرو، ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کہو، ان کی مرضی کا ہر وقت خیال رکھو اور ان کے حق میں دعائے خیر بھی کرتے رہو۔

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا () وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (الاسراء:23-24) اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا۔

4. اولاد کے حقوق

جس طرح اولاد پر والدین کے حقوق ہیں اسی طرح والدین پر بھی اولاد اور نسل کے کچھ حقوق بتلائے گئے ہیں۔ در اصل انہی حقوق کی ادائیگی کی وجہ سے اولاد پر والدین کے حقوق کو اتنی تاکید کے ساتھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔

5. تحفظ نسل

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقش زندگی کو مٹنے اور مٹانے کا سبب نہ بنیں، اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشو و نما اور ترقی کے وہ تمام اسباب مہیا کریں جو ان کی قوت و استطاعت میں ہے، اسی وجہ سے قرآن مجید میں نسل کشی کو سخت ترین عذاب کہا گیا ہے اور اس کی ہر قسم کی ممانعت آئی ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا (الاسراء:31) اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی، درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔ یہ آیت نسل کشی کو عظیم ترین گناہ قرار دیتی ہے اور اس کی رو سے قتل اولاد کی تمام شکلیں ناجائز قرار پاتی ہیں۔ خواہ وہ اسقاط حمل ہو یا منع حمل کی مصنوعی تدابیر، خدا نے جن روحوں کو اس سرزمین پر جسمانی لباس دینا طے کیا ہے، ان کے رزق کا سامان بھی اس نے خشکی اور تری میں پھیلا رکھا ہے، اب یہ انسان کی انتہائی ہستی، کم ہمتی اور بدعقلی ہے کہ وہ افزائش رزق کے اسباب مہیا کرنے اور تلاش رزق کی محنت اور کاوش کرنے سے توجی چراتا ہے، لیکن قلت رزق کی دہائی دے کر نسل کشی جیسے بدترین جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور انسانی معاشرے کی جڑیں کاٹتا ہے۔ (قرآنی تعلیمات:552)

آج کے مہذب دور اور ماڈرن سوسائٹی میں بھی لڑکیوں کی ولادت پر بالکل وہی کیفیت ہوتی ہے، جس کی اوپر کی آیت میں منظر کشی کی گئی ہے، ان کو قتل کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں اور ایسی خبریں بھی آئے دن اخبارات میں چھپتی ہیں کہ لڑکیوں کے بوجھ سے گھبرا کر والدین بھی خودکشی کر لیتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس شنیع جرم کو روکنے کے لیے نسل انسانی کو احترام سکھایا، عورت کو معاشرے میں باعزت مقام دلایا اور آخر میں اس کو آخرت سے جوڑ کر بیان کیا ہے کہ ذرا بھی احساس رکھنے والا انسان لرز کر رہ جاتا ہے، قیامت کے دن جب ہر شخص نفسی نفسی میں ہوگا اور اپنے محاسبہ کی جلدی میں ہوگا کہ اسی درمیان کچھ ننھی ننھی، معصوم، بے زبان ہستیاں خون سے لت پت کپڑوں میں آکر کھڑی ہو جائیں گی اور ان سے سوال کیا جائے گا کہ اے معصوم جانو! کس جرم میں تمھیں زندہ در گور کیا گیا؟ اور پھر قاتلوں سے کوئی جواب نہیں بن پائے گا۔ (سیرۃ النبیؐ:6، 241) وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ○ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (التکویر:9-8) اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا وہ کس گناہ میں ماری گئی؟

6. رشتہ داروں کے حقوق

والدین اور ازدواجی رشتہ کے بعد سب سے زیادہ حق رشتہ داروں کا ہے، جسے اصطلاح میں "صلہ رحمی" کہا جاتا ہے، قرآن مجید نے رشتہ کی استواری، اس کا پاس ولحاظ، اس کے حقوق کی ادائیگی پر بہت زور دیا ہے۔ سورۃ النساء میں بندگی کے بنیادی اصول کے ضمن میں تین باتوں کا ذکر آیا ہے، خدا کی عبادت کرو، والدین کے حقوق ادا کرو، رشتہ داروں اور دوسرے مستحقین کا خیال رکھو پھر دوسرے مقامات پر اس حکم کو مختلف اسالیب میں بیان کیا گیا ہے، کبھی اس حق تسلیم کرنے اور ادا کرنے کا صراحۃً حکم دیا گیا۔ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ (النحل:90) اور کہیں تاکید کی کہ اپنی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لیے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی مدد کرو۔ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ (البقرہ:177) اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال خرچ کرو۔

صلہ رحمی کا ایک خاص اصول یہ ہے کہ رشتوں کو استوار کرنے کی ہر حال میں کوشش کی جائے، اسے ٹوٹنے نہ دیا جائے، قرآن مجید نے باکردار مؤمنین کے اوصاف، میں اس بات کا نمایاں ذکر کیا ہے کہ وہ صلہ رحمی کرے، اللہ تعالیٰ نے جن کو جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں جوڑے رکھتے ہیں۔ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ (الرعد:12) ان کی یہ روش ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔

7. یتیموں کے حقوق

وہ کم سن بچہ جو باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو جائے یتیم کہلاتا ہے، ایسا بچہ اپنا مستقبل تعمیر کرنے کے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے معاشرے کی سرپرستی و نگہبانی کا محتاج ہوتا ہے اور اگر معاشرہ اس کی طرف سے نگاہ پھیر لے تو یہ اس غنچہ کے مانند ہوتا ہے، جو کھلنے سے پہلے ہی کمہلا جائے۔ قرآن مجید کے ان احکامات و ہدایات کی اہمیت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے، جب نزول قرآن کے وقت عرب معاشرہ کا جائزہ لیا جائے۔ یہ بات عام ہے کہ اس وقت عربوں میں قتل و غارت گری کا ماحول تھا، جس کے سبب یتیموں کی کثرت تھی۔ مگر ان کی پرورش و پرداخت کا کوئی سامان نہ تھا، اکثر یہ لوگ معاشرہ کی بدسلوکی کا شکار ہوتے، ایسے واقعات کی قرآن مجید میں بھی کئی جگہ منظر کشی کی گئی ہے۔ أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ○ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ (الماعون:1-2) تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

8. ضرورت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کتنی ہی دولت و ثروت کا مالک ہو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایسے حادثات سے بھی دوچار ہو جاتا ہے کہ زیر کفالت افراد سے بھی مدد لینی پڑتی ہے۔ بالخصوص ضروریات زندگی کی فراہمی میں حالات کے الٹ پھیر کو تاریخ نے بار بار دیکھیں ہے اور اسی حقیقت کو قرآن مجید نے آیت ''وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ''(آل عمران:140) میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے ذوی الحقوق کی جو ترتیب رکھی ہے اس میں قریبی اعزہ کے ساتھ معاشرہ کے دوسرے ضرورت مند افراد کا حق بھی بیان کیا ہے اور ایک سے زائد مقام پر ارشاد ہوا ہے کہ صاحب ثروت کی دولت سے محروم لوگوں کا حق ہے: وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (الذاریات:19) اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل اور محروم کے لیے۔

حاجت مندوں کی فہرست میں فقراء و مساکین کے علاوہ خادم، غلام، مسافر اور مہمان کا بھی شمار ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ افراد بھی مخصوص حالات میں دوسروں پر انحصار کرتے ہیں۔ غلام اور خادم کا اپنے آقا پر انحصار ظاہر ہے۔ مسافر اور مہمان بھی اپنے وسائل سے دور ہونے کے بعد کبھی کبھی بے انتہا دقتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور معاشرہ کے علاوہ اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہو سکتا، اس لیے قرآن مجید نے مہمان مسافر کی مدد (التوبہ:60) اور عزت و اکرام کی بھی تاکید کی ہے۔ (الذاریات:24)

9. انسانی حقوق

قرآن مجید نے ہر شخص کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اس کی جان محفوظ ہونے کی ضمانت دی ہے اور قتل ناحق کو سنگین جرم قرار دیا ہے۔ مِنْ أَجْلِ ذَٰلِكَ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (المائدہ:32) اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کی زندگی بخش دی۔

حفاظت جان کی ضمانت یہاں دو شرطوں سے مشروط ہے۔ اول یہ کہ کسی دوسری جان کو تلف کرنے کا مرتکب نہ ہوا اور دوم یہ کہ انسان زمین میں فساد برپا کرنے کا سبب نہ بنے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی جان کو اسی وقت تک تحفظ فراہم رہے گا جب تک وہ خود کسی جان کو ضائع نہیں کرتا، دوسرے جان کو ناحق مارنے کا مطلب یہ ہے کہ قاتل اپنے جان کے تحفظ کا حق خود اپنے ہاتھ سے کھو دیتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی شخص معاشرہ میں فساد برپا کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا کہ اس سے ہر ایک کی عزت و آبرو اور جان و مال خطرے میں پڑ جاتا ہے، یہ بھی دوسروں کی زندگی اور امن و سکون کے ساتھ کھلواڑ ہے۔

10. اخلاق حسنہ

اسلامی تعلیمات کا لازمی ثمرہ اعلی اخلاق، پاکیزہ کردار اور عمدہ عادات و اطوار ہیں۔ عقیدہ و عبادت پر بھی زور اس لیے دیا گیا ہے کہ انسان کا کردار سنورے، وہ خدا کے حکم کا پابند بن کر دنیا میں مثالی زندگی گزارے اور آخرت میں بھی اس کے عوض میں عظیم نعمتوں سے سرفراز ہو۔ قرآن مجید میں جا بجا ایسے اخلاقی اوصاف کا ذکر آیا ہے جو اللہ تعالی کو پسند ہیں اور ان کو اختیار کرنے کی بندوں کو ترغیب دی گئی ہے، اس کی فہرست بہت طویل ہے اور ان کا استقصاء کرنا بہت مشکل ہے۔ سچائی، صبر و شکر، عدل و انصاف، امانت داری، عہد کی پاس داری، عفو و درگزر، توکل اور ایثار و قربانی نمایاں اوصاف ہیں۔ ان اوصاف کو اپنی شخصیت میں اتارنا ہی انسانیت کی معراج ہے اور ایسے ہی لوگ قرآنی نگاہ میں کامیاب و کامران ہیں۔

11. سچائی

سچائی بندے کی سب سے پسندیدہ صفت ہے۔ قرآن مجید میں اس صفت کو مختلف طریقے سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اللہ اور سولؐ کے بنیادی اوصاف میں صدق وصفا شامل ہے، مؤمن بھی وہی کامیاب و کامران ہو گا جو سچائی کے وصف سے متصف ہو۔

سچائی کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ آدمی سچ بولے، جھوٹ کے قریب نہ پھٹکے، دل میں جو بات ہے وہی زبان پر لائے، مگر استعمالات قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ امام غزالیؒ نے اس کے مفاہیم کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور اس کی چھ قسمیں بیان کی ہیں: (ا) بات میں سچائی (ب) ارادہ اور نیت میں سچائی (ج) عزم میں سچائی (د) عزم کو پورا کرنے میں سچائی (ہ) عمل میں سچائی (و) دین داری کے مقامات و مراتب میں سچائی، لیکن سید سلیمان ندویؒ نے ان مفاہیم کو تین قسموں میں سمیٹ دیا ہے: (ا) زبان کی سچائی

(ب) دل کی سچائی (ج) اور عمل کی سچائی اور ہر مفہوم کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بہت دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے۔

12. صبر وشکر

صبر وشکر بھی مؤمنانہ اوصاف میں سے ہے۔ ان دونوں اوصاف کو قرآن مجید نے مؤمن کا لازمی وصف بتایا ہے اور اس کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ صبر کے لغوی معنی روکنے اور سہارنے کے آتے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا۔ قرآن میں صبر اس بنیادی مفہوم کے ساتھ درج ذیل معنوں میں استعمال ہوا ہے اور یہ اس سے بہت مختلف ہے جو معنی عام طور پر مشہور و مقبول ہے۔

1- صبر کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلات میں اضطراب و بے قراری نہ ہو بلکہ ان سب کو اللہ کا حکم اور مصلحت اور آزمائش سمجھ کر خوشی خوشی برداشت کیا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالی اپنی رحمت سے خود ان کو در گزر فرمائے گا جیسا کہ حضرت یعقوبؑ کے اس بصیرت افروز جملے کے مفہوم سے مترشح ہوتا ہے: ''قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ ''(یوسف:18) یہ سن کر ان کے باپ نے کہا: ''بلکہ تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا'' اچھا صبر کروں گا اور بخوبی صبر کروں گا، جو بات تم بتا رہے ہو، اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔

2- صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرات پیش آئیں، دشمن جو تکلیف پہنچائے اور مخالفین جو طعن وطنز کریں ان میں سے کسی بھی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بدل و پست ہمت ہونے کے بجائے زیادہ استحکام و استواری پیدا کی جائے: ''فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ ''(الاحقاف:35) پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولو العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو۔

3- صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز اور بدخواہی سے پیش آنے والے اور تکلیفیں دینے والے کے قصور کو معاف کیا جائے۔ یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر وشکر ایسے اوصاف ہیں جن کے اندر دین کی بیشتر تعلیمات سمٹ کر آ جاتی ہیں، اگر انسان کے دل میں صبر وشکر کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں کامیابی کے لیے کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہیں۔ وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کی مانے گا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا۔

13. عدل وانصاف

عدل کے معنی عوض، بدلہ، انصاف اور برابری کے ہیں۔ یہ ایک وسیع المعنی لفظ ہے، اس کے مفہوم میں توازن، تناسب، مساوات، ہم آہنگی، انصاف، افراط و تفریط سے اجتناب اور لوگوں سے تعلقات ان بنیادوں پر قائم کرنا جن سے ہر فرد کو اس کا جائز حق مل جائے۔ عدل ذات باری تعالی کی بہت اہم صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ہر فیصلہ حق بجانب ہوتا ہے، وہ حق بات ہی کہتا ہے اور وہی کرتا ہے جو برحق ہو۔ آیت قرآنی ہے: ''وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ ''(الاحزاب:4) وہ حق بات کہتا ہے اور ''وَاللّٰهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ''(المومن:2) (اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے) کائنات میں ہر چیز کا تناسب اور اس کا مستحکم نظام بجائے خود اس کی منصفانہ صفات کا مظہر ہے، نبی اکرم ﷺ

کے فریضہ منصبی میں یہ بات شامل تھی کہ وہ لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کا چلن پیدا کریں ''وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ''(الشوری: 15)(مجھے حکم دیا گیا کہ تمہارے درمیان انصاف کروں) اور پھر قرآن نے عام انسانوں کو نہایت واضح لفظوں میں یہ ہدایت کی کہ:'' إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ''(النحل:90) اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ اس مضمون کی قرآنی آیات کو اکٹھا کیا جائے تو حقوق کی ادائیگی (النساء:127) ناپ تول اور لین دین کے معاملات (الانعام:152) عہد و میثاق (البقرۃ:282) بیوی اور زیر کفالت افراد کے ساتھ حسن سلوک (النساء:3) متنازع مقدمات (المائدہ:42) یہاں تک کہ اپنے دین و ایمان کی سلامتی جیسے معاملات (المائدہ:8) میں بھی عدل وانصاف برتنے کی تاکید کی گئی ہے۔

14. امانت داری

عدل وانصاف ہی کا ایک شعبہ امانت داری ہے آپسی تعلقات و معاملات کو درست رکھنے کے لیے امانت کا وصف بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ تمام انبیاء کو اللہ تعالی نے اس وصف سے آراستہ کیا اور ہر نبی نے اپنی قوم کے سامنے سب سے پہلے امانت داری کا دعوی پیش کیا کہ میں خدا کا فرستادہ ہوں، اس کی سونپی ہوئی امانت تم لوگوں تک پہونچانے آیا ہوں، آخری رسول حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو نبوت ملنے سے پہلے ہی ''امین'' کا خطاب قوم کی جانب سے حاصل ہو گیا تھا اور قرآن کی رو سے فلاح یاب بندے وہی ہیں جو امانت کی دیکھ ریکھ کرتے رہتے ہیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ امانت مالک کو واپس کر دیتے ہیں۔ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (المومنون:8) جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد وپیمان کا پاس رکھتے ہیں۔

15. عہد کی پابندی

وعدے کو پورا کرنا اخلاقیات اسلام کا اہم شعبہ ہے، یہ ایسا وصف ہے جسے ذات باری تعالی نے بار بار اپنی جانب منسوب کیا ہے کہ وہ وعدہ کا پکا ہے، کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، اس سے بڑھ کو کوئی وفادار نہیں ہو سکتا۔ (آل عمران:9، الرعد:31، الزمر:2، التوبہ:11) رسول اکرم ﷺ نے معاہدوں کی پابندی میں جس پامردی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال تاریخ میں ملنی مشکل ہے قرآن مجید نے دس سے زیادہ مقامات پر ایفاء عہد کا حکم دیا ہے اور صاف صاف کہا ہے کہ وفا شعاری کو لازم پکڑو، کیونکہ خدا کے حضور اس کی بھی جواب دہی کرنی ہے: ''وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا''(الاسراء:34) اور عہد کی پابندی کرو، بیشک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہے۔

اس کے علاوہ عفو و درگزر، توکل، ایثار و قربانی، جھوٹ، غیبت، بدگمانی اور ریاکاری یہ سب اخلاقیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

2.3 قرآن مجید کی سماجی تعلیمات

سماج کا لفظ سنسکرت زبان کے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ ''سم'' اور ''آج'' سم کے معنی اکٹھا یا ایک ساتھ اور آج کے معنی ہیں رہنا، اس طرح سماج کے لغوی معنی ہوئے ایک ساتھ رہنا۔ اس طرح جہاں کئی افراد ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ وہیں سماج بن جاتا ہے۔ اردو زبان میں سماج کے متبادل کے طور پر عربی کا لفظ معاشرہ بھی بولا جاتا ہے۔ سماج یا معاشرہ کی تعریف کے مطابق یہ لازم نہیں ہے کہ افراد کا تعلق

ایک ہی قوم یا ایک ہی مذہب سے ہو۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ جب معاشرہ کی نسبت کسی خاص قوم یا مذہب سے ہوتی ہے تو اس میں معاشرہ کے ساتھ کسی صفت کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً اسلامی معاشرہ یا مغربی معاشرہ وغیرہ۔

2.3.1 قرآن کی نگاہ میں معاشرہ

معاشرہ کے سلسلے میں قرآن کا موقف بہت واضح ہے۔ اس کا اولین دعوی یہ ہے کہ جن افراد سے مل کر معاشرہ بنتا ہے وہ سب کے سب فی الواقع ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہوتی، کوئی پاک اور ناپاک نہیں یا کالے اور گورے اور مشرقی اور مغربی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نسل، وطن، یا رنگ وزبان کی بنا پر ان میں کوئی تفریق نہیں ہو سکتی۔ یہ محض تعارف کے لیے ہیں۔ سب کے حقوق یکساں ہیں۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات: 13) ترجمہ: درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق تفریق کی بنیاد ایمان ہے:

1. ایمان

تمام انسانیت کا مرتبہ ایک ہونے کے باوجود عالم انسانیت مختلف خانوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ قرآن مجید نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انسان نے اپنے فکر و مزاج کی وجہ سے خود اپنے کو دو حصوں میں بانٹ لیا ہے۔

1- ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی طبیعت صالح اور حق کی طرف مائل ہوتی ہے، وہ اللہ اور اس کے دین پر ایمان رکھتے ہیں۔

2- دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اللہ کے بھیجے ہوئے دین پر نہ چل کر اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ کھلے طور پر یہ شیطان کے دوست اور اللہ کے دین کے دشمن ہوتے ہیں۔

اس طرح معاشرہ اپنے آپ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ پہلا اسلامی معاشرہ اور دوسرا غیر مسلم معاشرہ کہلاتا ہے۔ ان دونوں معاشروں کی بنیادیں واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جب بنیادیں مختلف ہوتی ہیں تو ان کے ڈھانچے بھی قدرتی طور پر باہم مختلف ہوتے ہیں اور زندگی کے اہم معاملات میں مفاہمت کے امکانات کم سے کم ہوتے جاتے ہیں۔

2. مطلوبہ رویہ

دونوں طرح کے معاشروں کے ساتھ کس طرح کا رویہ ہو گا؟ قرآن مجید نے اسے بھی اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ غیر مسلم معاشرہ کے ساتھ برتاؤ کے لیے قرآن مجید کی عمومی ہدایت ہے کہ عدل وانصاف، دیانت وامانت، نرمی اور مروت، مرحمت و مواساۃ، راست بازی اور ایفائے عہد وغیرہ میں پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ ان کی خلاف ورزی ہرگز نہ کی جائے گی۔

3. اسلامی معاشرہ

اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل قرآن مجید کا بنیادی موضوع ہے۔ اس کی ہیئت، تشکیل مراحل نیز اس کے صحیح خطوط پر بنے رہنے کے لیے تفصیلی ہدایات دی ہیں۔ اسے الگ الگ عناوین کے تحت ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔ انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کا مقصدِ وجود

عبادت ہے

اسلامی معاشرہ اسلامی تصور حیات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ قرآن انسان کو محض ایک حیوانی وجود قرار نہیں دیتا۔؛ بلکہ اسے ''خلیفۃ الارض'' کا مقام عطا کرتا ہے، جو دوسرے حیوانات سے اسے ممتاز کرتا ہے۔ اسلام انسان کی حیوانی ضروریات کی تکمیل اور تسکین نفس کے لیے سماج کی ضرورت کی نفی نہیں کرتا بلکہ انہیں فطری انسانی ضرورت قرار دیتا ہے۔ مگر اسلام انسان کا مقصد حیات حیوانی ضروریات کی تکمیل نہیں۔؛ بلکہ اللہ کی بندگی قرار دیتا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات:56)(میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں)

انسان کے مقصدِ تخلیق کو سامنے رکھتے ہوئے سماجی تصور کا مطالعہ انتہائی دلچسپی کا حامل ہے۔ اس لیے اگر ایک طرف اللہ کی عبادت انسانی زندگی کا مقصد ہے تو دوسری طرف سماج انسان کی ضرورت ہے۔ اس میں دلچسپی کا پہلو یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں عبادت اور سماج انسانی زندگی کے لیے دو مختلف و متضاد چیزیں نہیں، بلکہ عبادت اگر یہاں انسان کے لیے عمل ہے تو سماج میدان عمل۔ اسلامی عبادات نام ہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ سماج کے تعلق سے احساس ذمہ داری یا انسانوں کی خدمت اسلامی عبادت کا لازمی جز ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی سماج کی بھی بنیاد پڑتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات:13) لوگو!ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

انسانی شجرہ نسب ایک نئے درخت کی طرح شاخ در شاخ پھلتا رہتا ہے اور انسان مختلف نسلی، علاقائی اور دیگر فضائل کے ساتھ ایک سماج کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے، اسے سورہ نساء کی پہلی آیت میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

2.3.2 سماجی ذمہ داریاں

اسلامی نظریہ حیات اجتماعیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہر انسان دنیا میں ایک حصہ دار کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر اس حوالے سے جو صفات اور ذمہ داریاں بیان کرتا ہے ترتیب وار ان کا جاننا ضروری ہے۔

1. عقائد/ایمانیات

ان میں سب سے اہم عقیدہ اور ایمان ہے۔ اسلامی معاشرہ کی بنیادی عقائد یا ایمانیات پر رکھی گئی ہے۔ سب جانتے ہیں ایمانیات 'علم' ہیں اور باقی ساری چیزیں 'عمل' ہیں۔ علم، عمل پر ہمیشہ مقدم ہوتا ہے۔ عمل کی حیثیت ایک درخت کی سی ہے اور علم کی حیثیت بیج کی سی ہے۔ جس طرح بیج کے بغیر درخت کا وجود ممکن نہیں، اسی طرح علم کے بغیر عمل بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لیے جب تک ایمانیات وعقائد وجود میں نہ آجائیں اس وقت تک باقی اسلام کے وجود میں آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن مجید کا کہنا ہے: لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ

تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (البقرہ: 177) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخرت اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر، اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے نماز قائم کر کے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایمانیات کے بغیر نیکی اور حسن عمل کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایمانیات اور عقائد کیا ہیں؟ آیت کریمہ نے یہ بات صاف بتادی ہے۔ اس آیت اور اس طرح کی دوسری بہت سی آیتوں کی رو سے یہ عقائد پانچ ہیں انہیں عقائد پر پورا نظام شریعت قائم ہے۔

(1) اللہ پر ایمان (2) آخرت پر ایمان (3) نبیوں پر ایمان (4) اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان (5) فرشتوں پر ایمان

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ان عقائد میں سب کی اہمیت یکساں نہیں ہے۔ بلکہ بعض کی زیادہ اور بعض کی کم ہے۔ اگر موٹی تقسیم کی جائے تو معلوم ہو گا کہ شروع کے تین عقائد بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ باقی دراصل انہی کے لازمی تقاضوں یا شاخوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

2. عبادات

عبادت اسلامی معاشرہ کا دوسرا ستون ہے۔ قرآن مجید بندگی کا سلیقہ سکھانے کے لیے نازل ہوا ہے۔ بندگی وہ چیز ہے جو انسانی روح کو پاکیزگی اور بلندی عطا کرتی ہے اور اسے رضا الٰہی کا طالب بناتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اللہ کی رضا کا سزاوار بنتا ہے۔ ہر نبی کی دعوت ایک ہی تھی۔ أَنِ اُعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (نحل: 36) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے دور رہو۔

عبادت کا لفظ بہت عام ہونے کے باوجود اس کا وسیع اور ہمہ گیر مفہوم بالعموم نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ صاحب نظر علماء نے اس پر بہت تفصیلی بحث کی ہے اور اس کی جامعیت کو واضح کیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: عبادت ایک جامع لفظ ہے۔ اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال واقوال داخل ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، راست گوئی، امانت داری، صلہ رحمی، دیانت، اطاعت والدین، وفاء عہد، دعا، ذکر الٰہی، تلاوت قرآن مجید اور اس قسم کے تمام اعمال صالحہ عبادت کے اجزاء ہیں۔ اسی طرح اللہ کے رسول کی محبت، رحمت خداوندی کی امید اور عذاب الٰہی کا خوف، خشیت، امانت، اخلاص، صبر، شکر، توکل اور تسلیم و رضا وغیرہ ساری اچھی صفات عبادت کے اندر شامل ہیں۔

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ عبادت پورے دین کی پیروی کا نام ہے۔ معاشرہ میں انسان کی ہر تگ و دو اسی عبادت کا خیر ہے۔ ان میں بعض اجزا کو اہمیت کی وجہ سے علیحدہ بیان کیا جا رہا ہے۔ وہ سب اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔

3. امر بالمعروف و نہی عن المنکر

انفرادی عقیدہ اور عبادت درست ہونے کے بعد ہر شخص کو معاشرہ کی بہبود کی فکر کرنا لازم ہے۔ اس سلسلے کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ معروفات کے فروغ اور منکرات کے ازالہ کے لیے جدوجہد کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کار خیر کی وجہ سے اسے خیر امت بنایا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ(آل عمران:110)اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ آیتِ پاک کی روح یہ ہے کہ معاشرے میں بھلائی اور خدا ترسی کے کاموں کی ہمت افزائی کی جائے۔ نہ صرف ہمت افزائی کی جائے بلکہ ضروری ہے کہ لوگ ایسے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى(المائدہ:2)یعنی نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ اسی کا دوسرا پہلو ہے کہ معاشرے کے اندر برائی کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ:2) گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ہرگز مدد نہ کرو۔ بلکہ حدیث پاک میں تاکید ہے کہ ہو سکے تو بڑھ کر ہاتھ پکڑ لو۔ یہ ناممکن ہو تو زبان سے تلقین کرو۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں برا محسوس کرو۔(بخاری و مسلم،177)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرائض میں ایک اہم فریضہ ہے۔ فقہاء نے اسے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ معاشرہ اس فرض کی آدائیگی پر کمربستہ رہے تو معاشرہ میں صرف بھلائی کا بول بالا ہوگا۔ اور برائی کو پنپنے کا موقع نہیں ملے گا اس فریضہ کے سلسلے میں بھی کافی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کا ازالہ ضروری ہے۔ قرآنی تعلیمات کا خاص رخ اسی جانب ہے۔

2.3.3 نیکی کا ہمہ گیر تصور

قرآن نے نیکی کا ایک وسیع اور ہمہ گیر تصور پیش کیا ہے۔ قرآن مجید کی نگاہ میں نیکی کا دائرہ مخصوص عبادات تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ یہاں نیکی نام ہے بنیادی عقائد پر ایمان کے ساتھ ساتھ ان بے شمار حقوق کی ادائیگی کا، جو انسان پر سماج کے مختلف طبقات کے تعلق سے عائد ہوتے ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں نہایت جامعیت کے ساتھ اس وسیع تصور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (البقرہ:177)۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخرت اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر، اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے نماز قائم کرکے اور زکوۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔

قرآن مجید کے اس ارشاد مبارک سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نیکی کا تصور صرف ظاہری عبادات تک محدود نہیں، بلکہ اس کا ایک اہم تر حصہ انسانوں کے آپسی تعلقات کو مضبوط کرنے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جو تعلقات درحقیقت فرائض اور حقوق سے عبارت ہیں جو ایک انسان کو انفرادیت کے تنگ دائرے سے نکال کر سماج کے وسیع تانے بانے سے جوڑتے ہیں۔

1. اخوت و بھائی چارگی

مسلم اجتماعیت میں افراد کے باہمی تعلقات ہمدردی، مساوات، تعاون اور ایثار کی بنیاد پر قائم کیے جائیں گے۔"إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ

إِخْوَةٌ'' مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ قرآن کا بنیادی نظریہ ہے۔ اس کی تفصیلات قرآن مجید میں جگہ جگہ آئی ہیں۔ سورۃ الحجرات میں ایک ساتھ اس سلسلے کی متعدد ہدایات پائی جاتی ہیں۔ کہ صلح باہم سے کام لیا جائے گا۔ برے القاب سے خطاب نہیں کیا جائے گا۔ بد گمانی سے بچنا ہو گا۔ تجسس اور غیبت سے پرہیز لازم ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○ يَا أَيُّهَا۔۔۔۔۔۔وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (سورۃ الحجرات:10-11) مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری رعورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔

2.3.4 برائیوں کے سرچشمہ پر قدغن

قرآن نے ان تمام برائیوں کے سرچشموں پر بندھ لگانے کا حکم دیا ہے جن سے برائیاں ابل ابل کر پھیل جاتی ہیں اور اس کے لیے مستحکم تدابیر بتاتی ہیں۔

(الف) زنا بدترین برائی ہے: برائی کا سب سے بڑا سرچشمہ جنسی ہیجان ہے۔ جس کی وجہ سے بے قابو ہو کر انسان غلط قدم اٹھالیتا ہے۔ اس بے حیائی کے بارے میں قرآن مجید سخت لفظوں میں حکم دیتا ہے کہ '' وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا (بنی اسرائیل:32) زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ ہے۔ اس شنیع جرم پر قدغن کے لیے سخت ترین سزائیں بھی قرآن مجید نے تجویز کی ہیں۔ (سورہ نور)

(ب) قرآن نے مرد و عورت کا دائرہ کار متعین کیا ہے۔ عورت کا دائرہ گھر کی چہار دیواری قرار دیا تو مردوں کو گھر سے باہر کی دنیا کو میدان عمل قرار دیا ہے۔ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (احزاب:33) اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو زکوٰۃ دو اور اللہ اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیتِ نبی ؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔

1. نکاح کی تاکید

نکاح کی تاکید کی گئی ہے اور نوجوانوں کے مجرد رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے۔ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ (جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو) (النساء:3) حدیث پاک میں اس کی حکمت یہ بتائی گئی

ہے کہ یہ نگاہ اور شرم کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے۔من استطاع منکم الباء ة فلیتزوج فانه اغض للبصر واحسن للفرج تم میں سے جو شخص شادی کرنے کی استطاعت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ شادی کرلے کیوں کہ یہ نگاہوں کو زیادہ نیچی رکھنے والی ہے اور شرمگاہوں کی زیادہ حفاظت کرنے والی ہے۔(صحیح البخاری،1905)۔نکاح کے معاملہ کو بہت سادہ اور آسان بھی رکھا گیا ہے۔چند رشتوں کو چھوڑ کر باقی سب سے نکاح جائز ہے۔ذات، پات، حسب ونسب اور مال ودولت کو معیار بنانے کے بجائے دین داری کو معیار بنانے کا حکم دیا گیا اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک ارشاد فرمایا" ان اعظم النكاح بركة ايسره مؤنة(سب سے بابرکت نکاح وہ ہے جس میں سب سے کم خرچ ہو)(مشکوۃ المصابیح،3097)

2. لغویات سے پرہیز

اسی کے ساتھ ایسے تمام مشاغل سے احتراز کی تاکید آئی ہے جو انسانوں میں شہوت پرستی یا لذت پرستی کے رجحان کو فروغ دینے یا عقلی قوتوں کو معطل اور اخلاقی حِس کو مفلوج کردیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ شراب اور نشہ کو حرام قرار دیا گیا اور ناچ، گانہ اور دیگر لغویات سے بالکلیہ اعراض کی تاکید آئی ہے۔

3. معمولاتِ زندگی میں اعتدال

رہن، سہن، کھانے پینے اور دیگر معمولات زندگی میں اعتدال سے کام لیا جائے۔ قرآن مجید نے مومن کی تعریف یہ کی ہےوَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا(الفرقان:67)جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ اُن کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔یعنی بہترین مومن وہ ہے کہ جو تمام احکام وامور میں ایسی درمیانی راہ اختیار کرتا ہے جس میں نہ افراط اور نہ تفریط بلکہ ہر فیصلہ، ہر اقدام اور کام میں توازن ہو۔

4. تکریم انسانیت

قرآنی تعلیمات کی رو سے کائنات کی ساری چیزیں انسان کی خادم ہیں اور انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔اللہ کے اس خلیفہ کی جان کی حرمت بیان کرکے اللہ تعالیٰ نے اسے عظمت بخشی ہے۔اور ایک انسان کے قتل کو سارے انسانوں کا قتل قرار دیا ہے۔:مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا(المائدہ:32)جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کردیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔آیت مبارکہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک انسان کا ناحق قتل گویا پوری انسانیت کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہے۔

2.4 فرہنگ

ملکوتیت : ملکوتی ہونے کی منزل ومقام، فرشتہ صفت ہونا

محاسن : بھلائیاں، خوبیاں، نیکیاں، اچھائیاں، خصائل

استیصال : قلع و قمع، بیخ کنی، جڑ سے اُکھاڑ دینا

سمونا : جذب کرنا، سمیٹ لینا، مِلنا، مِلانا، آمیز کرنا، کھپانا، جذب ہونا

رذائل : کمینی باتیں، بُری صِفات، بُرائیاں

2.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- قرآن نے عقائد وعبادات کے بعد سب سے زیادہ درستی اخلاق پر زور دیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بندہ عقائد وعبادات میں جس طرح اپنے رب کی مرضی کا پابند ہوتا ہے، اسی طرح زندگی کے طور طریق، شب وروز کے معمولات اور حقوق کی ادائیگی میں بھی اس کی مرضی کا پابند ہو۔
- اچھے اور برے اخلاق کی تعیین انسانی حس پر نہیں چھوڑی گئی ہے؛ کیونکہ یہ ہر انسان میں کم وزیادہ ہوتی ہے اور اخلاقی حس کی یہی کمی و بیشی اخلاق میں اختلاف کا سبب بنتی ہے۔ بلکہ اس کا ماخذ اللہ اور رسول کو قرار دیا گیا ہے۔
- قرآنی تعلیمات کی رو سے کائنات کی ساری چیزیں انسان کی خادم ہیں اور انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اللہ نے جان کی حرمت بیان کرکے اسے عظمت بخشی ہے اور ایک انسان کے قتل کو سارے انسانوں کا قتل قرار دیا ہے۔
- عبادت اسلامی معاشرہ کا دوسرا ستون ہے۔ اس کا مطلب رب ذوالجلال کی بندگی کرنا ہے اور قرآن مجید بندگی کا سلیقہ سکھانے کے لیے نازل ہوا ہے۔ بندگی وہ ہے جو انسانی روح کو پاکیزگی اور بلندی عطا کرتی ہے اور اسے رضاالٰہی کا طالب بناتی ہے۔

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ شخص کون ہے؟

(a). جس کے پاس تقوی ہو (b). مالدار ہو (c). مسلمان ہو (d). عالم دین ہو

2. نگاہ اور شرم کی حفاظت کا بہترین ذریعہ کون سا ہے؟

(a). نکاح (b). طلاق (c). جھوٹ (d). خلع

3. مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ معروفات کے فروغ اور منکرات کے ازالہ کے لیے جدوجہد کرے۔

(a). صحیح (b). غلط (c). دونوں غلط (d). ان میں سے کوئی نہیں

4. اسلام میں غیبت کو تصور کیا جاتا ہے؟

(a). مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا (b). منافقت (c). مرتد (d). سب صحیح

5. قرآن کے نقطہ نگاہ سے جھوٹ کیا ہے؟

(a). برائیوں کی جڑ (b). منفی پہلو (c). اخلاقی برائی (d). ان میں سے کوئی نہیں

2.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. قرآن کے نظریہ اخلاق اور اس کے نمایاں پہلو پر روشنی ڈالیں۔
2. قرآنی تعلیمات میں اخلاق کے نمایاں پہلو پر بحث کریں۔
3. رشتہ داروں کے حقوق پر قرآن کیا رہنمائی فرماتا ہے؟ قلمبند کریں۔
4. قرآنی تعلیمات ہم سے کن سماجی ذمہ داریوں کا مطالبہ کرتی ہے؟ بیان کریں۔
5. صبر و شکر پر ایک نوٹ لکھیں۔

2.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. قرآن مجید کی سماجی تعلیمات کو تفصیل سے بیان کریں۔
2. امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ تفصیل سے نوٹ لکھیں۔
3. قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات پر بحث کریں۔

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. سیرۃ النبی جلد ششم : علامہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ
2. قرآنی تعلیمات : مولانا محمد یوسف اصلاحی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
3. اسلامی معاشرہ : مولانا محمد یوسف اصلاحی، مکتبہ ذکری رام پور
4. تعلیمات قرآن : اشہد رفیق ندوی، اریب پبلیکیشنز، نئی دہلی

معروضی سوالات کے جوابات

5.A	4.A	3.A	2.A	1. A

اکائی 3: قرآنی تعلیمات (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 قرآن مجید کی سیاسی تعلیمات

3.2.1 سیاست کا مفہوم

3.2.2 سیاست و حکومت کے مقاصد

3.2.3 اسلامی حکومت کا مزاج

3.3 قرآن کی معاشی تعلیمات

3.3.1 معاشی جدوجہد کی ترغیب

3.3.2 فقر وفاقہ

3.3.3 کسب معاش کے طریقے

3.3.4 مصارف مال

3.3.5 اہل وعیال

3.3.6 زکوۃ اور صدقات

3.3.7 بخل سے اجتناب

3.3.8 فیاضی کی ترغیب

3.3.9 اللہ کی رضاجوئی مقصود ہو

3.3.10 خرچ کرنے میں میانہ روی

3.4 قرآن مجید کی قانونی تعلیمات

3.4.1 قرآن مجید کے مضامین
3.4.2 تشریع اسلامی کے چند بنیادی اصول
3.4.3 تشریع اسلامی کی بنیادی خصوصیات
3.5 اکتسابی نتائج
3.6 نمونہ امتحانی سوالات
3.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات
3.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات
3.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات
3.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

اس سے پہلے اکائی میں آپ نے قرآن کی اخلاقی وسماجی تعلیمات کو پڑھا اس اکائی میں قرآن کریم کی تین دوسری اہم تعلیمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے قرآن کی سیاسی تعلیمات بیان کی گئی ہیں کیونکہ اسلامی نظام حکومت کا مآخذ اللہ کی کتاب ہے جو برائیوں کا خاتمہ کرتا ہے اور بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن کی معاشی تعلیمات میں انسانی معیشت پر قرآن میں بار بار زور دے کر بیان کیا گیا ہے کہ تمام ذرائع وسائل جن پر انسانی معاش کا انحصار ہے وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ آخر میں قرآن مجید کی قانونی تعلیمات کیا ہیں، اس پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ اسلام جہاں انفرادی زندگی میں فرد کی اصلاح پر زور دیتا ہے، وہیں اجتماعی زندگی کے اصول وضوابط بھی بتاتا ہے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ

- واقف ہوں کہ قرآن کریم سیاسی، معاشی اور قانونی پہلوؤں سے ہمارے لیے کیا رہنمائی کرتا ہے۔
- قرآن مجید میں سیاست وحکومت کے مقاصد اور اسلامی حکومت کے مزاج، نیز معاشی تعلیمات میں حلال مال کمانے کی ترغیب اور اس کے خرچ کرنے کے اصول وضوابط اور قرآن کی قانون تعلیمات سے واقف ہو سکیں۔

3.2 قرآن مجید کی سیاسی تعلیمات

قرآن کریم کی اصل حیثیت کتاب ہدایت اور دستور حیات کی ہے۔ اس کی تعلیمات کا محور زندگی کا کوئی خاص گوشہ نہیں، بلکہ فرد و معاشرہ کے وہ تمام پہلو ہیں جن سے انسان کا براہ راست یا بالواسطہ کوئی نہ کوئی تعلق ہو۔ سیاست اجتماعی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے، اس کے بغیر عدل کا قیام، نظم وضبط کو برقرار رکھنا، شر پسندوں کی اصلاح، صالح طبیعتوں کی آبیاری اور انسانی صلاحیتوں کا درست استعمال ناممکن ہو جاتا ہے؛ اس لیے قرآن کریم نے اس موضوع سے خصوصیت کے ساتھ تعرض کیا ہے۔

3.2.1 سیاست کا مفہوم

سیاست اصلاً عربی زبان کا لفظ ہے۔ لسان العرب میں اس کا لغوی معنیٰ لکھا ہے کہ ”ساسَ الأمرَ سیاسةً: قام به۔ یعنی کسی کام کو انجام دینا۔ ثعلب کا شعر ہے:

سادةٌ قادةٌ لکل جمیع ساسةٌ للرجال یوم القتال

وہ تمام لوگوں کے رہنما اور سردار ہیں جنگ کے دن لوگوں کی نگہداشت کرنے والے ہیں

السیاسة: القیام علی الشيء بما یصلحه ”کسی چیز کا خیال رکھنا، اصلاح و نگرانی کرنا (لسان العرب حرف السین، سوس، ص108)۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں مختلف لغات سے سیاست کی تشریح کے بعد لکھا ہے کہ ”ان تصریحات کی رو سے اصلاً سیاست ’قیام علی الشیئ‘ اور ’ولایۃ امر‘ ہے؛ لیکن بعد میں معین طور پر اس کے معنی تنظیم و تدبیر ریاست یا ملک ہوگئے، جس میں مصالح امور انسانی اور نفاذ امر و نہی کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کے ضمن میں اس میں تعزیر اور ملک داری یا عدل و امن کی خاطر قہر و ہیبت یا سخت ضوابط کے ذریعے حکومت کرنے کا تصور شامل نظر آتا ہے“ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 11، ص483)۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا میں سیاست کی یہ تعریف ہے کہ ”سیاست کے عام معنی امور مملکت کا انتظام کرنے کے ہیں۔ سیاسیات کی ابتدا تہذیب (Civilization) کے ساتھ ہوئی۔ لفظ ”پالٹکس“ (سیاست) یونانی زبان کے لفظ ”پولس (Polis)“ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ شہر کے ہیں۔ سیاسیات کا چلن تمدنی زندگی کے وجود میں آنے سے ہوا۔ (جامع اردو انسائیکلوپیڈیا جلد 3، ص343)

1. قرآن مجید میں ریاست اور سیاست

”انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے جو ادارے قائم کیے ہیں، ان میں ریاست کا ادارہ سب سے اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی تشکیل میں اپنا اجتماعی نظم قائم کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفر ہی میں اس ادارے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور پوری انسانی تاریخ ریاست کے قیام و استحکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقاء کی تاریخ ہے“ (پروفیسر خورشید احمد: مقدمہ ’اسلامی ریاست‘ مولانا مودودی ص17 اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور 1972)۔

اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے، ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار صرف اور صرف اللہ کے لیے خالص ہو جائے اور شرک کی ہر جلی اور خفی شکل ختم کر دی جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی پکار یہی رہی ہے '' يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ (الاعراف 65) اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟۔

فکر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خالق ارض وسماوات اپنے نبی ﷺ کو یہ دعا سکھاتا ہے۔ ''وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا ''(الاسراء 80) دعا کرو: اے میرے پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو داخل کر سچائی کے ساتھ داخل فرما اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنادے۔

قرآن کی رو سے اللہ تبارک وتعالیٰ مالک الملک ہے، خلق اسی کی ہے، لہٰذا فطرتاً امر کا حق صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک میں اس کی خلق اور اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ صحیح راستہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اس کے نائب اور خلیفہ کی حیثیت میں اس کے قانون کے مطابق حکمرانی اور فیصلے کیے جائیں۔ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آل عمران 26) آپ کہیے: اے سارے ملکوں کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے دے اور تو جس سے چاہے حکومت چھین لے، تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے، بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

2. قرآنی سیاست کا محور

قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ اگرچہ سیاست کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا ہے؛ لیکن خلافت، تمکین فی الارض، استخلاف فی الارض وغیرہ جیسے الفاظ اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں، اور علمائے کرام نے انہیں الفاظ سے اسلام کے تصور سیاست اور اس کی سیاسی تعلیمات کو مستنبط کیا ہے۔

قرآن مجید کی نگاہ میں خلیفہ اللہ کی زمین پر اللہ کا نائب ہے، وہ مطلق اختیارات کا مالک نہیں؛ بلکہ خالق ومالک کی مرضی کو اس کی زمین پر نافذ کرنے والا ہے۔ وہ اپنے سے اوپر کی ہستی یعنی باری تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اسی طرح تمکین فی الارض سے یہ تصور نکلتا ہے کہ انسان کے بس میں اس کا حصول نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر قادر بنایا ہے۔ روئے زمین سمیت پوری کائنات کا حقیقی بادشاہ اور حاکم ایک ہی ہے، جس نے ان تمام کو پیدا کیا ''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ''(یوسف 40) فرماں روائی کا اختیار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ ''أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ''(الاعراف 54) پیدا کرنا اور حکومت کرنا صرف اسی کے لیے خاص ہے۔ ان دونوں آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ روئے زمین، اصلاً ملکیت خالق کائنات ہی کی ہے؛ لہٰذا فیصلہ اور حکم بھی اسی کا چلے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا'' يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ

سَبِيلِ اللَّهِ''(ص26)اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے، سو آپ لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرتے رہیے اور (آئندہ بھی) نفسانی خواہش کی پیروی نہ کیجیے کہ وہ آپ کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔

3.2.2 سیاست و حکومت کے مقاصد

قرآن مجید کی نگاہ میں حکومت کا مقصد نیکی، انصاف اور قانون الٰہی کا قیام ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ''(حج 41) یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیک کام کا حکم دیں اور برے کام سے روکیں اور انجام سب کاموں کا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ امام رازی 'مکّنّاھم' کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے مراد ''سلطنت''۔(امام رازی، سورہ حج 4) مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم ان لوگوں کو زمین میں فرماں روائی اور سلطنت عطا کریں تو یہ روئے زمین کو ہر طرح کی آلودگی سے پاک کر دیں گے، خدائی سلطنت کو قائم کریں گے اور پھر خلافت و سیاست کو جو بنیادی مقاصد ہیں ان کو عملی طور پر نافذ کریں گے۔ مذکورہ بالا آیت میں جن امور کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک جامع اصطلاح اور مستقل حکم رکھتا ہے۔ مفسرین نے اس کی رو سے نظام سیاست کے درج ذیل شعبوں کے قیام کو اہم قرار دیا ہے:

1. نظام عبادات کا قیام

اسلام میں نماز کی حیثیت مسلم ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''بين الرجل وبين الشرك والكفر ترك الصلاة'' (مسلم 82، کتاب الایمان، باب اطلاق اسم الکفر علیٰ من ترک الصلاۃ) آدمی اور کفر و شرک کے درمیان حد فاصل نماز ہی ہے۔ اسی طرح دوسری حدیث میں نماز کو دین کا ستون بتایا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اعمال بدنیہ میں نماز کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔ آیت بالا میں نماز پڑھنے کے بجائے اقامت صلاۃ (نماز کو قائم کرنے) کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقامت صلوٰۃ حکومت کی ذمہ داریوں میں ایک ہے، اس لیے کہ اقامت صلوٰۃ کی ضمن میں دیگر عبادات مثلاً زکوٰۃ، صیام اور حج کا نظام قائم کرنا بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ تبھی بندگی کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ قرآنی تصور حکومت کا سب سے بنیادی مقصد بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال مالک حقیقی کا غلام بنانا ہے۔

2. مالیات کی منصفانہ تقسیم

عبادات کے بعد مالیات (Finance) کی بحث بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اموال کی صحیح اور مساویانہ تقسیم معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ فی الحال دنیا میں جتنے بھی نظریات (Capitalism, Socialism) کام کر رہے ہیں، ان میں بظاہر اعتدال کا فقدان ہے؛ لیکن قرآنی احکام کے نتیجہ میں بیت المال (Treasury) کا جو نظام قائم ہوتا ہے، وہ لازمی طور پر اموال کی منصفانہ تقسیم کا ضامن ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے جس مال کو تم اپنے ہاتھوں سے برت رہے ہو، یہ دراصل اللہ رب العزت کا ہے، اس نے تمہیں اس کا مالک نہیں بنایا ہے، بلکہ صرف برتنے اور استعمال کے لیے دیا ہے، اس پر تمہارے علاوہ تمہارے رشتہ داروں، پڑوسیوں

اور مسکین ویتیم کا بھی لازمی حق ہے'' وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ''(الذاریات19)

3. اچھائی کا فروغ اور برائی کا ازالہ

قرآنی تصور سیاست کا ایک بنیادی مقصد سماج میں برے اثرات اور شیطانی وسوسوں سے متاثر دلوں کی رہ نمائی، بلند اخلاق اور اعلیٰ اقدار کی ترویج وفروغ ہے اسی لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو قرآن نے بنیادی فریضہ قرار دیا۔ متعدد مواقع پر تفصیلی ہدایات دی ہیں اور معروف کے فروغ میں جو لوگ رکاوٹ بنیں اور منکرات میں ملوث رہیں ان کے لیے قرآن کریم میں اس تعلق سے تعزیراتی قوانین اور حدود و قصاص کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس میں انسانی جان ومال کا تحفظ اور پاکیزہ نفوس کی عفت و پاکدامنی کو بنیادی اہمیت دی گئی۔

4. عدل وقسط کا قیام

عدل و قسط کا قیام اسلامی سیاست کا اصل مدار ہے۔ اس معاملے میں قرآن مسلم و غیر مسلم، قرب و بعد کسی بھی پہلو پر مصالحت کرنے کو تیار نہیں، ہر نبی کی شریعت میں اس کو اہمیت دی گئی اور ہر انسان کے لیے لازم قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ''(النساء105)یقیناً ہم نے حق کے ساتھ آپ کی طرف کتاب نازل کی ہے، تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو سجھایا ہے اور آپ خائنوں کے طرف دار نہ بنیے۔

5. ظلم وفساد کی بیخ کنی

ظلم وفساد کی داستان تاریخ کا وہ اٹوٹ حصہ ہے، جسے ہر طاقت وراور ظالم و جابر حکمراں نے اپنا حق سمجھا اور اپنی محکوم رعایا پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے؛ لیکن قرآن کریم ایک ایسے نظام حکومت کی بنیاد ڈالنا چاہتا جس میں شر پسند عناصر چاہے وہ بادشاہ وقت ہی کیوں نہ ہو اس پر قدغن لگائی جائے چنانچہ اس نے اپنے مخاطبین کو بار بار متنبہ کیا ہے کہ ہم نے ظلم کرنے والے لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا ہے، لہٰذا تم ان کی روش پر ہرگز مت چلنا ''وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ''(الانبیاء11)اور ہم نے کتنی ہی بستیاں غارت کرڈالیں جن کے رہنے والے ظالم اور پھر ان کے بعد دوسری قوم پیدا کردی۔'' وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا ''(الحج48)اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں میں نے مہلت دی تھی جب کہ وہ نافرمان تھی، پھر میں نے انہیں پکڑ لیا۔

3.2.3 اسلامی حکومت کا مزاج

اسلامی حکومت کا ایک مخصوص مزاج ہے۔ یہ حکومت ایک داعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ حکومت اپنے دائرہ اختیار میں دین کو قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور دنیا کے باقی تمام لوگوں کے سامنے اسلام کے پیغام کو پیش کرتی ہے۔ اس حکومت کی حیثیت ایک مبلغ اور معلم کی ہے اور اس کا سارا کام محبت، اخوت، مشاورت، رحم اور ہمدردی کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ ''وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ○ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ

عِلْمٍ "(انعام107-108)اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو(وہ خود ایسا بند وبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے، تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو اور (اے ایمان لانے والو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں مت دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے، کوتوال نہیں بنایا گیا ہے۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روش کو پیش کر دو اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھو (اسلامی ریاست، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ص 631)

3.3 قرآن کی معاشی تعلیمات

قرآن مجید نے معاشیات کے مضمون کو خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اس حقیقت کو بار بار دوہرایا ہے کہ تمام وسائل وذرائع جن پر انسان کی معاش کا انحصار ہے، اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ انہیں انسانیت کے لیے نفع بخش بنایا ہے اور انسان کو ان سے فائدہ اٹھانے اور ان پر تصرف کا اختیار بخشا ہے۔ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ (سورۃ الملک:15) وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو، اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق، اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔"

یہ اختیار بھی اس شرط کے ساتھ ہے کہ مال حاصل کرنے اور مال خرچ کرنے دونوں میں حلال و حرام کی تمیز کرنا ضروری ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا (سورۃ النساء:29) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے۔ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔"

3.3.1 معاشی جدوجہد کی ترغیب

مومن کی زندگی کے لیل ونہار کی تفصیل قرآن میں بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے رات کو سونے اور سکون وطمانیت حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے، اور دن کو معاشی جدوجہد کا وقت بتایا ہے۔ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا () وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (سورۃ النباء :10-11)"اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا۔"

اسلام تجرد، ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا ہے، بلکہ دنیا کی نعمتوں سے حدود وآداب کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے لطف اندوز ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ دنیا کی زندگی کا قرآنی تصور پیش کرتے ہوئے پروفیسر عبد الحق انصاریؒ رقم طراز ہیں: قرآن مجید نے دنیا کی زندگی کی نہ تو مطلق مذمت کی ہے اور نہ مطلق تحسین۔ نہ تمام تر شر قرار دیا ہے اور نہ تمام تر خیر۔ نہ غیر مشروط طور پر مقصود ٹھہرایا ہے اور نہ کلیۃً قابل اجتناب۔ قرآن مجید کی جن آیتوں میں کہا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی متاعِ غرور ہے، لہو ولعب ہے، خسارہ ہی خسارہ ہے، بے وزن، حقیر اور مذموم ہے، وہ آیتیں تین طرح کے افراد کے سیاق میں آئی ہیں۔ ایک ان لوگوں کے سیاق میں جو خدا اور آخرت کے منکر ہیں اور ہدایت الٰہی

اور رسالت کے قائل نہیں، یاجو منافق ہیں، صرف زبان سے ایمان کا دعوی کرتے ہیں مگر دل سے منکر ہیں، یاوہ جو اگرچہ زبان ودل سے منکر نہیں لیکن دین وایمان کے بنیادی تقاضوں سے مجرمانہ طور پر غفلت برتتے ہیں اور بیشتر غیر اسلامی زندگی بسر کرتے ہیں۔"[مقصد زندگی کا اسلامی تصور، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ص:140]

دنیوی زندگی کو بہتر گزارنے اور برتنے کے لیے معاش بنیادی ضرورت ہے۔اس کے لیے جدوجہد، تگ ودو، دوڑ دھوپ دین ہی کا مطالبہ ہے۔اسلام مومن کی زندگی کو ہر لحاظ سے کامل بنانا چاہتا ہے۔مومن بے سہارا، تنگ دست اور مجبور نہ ہو،اس لیے کسبِ معاش کی بارہا ترغیب دی ہے، ارشاد باری ہے: وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (سورۃ القصص:77) جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔"

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (سورۃ الجمعۃ:10) پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔"اس آیت کریمہ میں نماز سے فراغت اور عبادت کی ادائیگی کے بعد معاشی جدوجہد کی تعلیم دی گئی ہے، حصولِ معاش کے لیے تگ ودو کرنا، محنت کرنا اسلام کی نظر میں پسندیدہ امر ہے، بلکہ اسلام اس کی ترغیب دیتا ہے، گویا اسلام مومن کو معاشی لحاظ سے خوش حال دیکھنا پسند کرتا ہے۔کسبِ رزق کے لیے جدوجہد کی ترغیب رسول ﷺ کی متعدد احادیث میں بھی ملتی ہے۔حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طلب الحلال فریضة بعد الفریضة "رزق حلال کی طلب وجستجو کرنا، ایک فریضہ کے بعد دوسرا فریضہ ہے۔"

3.3.2 فقر وفاقہ

فقر وفاقہ کی زندگی، عزت سے محروم سے کر دیتی ہے۔اس لیے رسول اللہ ﷺ نے غربت کی زندگی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ہے، غربت بسا اوقات انسان کو کفر کے دہانے تک پہنچا دیتی ہے۔اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کاد الفقر أن یکون کفراً "غربت کبھی کفر تک پہنچا دیتی ہے۔"[بیہقی، شعب الایمان، باب الحث علی ترک الغل والحسد، حدیث:6188]۔

انسان کی دنیا اور آخرت دونوں خوشگوار ہوں درج ذیل قرآنی دعا کا یہی پیغام ہے۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (سورۃ البقرۃ:201) اے ہمارے رب، ہمیں دنیا کی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور آگ کے عذاب سے بچا۔"

اس کے علاوہ متعدد آیات ہیں، جن میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ دنیا کو خوشگوار بنانا دین کے منافی نہیں ہے۔وَاكْتُبْ

لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ (سورۃ الاعراف:156) اور ہمارے لیے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی ''وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ (سورۃ النحل:30) دوسری طرف جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ''بہترین چیز اتری ہے''۔ اسی طرح نیکوکار لوگوں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا، دائمی قیام کی جنت جن میں وہ داخل ہوں گے۔ مذکورہ بالا آیات کریمہ میں دنیا کی بھلائی طلب کرنے اور کامیابی ملنے پر اللہ کا اجر و انعام رکھا گیا ہے۔

3.3.3 کسب معاش کے طریقے

کسب معاش کے لیے قرآن مجید میں جدوجہد کی ترغیب کے ساتھ خاص طور سے تجارت پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن نے تجارت کا دو معنی استعمال کیا ہے۔ سامان زندگی کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا اور توشۂ آخرت جمع کرنے کے لیے ایمان و اخلاق کو مضبوط بنانا اور معاشی جدوجہد والی تجارت کی بہت سی تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔

مال حاصل کرنے لیے زراعت، مزدوری اور دیگر جائز ذرائع اختیار کرنا سب قرآن کی نگاہ میں مستحسن اور پسندیدہ ہیں۔ مال کمانے کے سلسلے میں اسلام جس چیز سے روکتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان حرام مال نہ حاصل کرے۔ سود، قمار، رشوت، غصب، حق سے زیادہ وصول کرنا، ناپ تول میں کمی کر کے منافع حاصل کرنا، فحش کاروبار، سرقہ، غبن نیز وہ ہر طریقہ جو دھوکے پر مبنی یا جن سے فساد رونما ہونے کا اندیشہ ہو، ان کی شناعت بیان کی گئی ہے اور ان میں ملوث شخص کو دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا (سورۃ النساء:10) جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں، درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔''

3.3.4 مصارف مال

مال کمانے کے بعد خرچ کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلی ہدایت یہ ہے کہ فضول خرچی نہ کی جائے، بے جا اسراف نہ ہو۔ میانہ روی سے مال خرچ ہو۔ اسراف اور تبذیر دونوں معیوب ہیں۔ اسراف یہ ہے کہ جائز کاموں میں ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے اور تبذیر یہ ہے کہ نامطلوب اور مذموم امور میں مال لٹایا جائے، اسلام نے دونوں سے روکا ہے اور کن امور میں مال خرچ کیا جائے، اور کن پر نہ خرچ کیا جائے، اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ قرآن کریم میں فضول خرچی کرنے والے کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ○ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا (سورہ بنی اسرائیل:26-27) رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔ فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔''

3.3.5 اہل وعیال

انسان سب سے پہلے اپنے اوپر، اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے۔ بیوی کے نان ونفقہ کی اس پر ذمہ داری ہے، اس میں کوتاہی اور لاپرواہی پر خدا کے یہاں جواب دہ ہوگا۔ شوہر اگر تنگ دست ہے تو اپنی استطاعت کے بقدر خرچ کرے اور اگر خوش حال ہے، مال واسباب ہے تو اسی حساب سے خرچ کرے۔ قرآن میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ (سورۃ البقرۃ:236) خوش حال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر"

حکیم بن قشیریؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ شوہر پر بیوی کا کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ان تطعمها اذا طعمت و تكسوها اذا اكتسيت أواكتبست ولا تضرب الوجه ولا تقبح ولا تهجرالا في البيت" کہ جب تو کھائے تو اسے بھی کھلائے اور جب تو پہنے تو اسے بھی پہنائے اور اس کے منہ پر نہ مار اور اسے برا بھلا نہ کہو اور گھر کے سوا اس سے علیحدگی نہ اختیار کر۔" [سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی حق المرأۃ علی زوجھا، حدیث:2142]

بیوی کے ساتھ بچوں کی پرورش پر اپنا مال خرچ کرے۔ بچوں کی صحت، تعلیم وتربیت پر خرچ کرے۔ اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی عین ثواب اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔

3.3.6 زکوۃ اور صدقات

مال و دولت کے سلسلے میں قرآن مجید کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ انسان کے پاس جمع نہ رہے، بلکہ وہ ضرورت مندوں تک پہنچتا رہے، دولت کی گردش ہوتی رہے۔ اسلامی نظام معیشت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہاں مال معاشرہ کے چند افراد کے پاس جمع نہیں رہتا ہے، بلکہ اس کی گردش ہوتی رہتی ہے۔ ضرورت مند، مستحقین اور فقراء ومساکین تک دولت تقسیم ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن نے انسان کے مال میں چند اصول وشرائط کے ساتھ زکوۃ کا باقاعدہ نظام قائم کیا ہے، جو نقد میں ڈھائی فیصد اور دیگر اموال میں الگ الگ ہے۔

زکوۃ سے جہاں ضرورت مندوں اور مستحقین کی مدد ومعاونت ہوتی ہے، اس سے انسان کے اندر مال کی ہوس ومحبت بھی کم ہوتی ہے۔ نیز انسان کے ذہن میں یہ مستحضر رہتا ہے کہ یہ دولت اسے اللہ کی طرف سے عطا ہوئی ہے، وہ اسے بے لگام اور بے مہار نہ کمانے کا حق رکھتا ہے اور نہ ہی خرچ کرنے کا۔ زکوۃ کے مستحقین کی فہرست بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (سورۃ التوبۃ:60) یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا وبینا ہے۔"

3.3.7 بخل سے اجتناب

مال کی حرص وہوس اور محبت انسان کو اپنی ذمہ داریوں سے غافل کر دیتی ہے۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز سے بے پرواہ کر دیتی ہے۔اس کے اندر بخل کی نفسیات پیدا کرتی ہے۔ اس لیے قرآن نے بخل کی بہت مذمت کی ہے۔ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:ایاکم والشح فانما ھلک من کان قبلکم بالشح أمرھم بالبخل فبخلوا وأمرھم بالقطعیة فقطعوأ وأمرھم بالفجور ففجروا [سنن ابو داؤد، کتاب الزکوۃ، باب فی الشح، حدیث:1698] حرص و بخل سے بچو، تم سے پہلے کے لوگ اس حرص و بخل کی وجہ سے تباہ ہوئے۔ حرص نے انہیں بخل پر آمادہ کیا اور وہ بخیل ہو گئے۔ اس نے انہیں ناطہ توڑنے پر آمادہ کیا اور انہوں نے ناطے رشتے کو منقطع کیا، اس نے انہیں فسق و فجور پر ابھارا اور وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔"

3.3.8 فیاضی کی ترغیب

بخل کی شناعت کے علی الرغم سخاوت و فیاضی کی ہمت افزائی اور اس پر اجر و ثواب کی خوش خبری دی گئی ہے۔اسی لیے سخاوت وفیاضی کی صفت پیدا کرنے کے لیے زکوۃ کی ادائیگی کے ساتھ شریعت نے انسان کو انفاق کی ترغیب دی ہے، اور اس پر اجر وانعام کا وعدہ کیا ہے۔انفاق کی ترغیب کی غرض وغایت یہی ہے کہ انسان کے دل میں زیادہ سے زیادہ راہ خدا میں خرچ کرنے کا جذبہ پیدا ہو، وہ صرف واجبی زکوۃ دینے پر ہی اکتفانہ کرے بلکہ نفلی صدقات و خیرات کرنے کا بھی داعیہ اس کے اندر پیدا ہو اور پروان چڑھتا رہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورۃ البقرۃ:274) جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، اُن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔"

3.3.9 اللہ کی رضاجوئی مقصود ہو

خرچ کرنے کے سلسلے میں سب سے اہم ہدایت یہ ہے کہ انسان اللہ کے رضاجوئی حاصل کرنے کے لیے خرچ کرے، نام ونمود اور ریاکاری، شہرت طلبی اس کا مقصود نہ ہو۔اس لیے قرآنی آیات اور احادیث نبویہ میں صدقہ چھپ کر دینے کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور نام و نمود کے لیے خرچ کرنے پر وعید سنائی گئی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا (سورۃ النساء:38) اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور وہ درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور روز آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا اسے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی۔" دوسری ہدایت یہ کہ انسان مال دے کر احسان نہ جتلائے، اس سے دل آزاری ہوتی ہے۔انسان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے، نیز ایسے مال خرچ کرنے کا کوئی نفع انسان کو نہیں ملے گا۔

3.3.10 خرچ کرنے میں میانہ روی

اسلام مال خرچ کرنے میں میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے، انسان بخالت سے نہ کام لے اور نہ ہی اتنا زیادہ خرچ کرے کہ وہ خود محتاج ہو جائے۔ مال اعتدال سے خرچ کرے، اس کی اپنی بھی ضرورتیں پوری ہوں، حقوق وواجبات بھی ادا ہوں اور ضرورت مندوں اور محتاجوں کا بھی خیال کرے۔ خرچ کرنے میں اعتدال کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا گیا: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (سورۃ بنی اسرائیل:29) اور نہ اپنے ہاتھ کو گردن میں باندھے رکھو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہ) اور نہ بالکل کھلا چھوڑ دو (کہ سب کچھ دے ڈالو) اور ملامت زدہ وعاجز بن کر رہ جاؤ۔" وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (سورۃ الفرقان:67) اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی وبخل سے کام لیتے ہیں۔"

اسلام کی معاشی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے اسلام تکوینِ ثروت اور افزائشِ دولت کے ساتھ تقسیم دولت کا حکم دیتا ہے اور اکتناز دولت کی ممانعت کرتا ہے۔ انسان کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ دنیا میں محنت کر کے اپنا رزق حاصل کرے، یہ دین کا مطالبہ ہے، مال حلال طریقے سے حاصل کرے، اس کے پاس آنے والی کمائی کا ہر روپیہ حلال ہو، اس مال کو وہ اپنے اوپر، اپنے اہل وعیال پر اور والدین، اقرباء، فقراء، یتیم ومساکین پر خرچ کرے، اسراف اور تبذیر نہ کرے۔ خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لے، نہ بے تحاشا خرچ کرے اور نہ بخالت کرے۔ کمانے اور خرچ کرنے میں اعتدال ومیانہ روی ہی معیشت کو مستحکم رکھتی ہے۔

اسلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کی معاشی ترقی کے ساتھ اس کی اخلاقی نشو ونما کو بھی ساتھ لے کر چلتا ہے، اس لیے لین دین، خرید وفروخت میں اخلاقی حدود وآداب کا لحاظ کرنے کی سخت ہدایت دی گئی ہے۔ نیز انسان دوسروں کا مونس وغمخوار اور ہمدرد بنے، اس کے دل میں دوسروں کے لیے ہمدردی کے جذبات نشو ونما ہوں، وہ لوگوں کے لیے نفع بخش ثابت ہوں۔ اس لیے زکوۃ، انفاق وصدقات کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔

3.4 قرآن مجید کی قانونی تعلیمات

قرآن مجید شریعت اسلامی کا اولین اور اصل ماخذ ہے، اس کے علاوہ تمام ماخذ اسی کی جانب رجوع ہوتے ہیں۔ آسمانی کتابوں میں یہ واحد کتاب ہے جو روزِ اوّل سے اب تک من وعن محفوظ ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ وحی الٰہی ہے اور اس کا ہر حکم واجب الاتباع ہے۔ قرآن مجید میں احکام زیادہ تر اصولی واجمالی بیان ہوئے ہیں۔ تفصیلات احادیث میں بیان ہوئی ہیں یا فقہاء کے فہم وفراست پر چھوڑ دی گئی ہیں، چونکہ یہ سلسلہ ہدایت کی آخری کڑی ہے۔ اس لیے اس کی تعلیمات کا ہر دور اور ہر زمانہ کے لیے یکساں ہونا ضروری تھا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ تمام شعبۂ زندگی کے خطوط متعین کر کے ان میں رنگ بھرنے کا کام حالات وزمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں پر چھوڑ دیا جاتا۔ اور بعد میں مقررہ حکمت عملی کے مطابق متعینہ خطوط پر عمارت تعمیر ہوتی رہتی۔ اگر بالفرض ابتداء ہی میں تمام باتیں بیان کر دی جاتیں اور عملی شکل کے سارے خاکے تیار کر دیے جاتے تو اس کی دستوری حیثیت باقی نہیں رہتی اور اس کی دوامی اور عالمگیر حیثیت ختم ہو کر ساری تعلیم مخصوص

زمانہ تک محدود ہو جاتی اور پھر ایسا جمود تعطل پیدا ہو جاتا کہ ارتقاء پذیر معاشرے کو سمونے اور اقتضاء ومصالح کو جذب کرنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جاتیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید نے حکومت کی نوعیت اور پالیسی متعین کر دی کہ یہ اللہ کی نیابت وامانت ہو گی اور زیادہ سے زیادہ الٰہی صفتوں کو اپنے اندر جذب کر کے عدل ومساوات کے اصول پر ان کے مادی وروحانی فوائد کا بندوبست کرے گی اور یہ بات بھی بتادی کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لیے شورائی نظام ہونا چاہیے، اس کے علاوہ اور جو باتیں بنیادی حیثیت کی تھیں، ان کی وضاحت کر دی۔

3.4.1 قرآن مجید کے مضامین

قرآن مجید کے احکام اور مضامین کا استقصاء کرنا ممکن نہیں۔ یہ علم وفن کا ایسا بحر زخار ہے جس کے عجائبات کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ تاہم اتنی بات طے شدہ ہے کہ اس کا بنیادی موضوع بنی نوع انسان کی ہدایت واصلاح ہے۔ اس نے عقائد کی درستگی، کردار کی بلندی، اخلاق کی پاکیزگی اور صالح معاشرے کے قیام پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن نے زیادہ تر باتیں اپیل کے اسلوب میں واقعات وحقائق کی روشنی میں کہی ہیں۔ اوامر ونواہی یعنی فقہی احکام سے متعلق آیات بہت کم ہیں۔ کل قرآنی آیات چھ ہزار سے زیادہ ہیں۔ جن میں فقہی آیات یعنی آیاتِ احکام کی تعداد بیش از بیش چھ سو ہے۔ ان میں بھی زیادہ تر اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں، جزئیات سے بالعموم احتراز کیا گیا ہے۔ ان احکام کو فقہاء نے مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1. عبادات

اسلام کے نزدیک انسان کا مقصد وجود عبادت ہے۔ اس لیے دیگر شعبہ ہائے زندگی میں قرآن نے عبادات کے سلسلے میں نسبۃً زیادہ وضاحت سے احکام جاری کیے ہیں۔ ان میں نماز، روزہ، خالص عبادات بھی ہیں اور زکوۃ جیسی مالی وتمدنی عبادات اور حج وجہاد بھی عبادت ہی کے زمرے میں آتے ہیں جن میں جسم وجان سبھی کچھ لگانا پڑتا ہے اور اس میں شخصیت اور تمدن دونوں کا مفاد وابستہ ہے۔ پورا نظام عبادت قرآنی آیات ہی سے مستنبط ہے جس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں۔

2. معاشرتی احکام

ایسے احکام جو ایک صالح معاشرے کے قیام اور آپسی تعلقات کی استواری مرد وبیوی کے تعلقات کی استواری، پڑوسیوں واعزہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے تقریباً ستر آیات میں ہدایات دی گئی ہیں۔

3. معاملات

خرید وفروخت، رہن واجارہ، کفالہ وحوالہ، قرض وہبہ اور شرکت وغیرہ فقہاء کی اصطلاح میں معاملات کے زمرے میں آتے ہیں۔ قرآن میں اس سلسلے کی تقریباً 70 آیات ہیں۔ جن میں افراد واقوام کے باہمی تعلقات کے عدل، مساوات، تعاون اور نرمی کی بنیاد پر قیام، ضرر ونفع وخسارہ ونقصان کی تلافی کی صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس میں سول لا (شہری حقوق) کے علاوہ انسانی حقوق وغیرہ بھی شامل ہیں۔

4. خصومات

اسلام معاشرہ میں اتحاد واتفاق کا داعی ہے۔ لیکن اختلاف ونزاع کا برپا ہونا انسانی معاشرہ کا خاصہ ہے۔ تنازعہ پیدا ہونے کی صورت میں قرآن نے عدل وانصاف کے بنیادی اصول، شہادت کے ضروری احکام اور فیصلہ کی اساس وبنیاد سے متعلق تیرہ آیات میں ضروری ہدایات دی ہیں۔

5. حدود وتعزیرات

صالح معاشرہ کے قیام اور جرائم کے انسداد کے لیے سنگین سزائیں مقرر کی ہیں تاکہ سزا کے خوف سے جرائم پیشہ افراد کی بیخ کنی ہو سکے۔ مثلاً قتل کی سزا قصاص، سرقہ کی سزا قطع ید، زنا، قذف اور شراب خمر وغیرہ کے لیے کوڑوں کی سزا۔ ایسے احکامات تقریباً تیس آیات میں پائے جاتے ہیں۔

6. دستوری احکام

ایسے احکام و قوانین جو نظام حکومت کے قیام ودوام کے لیے بنیادی اور اساسی حیثیت کے حامل ہیں دستوری احکام سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں 35 آیتوں میں حکمرانی کے لیے بنیادی اصول، حاکم ومحکوم کے تعلقات کی نوعیت، شوریٰ کے ضوابط، جنگ و صلح کے آداب، عدل ومساوات اور اولوالامر کی اطاعت وغیرہ کے احکام نیز پڑوسی ممالک سے تعلقات وروابط کی نوعیت اور خارجہ پالیسی وغیرہ کے لیے واضح اشارے کیے گئے ہیں۔

قرآن مجید میں فقہی آیات کا اس پہلو سے بھی مطالعہ کیا گیا ہے کہ عبادات، معاشرتی احکام اور میراث وغیرہ کے احکام نسبتاً تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ ان کے بالمقابل حکومت وسیاست اور ملکی وبین الاقوامی تعلقات کے بارہ میں صرف بنیادی اصول وقواعد کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ عبادت ومعاشرت کے بیشتر احکام ایسے ہیں جن میں عقل کا زیادہ دخل نہیں، وہ زیادہ تر تقلیدی اور عقل انسانی سے ماوراء ہیں۔ سیاسی امور اور معاملات کا تعلق براہ راست زمانے کے مصالح اور تقاضوں سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو ہر زمانے میں حالات یکساں ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی اقدار وروایات میں ہمیشہ یکسانیت باقی رہتی ہے۔ اس لیے ایسا کرنا ناگزیر مانا گیا کہ معاصر فقہاء ان نصوص کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے مصالح وتقاضوں کو پورا کریں۔ قرآن نے تفصیلی احکام بیان کرنے کے بجائے احکام کے استنباط کے اصول وآداب کی تعیین کی ہے۔

3.4.2 تشریع اسلامی کے چند بنیادی اصول

قرآنی احکام وہدایات کا غائرانہ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مآخذ قانون نے تشکیل قانون کے مرحلہ میں انسانی طبیعت ومزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل اصولوں کی رعایت لازمی قرار دی ہے۔

1- تیسیر وعدم حرج 2- قلۃ تکلیف 3- تدریج

1. تیسیر وعدم حرج

شریعت اسلامی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ قوانین ایسے بنائیں جائیں جن پر بآسانی عمل درآمد ہو سکے۔ ان میں ایسی تنگی نہ ہو کہ انسان کے لیے عمل کرنا نہایت دشوار ہو اور اس کا کوئی مناسب حل بھی نہ موجود ہو، یہ اصول دراصل قرآن مجید کی درج ذیل آیات سے ماخوذ ہیں۔

(الف) يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ185) "اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا"۔

(ب) وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج،78) "اور دین میں اس نے تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی"۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت الٰہی کے نفاذ میں، اس اصول کو ہمیشہ مد نظر رکھا اور اس پر کاربند رہنے کی لوگوں کو تاکید کی۔ آپ نے واضح لفظوں میں ارشاد فرمایا: بعثت بالحنفية السمحة (میں دین حنفی دے کر بھیجا گیا ہوں) نیز آپ کی عادت وفطرت میں یہ چیز شامل تھی کہ آپ کو جب کبھی دو چیزوں کے درمیان انتخاب کا اختیار دیا گیا تو آسان تر چیز کو اختیار کیا، بشرطیکہ وہ گناہ کی چیز نہ ہو، اس سلسلے میں آپؐ کے کئی واضح ارشادات بھی موجود ہیں مثلاً آپ نے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو دینی معاملات کا انتظام سپرد کرتے وقت خاص طور سے ہدایت فرمائی کہ یسرا ولا تعسرا بشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولاتختلتفا (صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسیر، 30-38) "آسانی کرنا مشکل میں نہ ڈالنا، رغبت دلانا، نفرت نہ پیدا کرنا، موافقت کے جذبہ کو فروغ دینا، اختلاف نہ ڈالنا"۔

2. قلت تکلیف

تشریع قرآن کا دوسرا بنیادی اصول ہے اور یہ دراصل تیسیر وعدم حرج کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ قوانین میں جس قدر تنگیاں اور دشواریاں ہوں گی اسی قدر تکلیف میں زیادتی ہوگی۔ قرآن مجید کی درج ذیل آیات سے یہ اصول ماخوذ ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ: 286) "اللہ کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا"۔ ایک دوسرے موقع پر یہ آیت وارد ہوئی ہے کہ يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا (نساء:28) "اللہ تعالیٰ تمہارے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ درج ذیل قرآنی آیات میں بھی اس اصول کے لیے واضح اشارہ موجود ہے"۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ (المائدہ:101-102) "مسلمانو! چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو اگر وہ تم پر ظاہر ہو گئیں تو تم کو ضرر پہونچائیں گی، اگر تم نے ان کے متعلق نزول قرآن کے وقت سوال کیا تو وہ تم پر ظاہر ہو جائیں گی، خدا نے ان کو معاف کر دیا اور خدا بخشنے والا بردبار ہے۔ تم سے پہلے ایک قوم نے ان چیزوں کا سوال کیا، پھر ان کی منکر ہوگی"۔ یہ سوالات جن سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے ان چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو خدا نے معاف کر دیا، یعنی ان کی حرمت سے خاموشی اختیار کی ہے۔ اس بنا پر ان کے متعلق ان کا سوال حرمت کا سبب بن سکتا ہے لیکن اگر وہ ان کے متعلق پوچھ گچھ نہ کرتے تو وہ اسی طرح معاف رہتیں اور ان کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات سے بھی مذکورہ اصول کی بھرپور

تائید ہوتی ہے۔

3. تدریج

قرآنی احکام 23 سال کی مدت میں حالات و تقاضہ کے لحاظ سے بتدریج نازل ہوتے رہے۔ نزول قرآن کے وقت عرب بہت سی رسوم و عادات میں گھرے ہوئے تھے، قرآن نے انہیں کو مخاطب کر کے اپنی دعوت کا آغاز کیا، ان میں بعض عادتیں قائم رکھنے کے لائق تھیں جن سے بظاہر قومی ارتقاء میں کوئی نقصان نہ تھا اور بعض ضرر رساں بھی تھیں جن کا بقا قوم کے مفاد میں نہیں تھا، قرآن مجید نے ان کی اصلاح، بقایا ممانعت کے احکام ایسے حکیمانہ اسلوب میں نازل کیے کہ وہ بسہولت قلوب میں نفوذ کرتے جائیں کیونکہ مناسب تربیت اور بقدر ضرورت فکری تیاری کے بغیر انتہائی احکام کا پابند کرنے کی صورت میں بغاوت کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ جو قوانین انسانی فطرت کے خلاف قوموں پر بہ زور قوت لادے گئے وہ عارضی ہی ثابت ہوئے ہیں۔ قرآن مجید نے اسی وجہ سے قانون تشریع میں ''تدریج'' کو خاص طور پر پیش نظر کر رکھا ہے، فقہاء نے اسے بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ درج ذیل نصوص شرعیہ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

عرب شراب و جوا کے بے حد رسیا تھے، جب کہ یہ دونوں چیزیں انسان کو مالی و جسمانی دونوں اعتبار سے بالکل کھوکھلا کر دیتی ہیں بلکہ استحکام معاشرہ کی چولیں ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ اسلام نے ان پر قدغن لگانا ضروری سمجھا۔ مگر اس تدریج کے ساتھ کہ مخاطب اس کی شناعت کو سمجھ لے اور دل سے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا عزم کرے۔ قرآن نے اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ اشارہ دیا کہ: قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا (بقرہ: 219) ''ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے الفاظ میں اس تدریج کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ انما نزل اول مانزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا ثاب الناس الاسلام نزل الحلال و الحرام ولو نزل اول شيئ: لاتشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً ولو نزل: لاتزنوا، لقالوا: لاندع الزنا ابداً۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن 4993) ''پہلے مفصل (سورۂ حجرات سے آخر قرآن تک) کی وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت و دوزخ (ترغیب و ترہیب) کا ذکر ہے۔ پھر جب لوگ اسلام پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے تو پھر حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے مثلاً شراب نہ پینے کا حکم اگر اول ہی دن نازل ہوتا تو لوگ یہ کہتے ہیں ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے، اسی طرح ابتداء میں زنا چھوڑنے کا حکم نازل ہوتا تو لوگ کہہ اٹھتے کہ ہم اس سے ہرگز باز نہ آئیں گے۔ اس طریق کار سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ'' قانون کے اجراء میں تدریجی طریق کار استعمال کرنا چاہیے اور زیادہ زور تعلیم و تربیت پر دینا چاہیے۔ نیز ابتدائی مرحلے میں قوانین ہلکے ہونے چاہئیں تاکہ آسانی کے ساتھ ان کا علم حاصل کیا جا سکے۔ اور عمل میں زیادہ دشواری نہ ہو، پھر جیسی جیسی فضا ہموار ہوتی جائے زندگی کے مختلف گوشوں میں شرعی قوانین کا نفاذ ہوتا رہے۔

احکام فقہیہ کے اس تدریجی اصول ہی کا شاید یہ عملی مظہر ہے کہ قرآن مجید میں فقہی احکام پہلے اجمالاً بیان ہوئے ہیں۔ بعد میں مناسب موقع پر ان کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ مکی اور مدنی احکام کے تقابلی مطالعے سے حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ مکی احکام

بالعموم مجمل بیان ہوئے ہیں، اس کے برخلاف مدنی احکام بالخصوص تمدنی معاملات میں قرآن مجید نے بہت زیادہ تفصیلات بیان کی ہیں۔ مثلاً ایفاء عہد کی تاکید کی، پھر تجارت کی ترغیب دی اور باطل طریقے سے مال حاصل کرنے کی ممانعت کی۔ اس کے بعد تجارت کے تفصیلی احکام بیان کیے جس میں ربٰوا کو حرام قرار دیا۔

3.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- قرآن کریم کی اصل حیثیت کتاب ہدایت اور دستور حیات کی ہے۔ اس کی تعلیمات کا محور زندگی کا کوئی خاص گوشہ نہیں، بلکہ فرد و معاشرہ کے وہ تمام پہلو ہیں جن سے انسان کا براہ راست یا بالواسطہ کوئی نہ کوئی تعلق ہو۔
- عدل و قسط کا قیام اسلامی سیاست کا اصل مدار ہے۔ اس معاملے میں قرآن مسلم و غیر مسلم، قرب و بعد کسی بھی پہلو پر مصالحت کرنے کو تیار نہیں۔
- اسلامی حکومت کا ایک مخصوص مزاج ہے۔ یہ حکومت ایک داعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ حکومت اپنے دائرہ اختیار میں دین کو قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور دنیا کے باقی تمام لوگوں کے سامنے اسلام کے پیغام کو پیش کرتی ہے۔ اس حکومت کی حیثیت ایک مبلغ اور معلم کی ہے اور اس کا سارا کام محبت، اخوت، مشاورت، رحم اور ہمدردی کے ساتھ انجام پاتا ہے۔
- دنیوی زندگی کو بہتر گزارنے اور برتنے کے لیے معاش بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے لیے جدوجہد، تگ و دو، دوڑ دھوپ دین ہی کا مطالبہ ہے۔ قرآن مومن کی زندگی کو ہر لحاظ سے کامل بنانا چاہتا ہے۔ مومن بے سہارا، تنگ دست اور مجبور نہ ہو، اس لیے کسبِ معاش کی بارہا ترغیب دی ہے۔

3.6 نمونہ امتحانی سوالات

3.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. قرآن مجید کی نگاہ میں خلیفہ کی زمین میں حیثیت ہے؟

(a). نائب　　(b). مالک　　(c). آقا　　(d). ان میں سے کوئی نہیں

2. قرآن مجید کی نگاہ میں حکومت کا مقصد کیا ہے؟

(a). قانون الٰہی کا قیام　　(b). ملوکیت کو فروغ دینا　(c). جمہوریت کا قیام　　(d). ظلم و زیادتی کا خاتمہ

3. سیاست اصلاً کس زبان کا لفظ ہے؟

(a). عربی　　(b). فارسی　　(c). فرنچ　　(d). انگریزی

4. دنیوی زندگی کو بہتر گزارنے اور برتنے کے لیے بنیادی ضرورت کیا ہے۔؟

(a). کسبِ معاش (b). فقروفاقہ (c). تنگ دستی (d). مفلسی

5. حصولِ معاش کے لیے تگ ودو کرنا، محنت کرنا اسلام کی نظر میں پسندیدہ امر ہے؟

(a). صحیح (b). غلط (c). پتہ نہیں (d). ان میں سے کوئی نہیں

3.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. قرآن مجید میں ریاست وسیاست پر اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔
2. . قرآن میں معاشی جدوجہد کی ترغیب پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. تشریع اسلامی کے بنیادی اصول پر بحث کیجیے۔
4. تشریع اسلامی کی خصوصیات کو بیان کیجیے۔
5. قرآن کے نقطہ نگاہ سے سیاست وحکومت کے مقاصد کو لکھیے۔

3.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. قرآن مجید کی سیاسی تعلیمات کو تفصیل سے بیان کیجیے۔
2. قرآن مجید کی معاشی تعلیمات کو تفصیل سے قلمبند کیجیے۔
3. قرآن مجید کی قانونی تعلیمات پر بحث کیجیے۔

3.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اسلام کا سیاسی نظام : مولانا محمد اسحاق سندیلوی، دار المصنفین اعظم گڑھ 1957ء
2. اسلامی ریاست : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلیکشنز لاہور 1972ء
3. اسلام کا نظام سیاست وحکومت : پروفیسر محسن عثانی، نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی 2017ء
4. اسلامی نظام کے خدوخال : یوسف القرضاوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی 2018ء

معروضی سوالات کے جوابات

5.A	4.A	3.A	2.A	A .1

اکائی 4: تدوین قرآن عہد نبوی میں

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید
4.1 مقاصد
4.2 قرآن کا تعارف
4.3 عہد نبوی میں جمع و تدوین قرآن کی تاریخ
4.4 عہد نبوی میں نزول وحی کی کیفیت
4.5 جمع و حفاظت قرآن
4.6 کتابت قرآن کریم اور اس کا تاریخی پس منظر
4.7 فن کتابت اور کاتبین وحی
4.7.1 قرآن کی کتابت
4.7.2 سامان کتابت
4.8 حفظ قرآن
4.8.1 مکہ میں حفظ قرآن
4.8.2 مدینہ میں حفظ قرآن
4.8.3 مذاکرہ قرآن
4.8.4 عہد نبوی کی درسگاہیں
4.9 اکتسابی نتائج
4.10 نمونہ امتحانی سوالات
4.10.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

4.10.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات
4.10.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات
4.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی نازل کردہ کتابوں میں آخری کتاب ہے، جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ پر جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ سے 22 سال 6 مہینے کی مدت میں بتدریج نازل ہوئی۔ قرآن انسانوں کی رہنمائی کے لئے نازل کیا گیا۔ یہ کتاب ہر زمانے میں قوموں کی ہدایت کا ذریعہ رہی ہے۔ قرآن میں انسان کی فلاح و بہبود کے وہ تمام اصول موجود ہیں، جو اس کی زندگی کو روحانی، اخلاقی اور معاشی طور پر بہتر بنانے کا راستہ دکھاتے ہیں۔ اگرچہ قرآن کی زبان عربی ہے، مگر اس کا پیغام تمام عالم کے لئے ہے۔ یہ کتاب تمام مذاہب، قوموں اور ثقافتوں کے لئے ایک دعوت ہے، جو انسانوں کو اللہ کی طرف بلاتی ہے اور انہیں اس کے راستے پر چلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس کے مضامین میں تنوع انسان کو اللہ کی رضا کی جانب بڑھنے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

اس اکائی میں قرآن کی جمع و تدوین کے تاریخی ارتقاپر اور اسکے تدریجی نزول کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے۔ نیز اس کی تدوین کے ذرائع اور طریقہ کار پر گفتگو ہوگی۔ کہ کس طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے نزول کردہ آیات کو صحابہ سے کتابت کروا کر اور پھر انہیں ذہن نشین کروا کر حفاظت کا سامان کیا۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ

- عہدِ نبوی میں قرآن کیسے محفوظ اور مرتب کیا گیا اس کی وضاحت کر سکیں گے۔
- قرآن کس کس چیز پر لکھا جاتا تھا (ہڈی، کھجور کی ٹہنیاں، پتھر، چمڑا وغیرہ) اس کے بارے میں تبادلہ خیال کر سکیں گے۔
- عربوں کی مضبوط قوتِ حافظہ اور فنِ کتابت سے آشنائی کو قرآن کی تدوین میں ایک اہم ذریعہ کے طور پر سمجھیں گے۔
- صحابہ کرام کس طرح قرآن کو بذریعہ حفظ اور لکھ کر محفوظ کرتے تھے اس کی مثالیں دیں سکیں گے۔
- قرآن کی اصل متن کی حفاظت اور اس کی حکمت سے واقف ہو کر قرآن کو سیکھنے اور یاد کرنے کی ترغیب محسوس کریں گے۔

4.2 قرآن کا تعارف

اس دنیا میں رہنے والے ہر مسلمان کا یقین اس بات پر ہے کہ قرآن مجید اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتابوں میں سے آخری اور مکمل کتاب ہے، جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ پر جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ سے 22 سال 6 مہینے کی مدت میں بتدریج نازل ہوئی۔ اس کی ہر آیت میں اللہ نے انسانوں کی رہنمائی و ہدایت کا اشارہ دیا ہے۔ قرآن مجید میں کل 114 سورتیں اور 6236 آیات ہیں۔ قرآن مجید کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسانوں کو روحانی، اخلاقی، سماجی، اور معاشی طور پر مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس میں اللہ کی توحید، اس کی عبادت، نیک عمل، سچائی، انصاف، محبت، اور انسانوں کے حقوق پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز یہ اللہ کے عذاب سے بچنے کے راستے اور جہنم کے امکانی عذاب سے نجات کے طریقے بیان کرتا ہے۔ قرآن کا پیغام ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہے، اور یہ انسانوں کو ایک کامل ضابطہ حیات فراہم کرتا ہے جو انسانی زندگی کے ہر دور میں عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ قرآن کے مخاطب سارے انسان ہیں چاہیں وہ کسی بھی رنگ، نسل، قومیت، وطن، زبان، زمان و مکان کے مالک ہوں۔ قرآن میں اللہ ارشاد فرماتا ہے: "قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ"۔

قرآن کی زبان نہایت معجزانہ ہے، اس کے معانی میں گہرائی ہے۔ اس کی آیات میں انسان کے لیے عبرت، فلاح اور کامیابی کا پیغام ہے۔ یہ کتاب نہ صرف روحانیت کی طرف رہنمائی کرتی ہے بلکہ سماجی انصاف، حقوق العباد اور عدلیہ کے اصولوں کی بھی وضاحت کرتی ہے۔ قرآن مجید انسانوں کو اچھے اخلاق اور بہترین معاشرتی تعلقات کا درس دیتا ہے اور انسانوں کو اللہ کی رضا کی کوشش کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے بے شمار موضوعات ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے: "وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ"۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور وہ نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا اس کی تصدیق خود قرآن میں تو موجود ہے لیکن جو اس کلام الٰہی پر یقین نہیں رکھتے ان کے لئے یہ بات قابل امر ہے کہ اس کے نزول سے لیکر آج تک اس کلام میں زیر، زبر، اور پیش کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی حروف اور الفاظ یا آیات قرآن میں تبدیلی کے امکانات ہی نہیں رہ جاتے ہیں اور اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کا خود اس کی حفاظت کی ذمہ داری لینا ہے اللہ کا ارشاد ہے "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" بے شک جس چیز کا ذمہ دار خود اللہ ہوا اس میں کوئی تبدیلی یا کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ قرآن کی تعلیمات انسانوں کو سیدھی راہ پر چلنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہیں اور یہ کتاب قیامت تک کے لیے رہنمائی کا منبع ہے۔ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کو سمجھے، اس پر عمل کرے اور اس کی تلاوت کرے تاکہ اپنی زندگی کو بہتر اور اللہ کی رضا کے مطابق ڈھال سکے۔

4.3 عہد نبوی میں جمع و تدوین قرآن کی تاریخ

جمع قرآن سے مراد قرآن کریم کا جمع کرنا، اکٹھا کرنا۔ خواہ حفظ قرآن سے ہو یا کتابت سے۔ اور تدوین سے مراد اس کو کتابی

صورت میں ترتیب دینا ہے۔ تدوین قرآن کی ایک مستقل دل چسپ معلوماتی تاریخ ہے جسے ایک طالب علم کے لئے جاننا اہم ہے۔ تاکہ وہ آگاہ رہے کہ یہ مقدس کتاب کس طرح، کن کن ادوار سے گزر کر محفوظ ترین صورت میں ہم تک پہنچی؟ جمع قرآن کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح قرآن مجید آپ ﷺ پر نازل ہوا ہے اور جس طرح آپ نے اسے پڑھایا سکھایا ہے اسی طرح اسے لکھ کر محفوظ کرلیا جائے۔ یہ اللہ کا حکم تھا تاکہ مستقبل میں ممکنہ اختلاف جو قرأت یا اس کے الفاظ، ترتیب اور لغت میں پیدا ہو سکتا ہے وہ نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی مگر اس حفاظت کا کام صحابہ رسول اور امت کے قراء و حفاظ سے بھی لیا۔

اس سبق میں ہمیں یہ معلومات ہوگی کہ قرآن کریم کو کس طرح جمع کیا گیا اور کس طرح اس کی تدوین نبی کریم ﷺ کے زمانے میں عمل میں آئی۔ اس تاریخ کو سمجھنے کے لئے قرآن کے نزول اور اس میں پنہاں حکمتوں اور مقاصد کو سمجھتے ہیں تاکہ آئندہ کے صفحات میں تاریخی حقیقت کی بہ آسانی تفہیم ہو سکے۔

علمائے جمہور اور تمام مفسرین و محدثین کے نزدیک یہ بات متفقہ طور پر ثابت ہے کہ قرآن کریم رمضان الکریم کی شب قدر میں ایک ہی مرتبہ میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا گیا۔ اس کی تائید خود قرآن کریم اور احادیث نبوی سے بھی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ'' دوسری جگہ ارشاد ہے"اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ"۔ اس کے بعد یہ کلام ربانی اللہ کے رسول جناب محمد مصطفیٰ ﷺ پر بتدریج 22 سال اور 6 مہینے کی مدت میں ٹکڑوں کی شکل میں نازل ہوا۔ اس طریقہ تنزیل کی حکمت خود قرآن نے بیان فرمائی ہے ارشاد ربانی ہے" وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا"(الفرقان 32) ایک دوسری جگہ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے '' وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ''(106) ۔ ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو تھوڑا تھوڑا نازل فرمانے میں چند حکمتیں تھیں۔(1) مہبط وحی ﷺ کے قلب مبارک کی تسکین و تقویت کا سبب ہو۔ مشرکین کی اذیتوں کے مقابلہ میں صبر کی تلقین ملتی رہے نیز اللہ کا لطف و کرم حاصل ہوتا رہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا'' (انعام: 34)(ترجمہ اور آپ سے پہلے رسول جھٹلائے گئے تو انہوں نے صبر کیا، اس جھٹلانے اور اذائیں پانے پر) ایک دوسری جگہ ارشاد ہے" فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ "(احقاف:35) ترجمہ: تو آپ صبر کیجئے جیسا کہ آپ سے پہلے ہمت والے رسولوں نے صبر کیا۔)(2) تدریجا نزول کی حکمت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ کے اعزاز و عنایات کا ظہور ہوتا رہے۔(3) مشرکین کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا رہے۔(4) واقعات و حوادث کے مطابق نزول اور ان پر تنبیہ ہوتی رہے۔(5) احکام شرعیہ کا نفاذ بتدریج ہو، تاکہ امت پر عمل کرنا گراں نہ گزرے۔(6) امت پر قرآن کا حفظ و فہم آسان ہو۔ (7) اس بات کی یقین دہانی بار بار ہوتی رہے کہ قرآن نزول فرمانے والی کوئی ذات ہے جس کی طرف سے تنزیل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض وہ سورتیں بھی ہیں جو یکبارگی نازل ہوئیں جن میں "سورۃ الکوثر، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفاتحہ، سورۃ البرأۃ وغیرہ شامل ہیں۔

4.4 عہد نبوی میں نزول وحی کی کیفیت

جمع قرآن کی تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزول کی کیفیت اور پھر اس کے جمع و تدوین کی تاریخ کو مزین کیا جائے۔

لفظ 'وحی' کے معنی سرعت کے ساتھ کسی قسم کا اشارہ کر دینا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری وحی کی شرعی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"وحی وہ کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کسی نبی کی طرف بھیجتا ہے ور اس کے دل میں ثبت کر دیتا ہے پھر وہ نبی اسی وحی کو اپنی زبان سے ادا کرتا اور اسے لکھ دیتا ہے۔ اسی کو کلام اللہ کہتے ہیں۔" وحی کیا ہے اس کی معلومات ہو جانے کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اقسام وحی کا مطالعہ کیا جائے۔

اقسام وحی

قرآن کس طرح سے نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتا تھا اس بات کو سمجھنے کے لئے نہایت اہم ہے کہ ہم اقسام وحی سے واقف ہوں۔ نزول وحی کے مختلف طریقے تھے جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

- رویائے صادقہ
- نفث فی الروع
- صلصلۃ الجرس
- تمثیل
- فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں آنا
- فرشتہ کا انسانی شکل میں آنا
- بلاواسطہ مکالمہ

نزول قرآن کی مختلف سورتوں میں سے سب سے پہلی صورت جس میں اللہ کے رسول پر قرآن کی آیتیں اتریں حضرت عائشہؓ کے مطابق وہ قسم رویائے صادقہ تھی۔ جو بھی خواب آپ ﷺ دیکھتے وہ صبح میں سامنے نظر آتا تھا۔ یہاں تک کہ غار حرا کی خلوت گزینی اور متعدد سالوں کی عبادت و ریاضت کے بعد حق کی صدا گونج اٹھی اور غار حرا کے دہانے پر ایک فرشتہ حاضر ہوا اور اس نے کہا "اقراء" "ما انا بقاری" (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) اسی لئے آپ کو امی کہا گیا۔ یہاں تک کہ فرشتہ نے تین بار اللہ کے رسول کو پکڑ کر بھینچا اور پھر سورۃ علق کی آیتیں پڑھ کر سنائیں:"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ(1) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ"۔

4.5 جمع و حفاظت قرآن

اب ہم یہاں جمع اور حفاظت قرآن کے ذرائع پر روشنی ڈالیں گے کہ کس طرح نبی اکرم ﷺ نے کتابت اور حفظ قرآن کے ذریعہ قرآن کی تدوین اور جمع قرآن کا اہتمام کیا۔

نزول اور حفاظت قرآن کے سلسلہ میں یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اللہ نے قرآن کے جمع اور حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے، اس لئے اس نے روز اوّل سے ہی اس کے نزول کے ساتھ ساتھ اس کی حفاظت کے مختلف طریقہ بھی بتلائے۔ چنانچہ جب حضرت جبرئیل پہلی بار وحی الٰہی لیکر آئے تو وہ دیباج یعنی جنتی ریشمی کپڑے پر لکھی ہوئی تھی۔ اسی لئے جب وہ آیتیں اللہ کے رسول ﷺ پر پیش کی گئیں تو آپ ﷺ نے اسے پڑھنے سے منع فرمایا، لیکن جب حضرت جبرئیل نے سورۃ علق کی آیتیں خود پڑھ کر سنائی تو اللہ کے رسولؐ نے اسے فورا دہرایا۔ ان آیتوں کا ریشمی کپڑے پر لکھا ہونا اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ نے قرآن کو اپنے پاس محفوظ انداز میں رکھا ہوا ہے، اور دنیا میں اس کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ اسے لکھ لیا جائے اور ذہن نشیں کر لیا جائے۔ اس بارے میں مولانا عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا ارشاد 'ماانا بقاری' میں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ امّی کا تعلیم و تلقین کے ذریعہ کسی کلام کو پڑھنا کیسے بعید اور خلاف ہے۔ باوجود یہ کہ نبی کریم ﷺ فصاحت و بلاغت کے درجہ کمال پر فائز تھے۔ البتہ کسی کتاب کو یا کسی لکھی ہوئی تحریری کو پڑھنا امت کے منافی ہے"(جمع و تدوین قرآن، ڈاکٹر حافظ محمد عبد القیوم، الفیصل، لاہور) وحی الٰہی لکھے ہوئے انداز میں لانے کا مقصد قطعاً یہ نہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کو صحیفہ سے دیکھ کر قرآن پڑھایا جائے، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ کو اس بات سے آگاہ کرنا تھا کہ جو کلام آپ پر نازل ہو رہا ہے اس کو اسی طرح لکھ لیا جائے اور اس کی کتابت کا باقاعدہ اہتمام کیا جائے۔ اسی طرح یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کا رسم الخط منزل من اللہ ہے۔

4.6 کتابت قرآن کریم اور اس کا تاریخی پس منظر

اس دنیا میں کسی بھی کتاب کی حفاظت کے لئے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں 1۔ تحریری، 2 حافظی، قرآن مجید کی حفاظت کے لئے دونوں طریقے اختیار کئے گئے۔ حفاظت قرآن کا اصل دارومدار تو حفظ تھا مگر نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی کتابت کا بھی اہتمام کر لیا۔ یہ بھی قرآن مجید کی حفاظت کا ایک اہم جز تھا۔ اس لئے یہاں یہ سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ جزیرۃ العرب کا تعلیمی پس منظر کیا تھا؟ اور ساتھ ہی مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ میں کس قسم کا درس و تدریس رائج تھا؟۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہل عرب کے اپنے تجارتی اسفار کی بناء پر مصر، شام، یمن، ہندوستان و افریقہ جیسے ممالک سے تعلقات تھے ان میں سے مصر و شام اور ہندوستان متمدن ممالک میں سے تھے اور علمی میدان میں بھی ترقی کی شاہراہ پر گامزن تھے۔ یہی وہ ممالک ہیں جو ادوات کتابت جسے عربی میں ورق بردی کہا جاتا ہے کو مہیا کراتے تھے۔ اسی سے یہ گمان اور یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ اہل حجاز کے تجار ان متمدن ممالک کے اسفار میں علمی لحاظ سے بھی متاثر ہوئے ہوں گے، اور حجاز میں سامان کتابت کو متعارف کروایا ہو گا۔

4.7 فن کتابت اور کاتبین وحی

زمانۂ جاہلیت کے عرب، خصوصاً حجاز کے باشندے، کتابت کے فن سے مکمل طور پر ناآشنا نہ تھے۔ بلکہ مختلف مواقع پر تحریر کا استعمال ان کے معاشرتی و مذہبی شعور کا حصہ تھا، اور تعلیمی سرگرمیوں کے دوران کتابت کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ بعثتِ محمدی ﷺ کے

بعد جب وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے اس موجودہ تمدنی و علمی پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے کتابتِ قرآن کا فوری اہتمام فرمایا۔ آپ ﷺ جبریل امینؑ کے ذریعہ نازل شدہ آیات کے بعد مخصوص کاتبینِ وحی کو بلاتے اور ان کو اس امر کی ہدایت فرماتے کہ فلاں آیت کو فلاں سورہ کی فلاں آیت سے پہلے یا بعد میں درج کیا جائے، جیسا کہ جبریلؑ کی طرف سے ترتیبِ آیات کے بارے میں ہدایت ہوتی۔ اس طرح قرآن مجید کی ہر آیت، ہر سورہ اور حتیٰ کہ ہر لفظ کو نہ صرف محفوظ کیا جاتا بلکہ اسے نزولی ترتیب کے بجائے توقیفی ترتیب (ترتیبِ توقیفی) کے مطابق مرتب بھی کیا جاتا۔

اس عمل کے ایک اہم شاہد، حضرت زید بن ثابتؓ، جو کاتبِ وحی بھی تھے، خود بیان کرتے ہیں کہ: ”جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی، رسول اللہ ﷺ اسے مجھے لکھوا دیتے۔ میں اس تحریر کو آپ ﷺ کو سناتا اور اگر کسی تصحیح یا اصلاح کی ضرورت ہوتی تو آپ ﷺ بنفس نفیس اصلاح فرماتے۔ بعد ازاں میں اس تحریر کو صحابہ کرامؓ کے سامنے پیش کرتا تاکہ حفظ و قرأت کے ذریعے اسے آگے منتقل کیا جا سکے“۔ اس ابتدائی دور میں قرآن مجید کسی منظم "مصحف " کی صورت میں نہ تھا، اور نہ ہی کاغذ کا رواج تھا، لہٰذا اسے مختلف میسر ذرائع پر تحریر کیا جاتا۔ ان میں درختوں کی چھالیں، ہڈیوں کے چوڑے ٹکڑے (خصوصاً کندھوں کی ہڈیاں)، چمڑے، پتھروں کی تختیاں، اور کھجور کی شاخیں شامل تھیں۔ یہ متفرق اور غیر منظم مواد نبی اکرم ﷺ کے حجرۂ مبارک میں محفوظ رکھا جاتا، جو عہدِ نبوی میں کتابتِ قرآن کی اولین شکل اور بنیاد فراہم کرتا ہے۔ (مناہل العرفان از زرقانی:239)

کاتبینِ وحی

کاتبینِ وحی" سے مراد ان منتخب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے، جنہیں نبی اکرم ﷺ کی جانب سے نازل شدہ قرآنی آیات کی کتابت پر مامور کیا گیا۔ ان صحابہ کا شمار انتہائی بااعتماد اور دیانت دار افراد میں ہوتا ہے، جنہوں نے نزولِ وحی کے فوری بعد نبی کریم ﷺ کی نگرانی میں قرآنی آیات کو تحریری شکل دی۔ اگرچہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے بھی کتابتِ وحی میں حصہ لیا، لیکن ان کے علاوہ بھی کئی نامور صحابہ اس اہم ذمہ داری میں شریک رہے۔ ان میں قابل ذکر نام عبد اللہ بن ابی سرحؓ، زبیر بن عوامؓ، خالد بن سعید بن العاصؓ، ابان بن سعید بن العاصؓ، خالد بن ولیدؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، عمرو بن العاصؓ، عامر بن فہیرہؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ جیسے جلیل القدر اصحاب کے ہیں، جن کا ذکر امام ابن القیم نے زاد المعاد، (جلد 1، ص:3) میں کیا ہے۔

عہدِ نبوی میں قرآن مجید کا ایک مرکزی نسخہ نبی کریم ﷺ کے پاس موجود تھا، جو وحی کے تسلسل کے ساتھ تحریر ہوتا رہا۔ تاہم متعدد صحابہ کرامؓ نے ذاتی طور پر بھی قرآنی آیات کو قلم بند کیا اور اپنے ذاتی مصاحف تیار کیے۔ ان اصحابِ قرآن میں عبد اللہ بن مسعودؓ، علی بن ابی طالبؓ، سیدہ عائشہؓ، ابی بن کعبؓ، عثمان بن عفانؓ، تمیم داریؓ، ابو درداءؓ، ابو ایوب انصاریؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، عبادہ بن صامتؓ اور زید بن ثابتؓ شامل تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا تھا کہ قرآنِ کریم کو دشمن کی زمین میں لے جانے سے گریز کیا جائے، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی صحیح بخاری کی روایت (جلد 1، حدیث 409) سے ثابت ہے۔ مزید بر آں، نبی کریم ﷺ نے اس بات پر بھی تاکید فرمائی کہ قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا مواد انہی اوراق پر تحریر نہ کیا جائے جن پر قرآن درج کیا جاتا ہے۔

ایک مشہور روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

مَنْكَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرآنِ فَلْيَمْحُهُ وَحَدِّثُوْا عَنِّيْ وَلَا حَرَجَ

جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے، وہ اسے مٹا دے، اور مجھ سے حدیث بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

یہ روایت نہ صرف کتابتِ قرآن کے تقدس کو واضح کرتی ہے بلکہ اس کی تفریق بھی بیان کرتی ہے کہ وحیِ قرآنی اور دیگر اقوالِ نبوی کو کس انداز میں جدا رکھا جانا چاہیے۔

نبی کریم ﷺ کی نگرانی میں کی جانے والی کتابتِ قرآن نہایت منظم، مرتب اور الہامی اصولوں کے مطابق انجام پائی، جو سبعہ احرف (سات لہجوں) پر مشتمل تھی۔ قرآن مجید کی آیات کی ترتیب "توقیفی" تھی، یعنی یہ ترتیب نبی اکرم ﷺ نے خود اپنی رائے سے نہیں بلکہ وحی کے ذریعے جبریل امینؑ کی ہدایت کے مطابق مقرر فرمائی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے نمازوں میں بالخصوص جہری قرأت کے دوران انہی ترتیب شدہ آیات کو تلاوت فرمایا کرتے تھے، جس سے عملی طور پر اس ترتیب کی تائید ہوتی ہے۔ اس بارے میں امام نسائیؒ نے *السنن الکبریٰ* میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب سورۂ بقرہ کی آخری آیت ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ (البقرہ: 281) نازل ہوئی تو جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا" :يَا مُحَمَّدُ! ضَعْهَا عَلَى رَأْسِ ثَمَانِينَ وَمِئَتَيْ آيَةٍ مِنْ سُورَةِ الْبَقَرَةِ "یعنی: اے محمدؐ! اس آیت کو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 280 کے بعد رکھ دیں"۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء کا مؤقف ہے کہ قرآن کی آیات میں تقدیم و تاخیر کی گنجائش نہیں، کیونکہ ترتیب بذاتِ خود توقیفی ہے، جو اجتہادی نہیں بلکہ منصوص ہے۔ اس مفہوم کی تائید حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جسے امام احمد بن حنبلؒ نے *مسند احمد* میں نقل کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر تھے کہ آپ ﷺ نے آسمان کی جانب نظر اٹھائی، پھر نیچے جھکائی، اور فرمایا" :أَتَانِي جِبْرِيلُ فَأَمَرَنِي أَنْ أَضَعَ هَذِهِ الْآيَةَ فِي هَذَا الْمَوْضِعِ مِنَ السُّورَةِ) "یعنی: جبریل میرے پاس آئے اور حکم دیا کہ اس آیت کو سورہ کے اس مخصوص مقام پر رکھوں۔ یہ آیت تھی: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (النحل: 90)۔ اسی طرح ایک اور قابلِ ذکر واقعہ صحیح بخاری (حدیث 4530) میں مذکور ہے، جب حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے حضرت عثمان بن عفانؓ سے سوال کیا کہ سورۂ بقرہ کی آیت: وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً۔ جو منسوخ شدہ ہے، کو غیر منسوخ آیت کے بعد کیوں درج کیا گیا؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا" : میں کسی آیت کو اس کے نبی اکرم ﷺ کی بتائی ہوئی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا"۔ یہی توقیفی ترتیب بعد میں سیدنا زید بن ثابتؓ نے خلیفہ اول و سوم کے ادوار میں قرآن کے جمع و تدوین کے عمل کے دوران اختیار کی، اور اس ترتیب پر تمام صحابہ کرامؓ کا اجماعی اتفاق ہوا۔ حتیٰ کہ سورہ کے آغاز میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کی تحریر بھی نبی کریم ﷺ کے حکم سے ہی شامل کی گئی، جو اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن مجید کی کتابت نہ صرف محفوظ اور منضبط تھی بلکہ وحی کی روشنی میں انجام پائی۔

4.7.1 قرآن کی کتابت

نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ جب بھی قرآن کی آیتیں نازل ہوتیں آپ فوراً کاتب وحی کو بلا کر نازل کردہ آیات کو لکھوا دیتے

تھے۔اس طرح سے کتابت کے ذریعہ حفاظت قرآن کاکام انجام دیا گیا۔لیکن اس ضمن میں ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن کے جمع و تدوین سے متعلق سوالات اور اعتراضات پر جو متعدد ادوار میں اٹھتے رہے ہیں، کے جوابات خود قرآن نے دئے ہیں۔

قرآن دنیامیں نازل کردہ اور انسانوں کے ذریعہ لکھی گئی تمام کتابوں میں اس لحاظ سے خود مکتفی ہونے کی حیثیت رکھتاہے کہ اپنے متعلقہ سوالات کاجواب دے سکے۔ جیسے کہ یہ سوال کہ اس کلام الٰہی کی ابتدائی حالت کیا تھی؟ اس کاجواب قرآن کی دوسری سورۃ 'البقرۃ' میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (ترجمہ: یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک نہیں) اس آیت سے قرآن کی کتابت اور اس کے لکھے ہونے کا پتہ چلتاہے۔ اس کے علاوہ متعدد آیات ہیں جس میں اللہ نے کتاب اور نوشتہ کے الفاظ ذکر کئے ہیں۔ اللہ نے ایک جگہ یوں مخاطب کیا ہے وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا "(ترجمہ: اور یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آتی ہیں، جن کو لکھ لیاہے اس شخص نے یعنی محمد ﷺ نے اس کو یعنی قرآن کو، پھر وحی صبح شام اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے) اس آیت سے یہ معلوم ہوتاہے کہ قرآن کی کتابت اور نوشتگی ایک عام بات تھی جو قریش مکہ کے علم بھی تھی چہ جائے کہ وہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتاہے کہ قرآن کس چیز پر لکھاجاتا تھا۔اس ضمن میں قرآن یوں گویاہے:

وَ الطُّوْرِ(1)وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ(2)فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ "(ترجمہ: قسم ہے طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی جو باریک جھلی کھلی ہوئی پر لکھی ہوئی ہے) یہ وہی رق ہے جس کے بارے یہ معلومات ہیں کہ وہ ایک پارچمنٹ ہوتا تھا جس میں قدیم آسمانی کتابیں جیسے کہ توریت، انجیل، اور زبور وغیرہ لکھی ہوئی تھیں۔ قرآن اس بات کی اطلاع دے رہاہے کہ اس کی کتابت بھی رق پر ہی ہے۔ اسی طرح کی ایک دوسری آیت میں اللہ ارشاد فرماتاہے:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً(2)فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ(3) "(ترجمہ: اللہ کے پیغمبر جو پاک اوراق پڑھتے ہیں۔ جن میں مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں) ان آیات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عہد نبوی میں قرآن کی کتابت کاکام ہوا۔ عہد نبوی میں جب صحابہ مسجد نبوی میں اکٹھا ہوتے تو وحی کے متعلق دریافت کرتے اگر وحی نازل ہوئی ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اسے لکھوادیتے اور دوسروں کو یاد کروادیتے۔ جن لوگوں نے قرآن کی کتابت کی ان کے متعلق قرآن فرماتاہے:

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ(13)مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ(14)بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ(15)كِرَامٍ بَرَرَةٍ(16)"

(ترجمہ: صحیفوں میں لکھا ہوا ہے، ایسے صحیفے جو مکرم و محترم ہیں، پاک ہاتھوں سے لکھے ہوئے ہیں، ان کے لکھنے والے جو بڑے بزرگ اور پاک باز لوگ ہیں۔)

اس آیت سے قرآن کی کتابت کے ساتھ ساتھ اس کے لکھنے والوں کی اعلیٰ صفات کا اظہار کیا گیا جن میں صحت نویسی کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نزول قرآن کے وقت دربار رسالت میں کتابت قرآن کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ حضرت جبرئیل جب وحی لاتے تو اس کا محل بھی بیان فرمادیتے کہ اس کو فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھا جائے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کاتبین وحی کو اس کا حکم دیتے اور وہ اسے اسی مناسبت سے لکھ لیا کرتے تھے۔ قرآن کی حفاظت کا یہاں تک اہتمام تھا کہ جن الواح پر قرآن مجید لکھا ہوتا تھا، اس پر کوئی اور تحریر خواہ وہ حدیث نبوی ہی کیوں نہ ہو، لکھنے سے منع فرماتے تھے۔ کتابت قرآن اور اس کے اہتمام کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود روایت کرتے ہیں:

"جردوا القرآن ولا تخلطو به ماليس منه"

اسی طرح جب جبرئیل وحی لاتے تو لوگوں کو اس وحی کی اطلاع سے قبل ہی اس کو لکھ لیا جاتا تھا، اور پھر لکھنے کے بعد اللہ کے نبی ﷺ اس کو سنتے تھے تاکہ اس دوران کوئی غلطی ہو تو اس کو درست فرمادیا جائے، اس کے بعد اس نئی وحی سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا تھا۔ ان واقعات اور روایات سے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا قرآن مجید کی تحریر میں اشتغال اور اس میں احتیاط کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرئیل کی ایماء پر اس کو جمع کیا اور اس کو ترتیب دیا۔

4.7.2 سامان کتابت

نزولِ قرآن مجید کے زمانہ میں ایجادات و مصنوعات کی کمی ضرور تھی، جس طرح آج کاغذ، قلم اور دوات کی بے شمار قسمیں دریافت ہیں، اس زمانہ میں اتنی ہرگز نہ تھیں؛ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس وقت کاغذ اور کتابیں دریافت نہ تھیں، یمن، روم اور فارس میں کتب خانے بھی تھے، یہود و نصاریٰ کے پاس کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا، اس زمانے میں "کاغذ" وغیرہ کی صنعتیں بھی تھیں؛ لیکن بڑے پیمانے پر نہ ہونے کی وجہ سے کاغذ وغیرہ ہر جگہ دریافت نہ تھے؛ اس لیے لکھنے کے لیے جو چیز بھی قابل اور پائیدار سمجھ میں آتی اس پر لکھ لیا جاتا تھا۔ (التبیان فی علوم القرآن ص49)

قرآن مجید کی کتابت کے لیے بھی اس وقت کی ایسی پائیدار چیزیں استعمال کی گئیں، جن میں حوادث وآفات کے مقابلے کی صلاحیت نسبتاً زیادہ تھی؛ تاکہ مدتِ دراز تک محفوظ رکھا جاسکے۔ (تدوین قرآن، ص31) حافظ ابن حجرؒ کی تحقیق کے مطابق کتابتِ قرآن میں درج ذیل چیزیں استعمال کی گئیں: (1) زیادہ تر پتھروں کی چوڑی اور پتلی سلوں (لخاف) کو استعمال کیا گیا، اِسے ہم سلیٹ کہہ سکتے ہیں۔ (2) اونٹوں کے مونڈھوں کی چوڑی گول ہڈیوں (کَتِف) پر بھی لکھا گیا، مونڈھوں کی ہڈیوں کو نہایت اچھی طرح گول تراش کر تیار کیا جاتا تھا۔ (3) چمڑوں کے کافی باریک پارچوں (رِقاع) پر بھی قرآن مجید لکھا جاتا تھا، یہ ٹکڑے نہایت باریک ہوتے تھے، اور لکھنے کے لیے ہی تیار کیے جاتے تھے، گوشت خور ملک میں اس کی بڑی افراط تھی۔ (4) بانس کے ٹکڑوں پر بھی آیات لکھی جاتی تھیں۔ (5) درخت کے چوڑے اور صاف پتے بھی کتابت کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ (6) کھجور کی شاخوں کی چوڑی جڑوں (عسیب) اور کھجور کے جڑے ہوئے پتوں کو کھول کر ان کی اندرون جانب بھی آیات کی کتابت ہوتی تھی۔ (7) محدثین نے کاغذ پر بھی کتابتِ قرآن کا ذکر کیا ہے۔ (فتح الباری)

4.8 حفظ قرآن

عرب معاشرے میں علم کتابت کی موجودگی اور عہد نبوی ﷺ میں قرآن کریم کی تدوین پر مفصل بحث کے بعد یہ امر بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ ہم اہلِ عرب کی غیر معمولی قوتِ حافظہ کا بھی تجزیہ کریں، تاکہ قرآن کے تحفظ و تدوین کے پورے عمل کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آسکے۔

قوتِ حافظہ ایک فطری و ربانی عطیہ ہے، اور اہلِ عرب اس نعمت میں اپنی مثال آپ تھے۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ اہلِ عرب، خصوصاً بدوی قبائل، زمانہ جاہلیت اور صدر اسلام میں حفظ و یادداشت کے غیر معمولی وصف سے متصف تھے۔ وہ تحریری ذرائع سے زیادہ اپنے حافظے پر انحصار کرتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے عربوں کے اس رجحان کو ان کے عمومی مزاج کا حصہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب بدوؤں میں یہ کہاوت مشہور تھی" :دل میں محفوظ ایک بات، کتب میں درج دس باتوں سے بہتر ہے"۔

عرب معاشرے میں حافظے پر اعتماد ایک فطری اور ثقافتی امر تھا، اور یہی سبب ہے کہ قرآن مجید کے تحفظ میں حفظ کا عنصر ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ کتابت وحی کا نظام سب سے پہلے قائم کیا گیا، لیکن اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے حفظِ قرآن کے باقاعدہ انتظامات بھی کیے، جس کے تحت متعدد صحابہؓ نے مکمل قرآن زبانی حفظ کیا۔ قرآن مجید کا تحفظ اور تدوین اسی دوہری بنیاد پر استوار ہوا— تحریر اور حافظہ —اور یہی ترکیب اس کے محفوظ اور معیاری متن کی ضمانت بنی۔

چنانچہ درج بالا سطور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عرب حافظہ پر زیادہ اعتماد کیا کرتے تھے۔ قرآن کے جمع اور تدوین میں کتابت کے ساتھ ساتھ حفظ قرآن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اللہ کے رسول نے پہلے قرآن کی آیتوں کی کتابت کا نظم کیا اور پھر حفظ قرآن کا اہتمام فرمایا۔ چونکہ آغاز وحی سے ہی آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے یہ تسلی دی گئی کہ **سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى** (ترجمہ: ہم آپ کو پڑھوا دیں گے کہ آپ نہیں بھولیں گے)اسے آپ ﷺ کے قلب اطہر پر اتار کر محفوظ کر دیا گیا۔ **اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ**(القیامۃ:17)"یقیناً اسے جمع کرنا اور اسے پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے)" ہر سال جبریل امین کے ساتھ آپ ﷺ نازل شدہ حصے کا باقاعدہ دور بھی کرتے۔ حدیث میں ہے:

أَنَّ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ ـ كَانَ يُعَارِضُ النَّبِيَّ ﷺ بِالْقُرآنِ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً، فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الَّذِىْ قُبِضَ فِيْهِ عَارَضَهٗ مَرَّتَيْنِ) صحیح بخاری: 4998 (جبریل امین ہر سال آپ ﷺ کے ساتھ قرآن مجید کا ایک مرتبہ دور کیا کرتے۔ جس سال آپ ﷺ کا انتقال ہوا، جبریل امین نے آپ ﷺ کے ساتھ دو مرتبہ دور کیا۔ آپ ﷺ نے اس دو مرتبہ دور کے بارے میں فرمایا:

انَّ جِبْرِيْلَ كَانَ يُعَارِضُنِى الْقُرْآنَ فِي كُلِّ سَنَةٍ مَّرَّةً، وَإِنَّهٗ عَارَضَنِى الْعَامَ مَرَّتَيْنِ، وَلَا أُرَاهُ إِلَّا حَضَرَ أَجَلِىْ۔

جبریل میرے ساتھ ہر سال قرآن کریم کا ایک مرتبہ دور فرمایا کرتے اس سال انہوں نے مجھ سے دو مرتبہ دور کیا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ میری موت آنے والی ہے۔(مسند احمد 6/ 282، صحیح بخاری:34)

4.8.1 مکہ میں حفظ قرآن

عہد نبوی کے معاشرے کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام قرآن کی آیتوں کے حفظ میں کس قدر مشتاق رہتے اور کس قدر حریص واقع ہوئے تھے۔ وہ قرآنی آیتوں کے نزول کے بعد بلا تاخیر اس کے حفظ کرنے کی فکر میں لگ جاتے۔ عرب ہمیشہ سے قوت حافظہ کے دلدادہ رہے ہیں مکی عہد میں بھی ان ہی عرب صحابہ نے حیرت انگیز قوت حافظہ کا مظاہرہ پیش کیا اور تیرہ برس کے عرصے میں مکہ میں نازل ہونے والے قرآنی حصے کو سرعت سے اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ اس میں کوشش کی بڑی وجہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات و فرمودات تھے جس میں حفظ قرآن پر بڑے بڑے انعامات، اور اجر عظیم کا مستحق ٹھہرایا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

حدثنا علي بن حجر، اخبرنا حفص بن سليمان، عن كثير بن زاذان، عن عاصم بن ضمرة، عن علي بن ابي طالب، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " من قرا القرآن واستظهره فاحل حلاله وحرم حرامه ادخله الله به الجنة، وشفعه في عشرة من اهل بيته كلهم قد وجبت له النار

ترجمہ: علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :جس نے قرآن پڑھا اور اسے پوری طرح حفظ کر لیا، جس چیز کو قرآن نے حلال ٹھہرایا اسے حلال جانا اور جس چیز کو قرآن نے حرام ٹھہرایا اسے حرام سمجھا تو اللہ اسے اس قرآن کے ذریعہ جنت میں داخل فرمائے گا۔ اور اس کے خاندان کے دس ایسے لوگوں کے بارے میں اس (قرآن) کی سفارش قبول کرے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی۔

صحابہ کرام وصحابیات کی بڑی تعداد نے نہ صرف اسے یاد کیا بلکہ لکھا بھی اور غور و تدبر کرنا بھی سیکھا۔ وہ اپنی پیاری نیند اور نرم و گرم بستر کو چھوڑ کر قیام اللیل کرتے اور تہجد میں اسے پڑھا کرتے۔ ان کے گھروں سے راہگیروں کو قرآن پڑھنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی بنا پر ابن الدغنہ کی امان واپس کر دی کہ میں اس قرآن کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

4.8.2 مدینہ میں حفظ قرآن

ہجرت کرکے آپ ﷺ مدینہ منتقل ہو گئے۔ قرآن یہاں بھی دس سال نازل ہوتا رہا۔ یہاں بھی آپ ﷺ قرآن مجید کو مجالس میں، نمازمیں، خطبات میں پڑھتے، سنتے اور سناتے تھے۔ آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ مسلمان اسے شوق سے گھروں میں اور نماز تہجد میں بالخصوص پڑھتے۔ نوجوانوں کو آپ ﷺ ابھارتے کہ قرآن یاد کرو اسے سیکھو۔ بہترین قرأت پر آپ ﷺ فخر کرتے۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ کی تلاوت سن کر آپ ﷺ نے فرمایا:

لَوْ رَأَيْتَنِيْ وَأَنَا أَسْتَمِعُ لِقِرَائَتِکَ الْبَارِحَةَ! لَقَدْ أُوْتِيْتَ مِزْمَاراً مِنْ مَزَامِيْرِ آلِ دَاوُدَ

اگر تم دیکھتے، کہ آج رات میں نے تمہاری تلاوت سنی، تم توآل داؤد کی نغمگی عطا کئے گئے ہو۔ (صحیح مسلم ،546، 1)

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

میں اشعری ساتھیوں کو ان کی آوازوں سے پہچان لیتا ہو جب وہ رات میں داخل ہو کر قرآن پڑھتے ہیں اور میں رات ہی میں ان کی قرآنی آوازوں سے ان کے گھروں کو پہچانتا ہوں اگرچہ میں نے ان کے گھروں کو نہیں دیکھا جب وہ دن کے وقت نکلتے ہیں۔(صحیح مسلم 4، 1944)سالم مولیٰ آل حذیفہؓ کی تلاوت سنی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اَلْحَمْدُلِلهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ أُمَّتِیْ مِثْلَکَ۔ اللہ کی حمد وثنا جس نے میری امت میں تجھ جیسے لوگ پیدا کئے۔ (مسند احمد 6،165)

سیدنا ابن مسعودؓ سے آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! قرآن آپ پر اتارا گیا اور سناؤں میں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اچھا لگتا ہے کہ میں دوسروں سے قرآن سنوں۔ تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورہ نساء پڑھنا شروع کی جب وہ اس آیت پر پہنچے (فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاءِ شَهِيدًا) آپ ﷺ نے فرمایا: حسبك الآن۔ بس بس کافی ہے۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: جب میں نے رک کر آپ ﷺ کی طرف دیکھا تو فإذا عيناه تذرفان۔ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔(صحیح بخاری 6، 113) آپ ﷺ صحابہ کو قرآن کے معنی و عمل ہی نہیں بلکہ حفظ بھی کراتے۔ کوئی شخص ہجرت کر کے جب مدینہ آتا آپ ﷺ اسے انصار ومہاجرین کے سپرد کر دیتے کہ اسے قرآن سکھائیں۔ اس طرح مسجد نبویؐ میں قرآن سیکھنے اور سکھانے والوں کی آوازوں کا شور ہوتا اور نبی اکرم ﷺ کو تاکید کرنا پڑتی کہ اپنی آواز کو پست رکھا کرو تاکہ مغالطہ پیش نہ آئے۔(مناہل العرفان 1، 234)۔

نیز صحابہ کی بڑی تعداد جن میں خلفاء اربعہ، عبد اللہ بن مسعودؓ، حذیفہؓ، سالمؓ مولی ابی حذیفہ، ابیؓ بن کعب، معاذؓ بن جبل، زیدؓ بن ثابت، ابو الدرداءؓ، طلحہؓ، سعدؓ، ابو ہریرہؓ، عبد اللہ بن عمر وابن عباسؓ، عبادہ بن صامتؓ، عبد اللہ وعمرو بن العاصؓ، انس بن مالکؓ، امیر معاویہؓ، فضالہ بن عبید، مسلمۃ بن مخلد، ابو زید بن السکن اور عبد اللہ بن السائب جبکہ خواتین میں حضرت عائشہؓ، حفصہؓ، ام سلمہؓ، اور ام ورقہؓ، وغیرہ شامل ہیں، یہ اشخاص اطراف مدینہ کی بستیوں میں جا کر قرآن سکھاتی رہیں۔ اس طرح ان نوجوانوں کی قوت حافظہ بہت کام آئی اور سینکڑوں حفاظ تیار ہو گئے۔ ان کی تعداد کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ غزوہ بئر معونہ کے موقع پر جن ستر صحابہ کو شہید کیا گیا وہ قراء کہلاتے تھے اور حفاظ قرآن تھے۔(صحیح بخاری :3064، الاتقان 1، 73) سیدنا ابو بکر صدیقؓ کے دور خلافت میں جنگ یمامہ کے موقع پر کثیر تعداد میں قراء صحابہ شہید ہوئے تھے۔(عمدۃ القاری 20، 16)۔

خلافت راشدہ کے تیس سالہ عرصہ میں اسلام کی دعوت مشرق و مغرب تک پھیلی۔ ہر مجاہد کے گھر میں قرآن ہوتا اور تلوار لٹکی ہوتی۔ شب وروز کی مسافت اور غریب الدیاری نے انہیں قرآن سے بھی چمٹائے رکھا۔ گھروں، محلوں اور مساجد میں یہ حفظ بھی ہوتا رہا اور تلاوت بھی۔ آج بھی مسلمانوں کے سینوں میں یہ قرآن محفوظ ہے۔ اس امت کی یہ صفت ہے: أَنَاجِيْلُهُمْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ۔ ان کے سینوں میں ان کی اناجیل ہوں گی۔ اہل کتاب اپنی کتاب کو حفظ نہ کر سکے اس لئے وہ ضائع ہو گئی۔ بس انہوں نے ترجمہ لکھا ہے اور لکھے کو پڑھتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن کی اصل عبارت ہی لکھی گئی۔ اگر خدانخواستہ قرآن کی ساری کاپیاں بھی کسی حادثے میں تلف ہو جائیں تو ہزاروں

نہیں بلکہ لاکھوں مسلمان اپنے حفظ کے ذریعے اسے دوبارہ لکھوا سکتے ہیں۔ آپ ﷺ کے دور میں بھی قرآن ایک کتابی شکل میں محفوظ نہیں تھا بلکہ پھیلا ہوا تھا لیکن سب کو یہ معلوم تھا کہ جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو سب سے پہلے سورہ فاتحہ ہے پھر سورہ بقرہ و آل عمران اور آخر میں سورہ الناس ہے۔

4.8.3 مذاکرہ قرآن

جمع اور تدوین قرآن کے ضمن میں یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن کی تدوین میں مذاکرہ کا اہم حصہ رہا ہے۔ ابتدائے اسلام میں قرآنی آیات کا تذکرہ کرنے کے لئے اور اس پر غور و فکر کرنے کے لئے کسی طرح کی مجلس میں بیٹھنے کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا، جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے حلقے بنا کر صحابہ بیٹھ جایا کرتے تھے، یہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے ایک باقاعدہ حلقہ بنوایا جس سے سبھی حضرات ایک ساتھ حلقہ کی صورت میں بیٹھنے لگے۔ آپ ﷺ کی درسگاہ سے اٹھنے کے بعد صحابہ کرام آپس میں اسباق کا دورہ اور مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ اس کی تاکید کرتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔ یہ وہ طریقہ کار ہیں جس کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ کے عہد میں قرآن کی حفاظت کا نظم کیا گیا۔

4.8.4 عہد نبوی کی درسگاہیں

قرآن کی تعلیم و تعلم کے لئے عہد نبوی ہی میں متعدد درسگاہیں قائم تھیں جن کی تقسیم کچھ اس طرح ہیں:

- نبی کریم ﷺ کی ذات ایک متحرک درسگاہ تھی
- بیوت صحابہ کرامؓ
- مساجد

بعثت کے بعد جب نبی کریم ﷺ تبلیغ اسلام کی غرض سے مختلف قبائل اور جماعت میں تشریف لے جاتے تھے، جس میں قرآن کی تعلیم کا خاص نظم موجود تھا۔ اسی طرح سے جب کوئی قبیلہ یا قافلہ خود مدینہ تشریف لاتا تو آپ ﷺ اسے بھی قرآن کی تعلیم سے سرفراز فرماتے۔ اسی ضمن میں بیعت عقبیٰ اولا اور بیعت عقبیٰ ثانی کی مثالیں بھی دی جاتی ہیں جن میں اللہ کے رسولؐ نے مدینہ سے آئے ہوئے اس وفد کو قرآن کی تعلیم دی جس کو انہوں نے قبول کر لیا اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اسی واقعہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر حضرت رافع کو گزشتہ دس سالوں میں نازل شدہ قرآن کی وہ آیتیں جسے آپ کے حکم سے جمع کیا گیا تھا عنایت کیں۔ اسی طرح صحابہ کے گھر قرآن کی تعلیمات کے لئے مخصوص تھے جیسا کہ عہد مکی میں حضرت ابو بکرؓ کا گھر اور حضرت ارقمؓ کا گھر جسے دار ارقم کے نام سے جانتے ہیں، تعلیم و تعلم کے لئے درسگاہ کا کام دیتے تھے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عہد نبوی میں قرآن کی جمع و تدوین ایک اہم عمل تھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے دوران مختلف مراحل سے گزرا۔ اس دوران قرآن مجید کی کوئی مکمل کتابی شکل نہیں تھی، بلکہ قرآن کے مختلف حصے صحابہ کرام کی یادداشت

میں محفوظ تھے یا مختلف مواد پر لکھے گئے تھے۔ عہد نبوی میں قرآن کی جمع و تدوین کا عمل بنیادی طور پر زبانی حفظ اور تحریری شکل میں تھا۔ صحابہ کرام قرآن کو حفظ کرتے اور مختلف مواد جیسے چمڑے، پتھر، اور کھجور کی چھال پر لکھتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے تحت کاتبین وحی جیسے حضرت زید بن ثابت قرآن کے نزول کے وقت اسے لکھتے تھے۔

4.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- قرآن کا نزول 23 سال کے عرصے میں ہوا اور نبی اکرم ﷺ ہر وحی کے بعد صحابہ کو یاد کرواتے اور کاتبینِ وحی کو لکھواتے۔
- قرآن مختلف اشیاء پر لکھا جاتا تھا (ہڈیاں، کھجور کی ٹہنیاں، پتھر، چمڑا وغیرہ)۔
- صحابہ کرام قرآن کو یاد کرتے اور اپنی نمازوں میں پڑھتے، یوں قرآن سینوں میں بھی محفوظ رہا۔
- نبی ﷺ رمضان میں جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ پورے قرآن کا دورہ کرتے تاکہ ترتیب اور الفاظ درست رہیں۔ اور آخری سال آپ نے یہ دور دو دفعہ کیا۔
- کاتبینِ وحی (حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ وغیرہ) نے قرآن کو عہدِ نبوی میں لکھ کر محفوظ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔
- سورتوں اور آیات کی توقیفی ترتیب (اللہ کے حکم کے مطابق ترتیب) نبی ﷺ ہی بتاتے تھے اور کاتبین وحی سے فوری طور پر قلمبند کرواتے تھے۔
- قرآن مکمل طور پر یاد اور تحریر دونوں شکلوں میں محفوظ ہوا، البتہ ایک مصحف میں جمع نہیں ہوا تھا۔ یہ اہم کام خلافت راشدہ کے دور میں ہوا۔

4.10 نمونہ امتحانی سوالات

4.10.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. قرآن میں کل کتنی آیات ہیں؟

(a). 6666 (b). 6236 (c). 6066 (d). 6500

2. کس سورۃ میں قرآن کے شب قدر میں نازل ہونا ثابت ہے؟

(a). الفاتحہ (b). القیامہ (c). القدر (d). الواقعہ

3. صلصلۃ الجرس کیا ہے؟

(a).سورۃ　(b).آیت　(c).وحی　(d).اقسام وحی

4. تدوین قرآن سے کیا مراد ہے۔۔۔؟

5. سب سے پہلے قرآن کی کس سورۃ کی آیت نازل ہوئی؟

(a).مزمل　(b).مدثر　(c).علق　(d).قلم

4.10.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. قرآن کا جامع تعارف کرائیے۔
2. مکہ میں حفظ قرآن کے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
3. کاتبین وحی کا تعارف پیش کیجیے۔
4. عہد نبوی میں نزول وحی کی کیفیت اور اقسام وحی کو بیان کیجیے۔
5. قبل از اسلام اہل عرب کی علمی حالت کا جائزہ لیجیے۔

4.10.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. جمع وتدوین قرآن کی تاریخ پر مفصل مضمون لکھیے۔
2. عہد نبوی میں حفظ قرآن پر تحریر لکھیے۔
3. عہد نبوی میں کتابت قرآن پر مکمل مضمون لکھیے۔

4.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تدوین قرآن (قرآن کیسے جمع ہوا) : مولانا احمد اعظمی مصباحی
2. تدوین قرآن : مولانا سید مناظر احسن گیلانی
3. جمع وتدوین قرآن : ڈاکٹر حافظ محمد عبد القیوم
4. جمع وتدوین قرآن : سید صدیق حسن

معروضی سوالات کے جوابات

5.C	4.کتابی صورت میں ترتیب دینا	3.D	2.C	1. A

اکائی 5: تدوین قرآن عہد صدیقی و عثمانی میں

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 تعارف

5.2.1 عہد صدیقی میں تدوین قرآن کا پس منظر

5.2.2 فتنہ ارتداد اور جنگ یمامہ

5.3 عہد صدیقی میں جمع و تدوین قرآن

5.3.1 حضرت زید بن ثابتؓ کا انتخاب

5.3.2 قرآن کی تدوین کا عمل

5.3.3 جمع قرآن کا طریقہ کار

5.3.4 تدوین کے خصائص و مقاصد

5.3.5 جمع کردہ نسخہ کی خصوصیات

5.4 عہد عثمانی میں تدوین قرآن

5.4.1 عہد عثمانی میں تدوین قرآن کا پس منظر

5.4.2 عہد عثمانی میں تدوین قرآن کا طریقِ کار

5.4.3 قرآن کی ترتیب

5.5 اکتسابی نتائج

5.6 نمونہ امتحانی سوالات

5.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

5.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات
5.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات
5.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

قرآن مجید کی حفاظت اور اس کی صحیح تدوین کی ذمہ داری کو امت مسلمہ نے ہمیشہ ایک اہم فریضہ شمار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو انسانوں تک پہنچانے کے لئے نبی اکرم ﷺ کو منتخب کیا اور اس کلام کی حفاظت کا ذمہ خود اٹھایا، جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالی نے فرمایا: "بیشک ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں" (القرآن 15:9)۔ اس عظیم ذمہ داری کو نبھانے کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر دور میں اس کی حفاظت کی۔ خاص طور پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآن کی تدوین کا عمل ایک نمایاں حیثیت اختیار کر گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن مجید کا پہلی ابتدائی جمع و تدوین عمل میں آئی۔ جنگ یمامہ میں حفاظ قرآن کی شہادت کے بعد حضرت عمرؓ و حضرت ابو بکرؓ نے قرآن کے مکمل ذخیرہ کو یکجا کرنے کی ضرورت محسوس کی، تاکہ مستقبل میں قرآن کے کسی حصے کے فوت ہونے کا خدشہ باقی نہ رہے۔ اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں جب مسلمانوں کے درمیان قرآن مجید کے نسخوں میں اختلافات رونما ہوئے، تو انہوں نے امت کو ایک متحدہ نسخے پر جمع کرنے کے لئے مؤثر اقدامات کیے، تاکہ قرآن کے مختلف نسخوں کے فرق کو ختم کیا جا سکے اور مسلمانوں میں اتحاد قائم ہو۔ یہ دونوں ادوار قرآن کی تدوین کے حوالے سے بے حد اہم ہیں، کیونکہ ان کے ذریعے قرآن کی حفاظت کی وہ ٹھوس بنیاد رکھی گئی جس پر آج تک قرآن مجید کی درستگی قائم ہے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ

- جنگِ یمامہ میں حفاظِ قرآن کی شہادت کے بعد قرآن جمع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اس کی وضاحت کر سکیں گے۔
- حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے کس طرح قرآن کو جمع کرنے کا فیصلہ کیا اس کو بیان کریں گے۔
- تدوین قرآن میں حضرت زید بن ثابتؓ جو اس کام کے لیے منتخب ہوئے ان کے کردار کو پہچانیں گے۔
- مختلف علاقوں میں قرأت کے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ کے ایک معیاری مصحف کی تیاری واشاعت کے اقدام پر گفتگو کریں گے۔

- امت کے اتحاد اور قرآن کے ایک ہی لہجے پر قائم رہنے کی اہمیت کو جانیں گے۔
- طلبہ یہ فرق سمجھ سکیں گے کہ عہد صدیقی میں قرآن کو پہلی بار جمع کیا گیا، اور عہد عثمانی میں اس کو یکساں اور معیاری شکل میں رائج کیا گیا۔

5.2 تعارف

پچھلی اکائی میں ہم نے پڑھا کہ نبی کریم ﷺ کے عہد میں پورا کا پورا قرآن الگ الگ ٹکڑوں اور چرمی پارچوں، سنگی تختیوں، ہڈیوں، چھالوں وغیرہ میں لکھا جا چکا تھا۔ مگر نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی حیثیت تورات جیسی نہیں تھی یک بارگی ہی الواح کی شکل میں نبی کریم ﷺ کو دیا گیا ہو۔ قرآن کے نزول کی کیفیت مختلف رہی یہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوا، جس کی وجہ سے اس کا اختتام نبی کریم ﷺ کی رحلت کے ساتھ ہوا۔ اس کی نزول کی کیفیت سے یا تو اللہ کے نبی ﷺ واقف تھے یا صرف صحابہ کی وہ جماعت جنہیں قرآن زبانی یاد تھا یا وہ کاتبین وحی جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں آپ کے سامنے اسے لکھا تھا، یہی جماعت صحابہ اس کلام کی محافظ تھی اور اس کی ترتیب کی کیفیت سے واقف تھی۔ رحلت رسول کے بعد اللہ نے مسلمانوں کو ایک ایسے واقعے سے دوچار کیا جس نے صحابہ میں جمع و تدوین قرآن کی بحث کو تقویت بخشی اور قرآن کی تدوین ناگزیر ہوگئی۔ یہ واقعہ معرکہ یمامہ تھا جس نے کبار صحابہ کو قرآن کی تدوین کی طرف متوجہ کر دیا اور اس کی ضرورت و اہمیت کو واضح کر دیا۔ چنانچہ اس سبق میں ہم عہد صدیقی و عثمانی میں جمع و تدوین قرآن کے تدریجی مراحل کو پڑھیں گے جس سے جمع و تدوین قرآن کے مراحل کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور اس اکائی سے تدوین قرآن کی صحیح کیفیت ہمارے سامنے آجائے گی۔

5.2.1 عہد صدیقی میں تدوین قرآن کا پس منظر

تاریخی کتب اس بات پر شاہد ہیں کہ عہد نبوی میں جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں میں ارتداد کا فتنہ نمودار ہو چکا تھا جس کی اطلاع نبی کریم ﷺ کو دی گئی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے صحابہ کی جماعت روانہ کی۔ لیکن آپ ﷺ دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد یہ فتنہ اور زیادہ بڑھ گیا اس ارتداد کے فتنہ نے نبوت کے دعویداروں کا ایک گروہ پیدا کر دیا، جس میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں نے بھی اس امر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حیرت اس بات کی ہے کہ جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا اور اسلام کی تعلیمات پیش کیں اور آپ پر ایمان لانے کا سلسلہ شروع ہوا اور کہیں تئیس سالوں کی مدت میں کچھ ایک لاکھ کے قریب لوگوں نے اسلام قبول کیا اور صحابہ کی فہرست میں شامل ہوگئے، بلکل اسی طرح چند مہینوں کے اندر اندر مدعیان نبوت کے پیروکاروں کی ایک بڑی جماعت تیار ہوگئی، جو ان جھوٹے نبیوں پر ایمان لائے اور انکی اتباع کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ جب خلافت پر متمکن ہوئے، تو آپ کے سامنے متعدد مسائل تھے جن میں سے مرتدین کی سرکوبی سب سے اہم مسئلہ تھا۔ یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ مرتدین کی مختلف قسمیں تھیں، جن میں سے ایک مدعیان نبوت، دوسرے مانعین صلاۃ اور زکوٰۃ اور تیسرے صرف مانعین زکوٰۃ وغیرہ تھے۔

5.2.2 فتنہ ارتداد اور جنگ یمامہ

چنانچہ ارتداد کی اقسام میں سے سب سے اہم نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کا گروہ تھا جن کی جلد از جلد سر کوبی ضروری تھی، کیونکہ انہوں نے جزیرۃالعرب کے مختلف علاقوں میں اپنااثر و رسوخ قائم کر کے لوگوں کو غیر اسلامی تعلیمات سے آراستہ و پیراستہ کرنا شروع کر دیا تھا، اور تعجب یہ ہے کہ عوام کی ایک بڑی تعداد ان کے دام میں آگئی تھی۔ ہمیں اس کا اندازہ جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کی فوجی تعداد اور اس کی طاقت سے ہوگا۔ جنگ کے لئے حضرت ابو بکرؓ کو صحابہ کی کثیر تعداد کی ضرورت تھی، چونکہ آپ نے حضرت اسامہؓ کی ماتحتی میں لشکر اسامہ کو عیسائیوں کے خلاف برسرپیکار ہونے کے لئے روانہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے جنگجو سپاہیوں کی کمی محسوس ہو رہی تھی دوسری طرف حضرت ابو بکر نے اپنے دور خلافت میں یہ پالیسی بنائی تھی کہ صحابہ کا وہ طبقہ جو غزوہ بدر و احد میں شامل تھا انہیں ان کی عظمت و رفعت اور مسلمانوں کو ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے جنگوں میں شریک نہ کیا جائے تاکہ ان کا سایہ تادیر قائم رہے اور وہ مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے زیادہ سے زیادہ بہرہ ور کر سکیں۔ لیکن ایسے نازک حالات میں کہ اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے درمیان ارتداد کی وبا اس تندہی سے پھیل رہی تھی جن کے قبضہ میں صنعاء سے لیکر طائف کے جنگلات اور عدن و بحرین تک کے علاقہ تھے قبیلہ خزارہ وغطفان اور قبیلہ عبس وذبیان کے لوگ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لئے نکل پڑے۔ ان حالات میں ابو بکر صدیقؓ نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اسلامی ریاست کو ان خطرات سے محفوظ کرنے کے لئے مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اس فتنہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے حضرت ابو بکرؓ نے سپہ سالاران اسلام کی ماتحتی میں گیارہ لشکروں کو روانہ کیا، جن میں خالد بن ولید، عکرمہ بن ابی جہل، شرحبیل بن حسنہ، خالد بن سعید، عمرو بن عاص طریفی بن حاجز، علاء حضرمی، مہاجر بن امیہ، حذیفہ بن محصن اور عرفجہ بن ہرثمہ شامل تھے۔

اس جامع منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے صحابہ کی ایک کثیر تعداد کی ضرورت تھی تاکہ ارتداد کے اس دھارے کو موڑا جا سکے، جن میں سب سے زیادہ خطرناک نبوت کا دعویٰ کرنے والا گروہ تھا جس کی سربراہی مسیلمہ بن حبیب کر رہا تھا۔ حضرت ابو بکر نے اس کے تعاقب میں کبار صحابہ کا ایک خاص دستہ بھی روانہ کیا جس میں بدری و جنگ احد میں شامل صحابہ تھے۔ حالانکہ یہ خود انکی پالیسی کے خلاف تھا لیکن تعداد کی کمی اور اسلامی ریاست اور اسلامی تعلیمات کی حفاظت کی خاطر یہ ناگزیر تھا کہ ان صحابہ کو بھی اس جنگ میں شامل کیا جائے۔ فتنہ ارتداد کی تمام مہمات میں سے یہ مہم جس میں کبار صحابہ شامل تھے اور جو مسیلمہ بن حبیب جسے مسیلمہ کذاب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کے تعاقب میں یہ سب سے بڑی اور اہم مہم تھی۔ کیونکہ یمامہ جہاں یہ معرکہ پیش آیا، اور اس کے نواحی علاقوں میں مسیلمہ کی دعوت اور اس کے عزائم کو خوب فروغ مل رہا تھا، چنانچہ اس کی فوج کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز تھی، جسے آسانی سے زیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غزوہ تبوک کے بعد یہ پہلا موقع تھا جس میں اسلام کے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد نے حصہ لیا، اور اس جنگ میں جام شہادت پینے والے صحابہ کی تعداد گزشتہ تمام غزوات و سرایا کی نسبت سب سے زیادہ تھی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں معرکہ یمامہ ایک سانحہ واقع ہوا۔ متعدد تاریخی روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس جنگ میں شہید ہونے والے صحابہ کی تعداد سات سو اور کہیں کہیں بارہ سو تک ہے، جن میں سے پانچ سو حفاظ صحابہ شامل تھے۔

جنگ یمامہ میں حفاظ صحابہ کی بڑی تعداد میں شہادت کی حقیقت دراصل قرآن کی جمع و تدوین کی ضرورت کو اجاگر کرنے والی ایک اہم وجہ بنی۔ اس جنگ میں پانچ سو حفاظ صحابہ کا شہید ہونا اور اس کے نتیجے میں حافظ قرآن کی تعداد میں اچانک کمی آنا ایک سنگین مسئلہ بن گیا تھا۔ یہ حالات خلیفہ رسول حضرت ابو بکر صدیقؓ اور دیگر صحابہ کرام کے سامنے قرآن کی حفاظت اور جمع و تدوین کی اہمیت کو واضح کرنے کا سبب بنے۔ جنگ یمامہ جو کہ مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی تھی، میں مسلمانوں کو اللہ کی مدد سے فتح حاصل ہوئی، لیکن اس جنگ میں دوسرے محاذوں کی نسبت جانی نقصان زیادہ ہوا، خاص طور پر پانچ سو حفاظ صحابہ شہید ہوئے۔ بعض تاریخی کتابوں میں اس تعداد کو سات سو تک بھی ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب اس واقعے کو سنا تو انہیں قرآن کی اصل صورت کو محفوظ کرنے کے لئے ایک فوری تدبیر کی ضرورت کا احساس ہوا۔ انہوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اس کام کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت قرآن کی جمع و تدوین ضروری ہے، تاکہ قرآن کے متن میں کسی قسم کی کمی یا تبدیلی کا خدشہ نہ ہو۔

چونکہ قرآن کی نزول میں منسوخ شدہ سورتیں اور آیات بھی شامل تھیں، اس لئے یہ ضروری تھا کہ قرآن کی تدوین وہی ہو جو حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صحابہ کے علم میں ہو، جو قرآن کے منسوخ اور تبدیل شدہ حصوں سے بخوبی واقف تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ابتدا میں اس اہم کام کو کرنے میں کچھ تردد کا مظاہرہ کیا، لیکن حضرت عمرؓ کے بار بار اصرار کے بعد اور اس کام کی اہمیت کا شعور ہونے پر انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔ حضرت زید بن ثابتؓ کے انتخاب کا مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن کی جمع و تدوین کے عمل میں تمام ضروریات اور جزئیات کو درست طور پر سمجھنے والے شخص کی قیادت میں یہ کام کیا جائے۔ حضرت زیدؓ کا علم قرآن اور ان کی امانت داری کی وجہ سے اس اہم کام کی تکمیل کے لئے ان کی خدمات کی اہمیت پر کوئی سوال نہیں تھا۔ اس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ کی قیادت میں قرآن کی جمع و تدوین کا عمل شروع کیا گیا، جس کے نتیجے میں قرآن مجید کو ایک مرتب اور محفوظ صورت میں امت کے لئے پیش کیا گیا۔

5.3 عہد صدیقی میں جمع و تدوین قرآن

جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ جنگ یمامہ میں حفاظ صحابہ کی شہادت کے نتیجہ میں جمع قرآن کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی، قرآن اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ سے رقاع، لخاف اور ورق وغیرہ پر تحریری طور پر موجود تھا لیکن مجلد نہیں تھا، اس لئے حضرت عمرؓ کے ایما پر خلیفہ کی ذمہ داری میں اور حکومتی سطح پر اس کام کو انجام دینے کا انتظام کیا گیا تاکہ کسی کو انفرادی طور پر اس کا پاسبان نہ سمجھ لیا جائے، اور جمع قرآن نہایت اہم اور احتیاطی نقطہ نظر سے اہمیت کا حامل تھا اس لئے بھی حضرت عمرؓ اس کو حکومتی نگرانی میں کروانا چاہتے تھے۔ تاکہ قرآن کی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کروا دیا جائے۔ لہٰذا اس کام کو انجام دینے کے لئے حضرت ابو بکرؓ اور ساتھ ہی میں حضرت عمرؓ کی نگاہ حضرت زید بن ثابتؓ پر پڑی، چونکہ وہ قرآن کے منسوخ اور تبدیل شدہ حصہ سے بالکلہ واقف تھے۔

5.3.1 حضرت زید بن ثابتؓ کا انتخاب

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن کی جمع و تدوین کے لئے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا انتخاب اس لئے کیا کیونکہ حضرت زیدؓ نہ صرف قرآن کے حافظ تھے بلکہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبِ وحی بھی تھے۔ حضرت زیدؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم پر قرآن کی آیات کو تحریری شکل دی تھی، اور آپ کی شہادت تھی کہ آپ ﷺ کی وحی کو لکھنے میں آپ کا بہت اہم کردار تھا۔ آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین میں سے ایک ہونے کا شرف حاصل تھا اور آپ کا علمِ قرآن، حفظ اور وحی کی تحریر میں مہارت آپ کے انتخاب کی ایک بڑی وجہ بن کر سامنے آیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے کہا: "تم ایک جوان، سمجھدار آدمی ہو، تم پر کسی طرح کا کوئی الزام نہیں ہے، ہمیں تم پر اعتبار ہے اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین میں سے ہو۔" اس میں حضرت ابو بکرؓ کا اعتماد حضرت زیدؓ کی صفات اور علم پر تھا۔ حضرت زیدؓ کی سچائی، ایمانداری اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کا تعلق ان خصوصیات میں شامل تھے جن کی بنیاد پر حضرت ابو بکرؓ نے ان سے اس عظیم کام کی انجام دہی کی توقع کی۔

حضرت زید بن ثابتؓ کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ عبرانی زبان کے ماہر تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عبرانی زبان سکھانے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ یہود کی تحریر کو سمجھ سکیں اور اس کا ترجمہ کر سکیں۔ حضرت زیدؓ کا اپنا بیان ہے کہ: مَا مَرَّتْ بِیْ خَمْسَ عَشَرَةَ لَيْلَةً حَتّٰى حَذَقْتُه یعنی میں نے پندرہ دن میں عبرانی زبان میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ اس کے بعد حضرت زیدؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عبرانی زبان میں جوابات لکھا کرتے تھے، اور آپ نے اس زبان کے حوالے سے بہت زیادہ مہارت حاصل کی تھی۔ ایک اور اہم بات یہ تھی کہ حضرت زیدؓ قرآن کے حافظ بھی تھے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری رمضان میں دوبار قرآن کا دور کیا تھا، جس میں حضرت زیدؓ بھی شامل تھے۔ یہ تمام خصوصیات حضرت زیدؓ کے انتخاب کو ایک بہت منطقی اور مستحکم فیصلہ بناتی ہیں، اور یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے قرآن کی جمع و تدوین کے اس اہم کام کے لئے حضرت زیدؓ کو منتخب کیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں قرآن کی جمع و تدوین کا عمل ایک بہت اہم تاریخی واقعہ ہے جس کی تفصیلات مختلف محدثین نے اپنی کتابوں میں بیان کی ہیں، بشمول امام بخاری، ترمذی، نسائی، ابن حبان، طبرانی، ابن جریر، ابن المنذر، ابی داؤد اور ابن سعد وغیرہ۔ سیدنا زید بن ثابتؓ نے اس عمل کی تفصیلات یوں بیان کی ہیں: "جنگ یمامہ کے فوراً بعد 12 ہجری میں سیدنا ابو بکرؓ نے مجھے بلوا بھیجا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں سیدنا عمرؓ بھی موجود تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا: 'عمرؓ نے آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے سات سو قراء و حفاظ شہید ہو گئے ہیں اور اگر مختلف مقامات پر اسی طرح حفاظ قرآن شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ قرآن کو یکجا کر دینا چاہئے۔ حضرت زیدؓ نے جواب دیا: "جو کام نبی ﷺ نے نہیں کیا، ہم وہ کیسے کریں؟" لیکن حضرت عمرؓ بار بار مجھ سے یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی شرح صدر ہو گیا۔ اور اب میری بھی وہی رائے ہو گئی جو عمرؓ کی تھی۔ آخرکار، حضرت زیدؓ نے کہا کہ اللہ کی قسم، اگر یہ حضرات مجھے پہاڑ بھی دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیتے تو یہ میرے لیے زیادہ آسان ہوتا۔

اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: "زید! تم نوجوان ہو اور سمجھ دار بھی، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ تم نے رسول اللہ ﷺ پر اترنے والی وحی کو لکھا ہے،۔فتَتَبَّعِ الْقُرْآنَ فَاَجْمِعْهُتوت اب تم قرآن کو تلاش کر کے اسے جمع کر دو۔" حضرت زید بن ثابتؓ نے اپنی روایت میں کہا: "یہ کام میرے لئے بہت مشکل تھا لیکن بار بار حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی رائے سے میرے دل میں بھی یہ بات بٹھا دی گئی کہ یہ کام کرنا ضروری ہے۔" پھر حضرت زیدؓ نے قرآنی آیات کو مختلف جگہوں سے جمع کرنا شروع کیا، جیسے کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے۔ اس کام میں حضرت زیدؓ نے سخت محنت کی اور آخر کار قرآن کو مکمل طور پر جمع کر لیا۔ یہ صحیفے حضرت ابو بکرؓ کے پاس رہے اور ان کی وفات کے بعد یہ صحیفے ام المؤمنین سیدہ حفصہ بنت عمرؓ کے پاس منتقل ہو گئے۔ حضرت زیدؓ کی اس محنت اور اس عظیم کام کو صحابہ کرام اور امت نے سراہا اور اسے امت پر ایک بڑا احسان سمجھا۔ اس عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے قرآن کے تحفظ کے لئے ایک اہم قدم اٹھایا اور اس کے مکمل جمع و تدوین کی ضرورت کو سمجھا۔ حضرت زید بن ثابتؓ کی کوششوں نے اس عمل کو کامیاب بنایا اور قرآن کو امت کے لیے محفوظ کرنے کا یہ اقدام بہت اہمیت رکھتا ہے۔۔ بعد میں یہی صحیفے ام المؤمنین سیدہ حفصہ بنت عمرؓ کے پاس آ گئے۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب قولہ تعالی لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ خلیفہ رسول ابو بکرؓ کے اس عمل کو صحابہ رسول نے اور تمام امت نے سراہا اور امت پر ایک بڑا احسان سمجھا۔

5.3.2 قرآن کی تدوین کا عمل

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن کو جمع کرنے کا عمل شروع کیا۔ انہوں نے قرآن کے مختلف حصوں کو اکٹھا کیا، جو صحابہ کرام نے مختلف جگہوں پر لکھ رکھے تھے، جیسے کہ کھجور کی پتوں، چمڑے، ہڈیوں اور دیگر مواد پر۔ حضرت زید بن ثابت نے قرآن کے مختلف حافظوں سے بھی تفتیش کی اور ان سے مختلف آیات کی تصدیق کی۔ اس عمل میں نہ صرف وہ آیات شامل کی گئیں جو لکھ کر رکھی گئی تھیں، بلکہ وہ آیات بھی شامل کی گئیں جو صحابہ کے سینوں میں محفوظ تھیں۔ حضرت زید بن ثابت نے اس دوران خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا کہ قرآن کے تمام حصے صحیح ترتیب سے جمع ہوں اور کسی بھی آیت یا سورۃ میں کوئی کمی یا زیادتی نہ ہو۔ نیز جمع قرآن سے متعلق یہ اعلان بھی کروا دیا گیا کہ جس کے پاس بھی قرآن حفظ یا تحریر کی صورت میں ہو لے آئے، تا کہ بعد میں کسی کو یہ دعویٰ کرنے کا موقع نہ مل سکے کہ میرے پاس قرآن کی ایک آیت لکھی رہ گئی جس کو اس مدون نسخہ میں شامل نہیں کیا گیا۔

5.3.3 جمع قرآن کا طریقہ کار

قرآن کو جمع کرنے کے لئے سیدنا زیدؓ بن ثابت کی سربراہی میں ابو بکرؓ نے ایک کمیٹی قائم کی جس میں سیدنا عمر فاروق جیسے جلیل القدر صحابہؓ شامل تھے۔ خلیفہ رسول ابو بکرؓ نے سیدنا عمرؓ اور زیدؓ سے فرمایا: "اُقعُدَا عَلَى بَابِ الْمَسجِدِ، فَمَن جَاءَ كُمَا بِشَاہِدَينِ عَلى شَیْءٍ مِنْ كتابِ اللهِ فَاكْتُبَاهُ۔ دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ تو جو تمہارے پاس قرآن کی کسی آیت پر دو گواہ لائے تو اسے لکھ لو"۔

عبد الرحمنؒ بن حاطب کہتے ہیں: "قَدِمَ عُمَرُ فَقَالَ: مَنْ تَلَقَّى مِن رَّسُولِ اللهِ ﷺ شَيئًا مِنَ القُرآنِ فَلْيَأتِ بِهِ، وَكَانُوا

يَكْتُبُونَ ذَلِكَ فِي المُصْحَفِ وَالأَلوَاحِ وَالعُسُبِ، وَكَانَ لَا يَقبَلُ مِن أحدٍ شَيئًا حَتّٰى يَشْهَدَ شَاہِدَانِ"۔ سیدنا عمر تشریف لائے اور فرمایا: جس نے رسول اللہ ﷺ سے قرآن کا کوئی حصہ حاصل کیا ہو تو وہ اسے لے آئے۔ صحابہ قرآن مجید کو صحیفوں، تختیوں اور کھجور کی چھالوں پر لکھا کرتے تھے۔ آپ یہ تحریر دو گواہوں کے پیش کر دینے کے بعد قبول کرتے۔ جمع قرآن کے لئے سب سے پہلے تو یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی لکھی ہوئی کوئی آیت بھی ہو وہ سیدنا زیدؓ کے پاس لے آئے۔ جب کوئی لکھی ہوئی آیت لے آتا تو وہ چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے۔

1. اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے۔
2. کمیٹی کے ممبر سیدنا عمرؓ فاروق بھی حافظ قرآن تھے جو اپنے حافظہ سے اس کی توثیق کرتے تھے۔
3. کوئی لکھی ہوئی آیت اس وقت تک قبول نہ کی جاتی جب تک دو قابل اعتماد گواہ یہ گواہی نہ دے دیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے لکھی گئی تھی۔
4. بعد میں ان کی لکھی ہوئی آیات کا ان مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے۔

5.3.4 تدوین کے خصائص و مقاصد

حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کی تدوین اور آیات قرآنیہ کی تحقیق و تفتیش اور تلاش میں درج ذیل امور ملحوظ رکھے۔

1. عہد رسالت کا کتابت شدہ قرآن جو رقاع، لخاف اور ورق وغیرہ دیگر اشیاء پر منتشر حالت میں لکھا ہوا تھا، یکجا کر کے پیش نظر رکھا۔ یہی وہ اصل تھی جسے خود رسول اللہ ﷺ نے املاء کرایا تھا، اور بعد املاء پڑھوا کر سنا تھا اور جہاں کہیں اصلاح کی ضرورت تھی اصلاح بھی فرما دی تھی۔
2. قرآن کی تدوین کرتے وقت حضرت زیدؓ نے لوگوں کے پاس صحیفوں، تختیوں اور دوسری چیزوں میں جو مختلف نسخے اور اجزا تھے سبھی کو حتیٰ المقدور جمع کر کے پیش نظر رکھا۔
3. ہر آیت کی تصدیق کم از کم دو حفاظ صحابہ کی شہادت پر رکھی۔

ان امور کو ملحوظ خاطر رکھنے کے بعد حضرت زیدؓ نے نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے مکتوب شدہ قرآنی نسخہ کو مد نظر رکھتے ہوئے مکمل قرآن کا ایک نسخہ مجتمع شکل میں تیار کر دیا تاکہ وہ وقت ضرورت مرجع و معتمد بن سکے۔ جس کے لئے منتشر اجزاء کو یکجا کر کے ترتیب سے لکھ لینا کافی تھا، لیکن باوجود اس کے جناب شیخین اور خود حضرت زید بن ثابتؓ نے ہر آیت پر دو گواہوں کی شرط محض اطمینان کلی اور احتیاط اور تنقیح کامل کے لئے رکھی تاکہ کسی طرح کی غلطی اور شبہ کا کوئی گمان باقی نہ رہ جائے۔

5.3.5 جمع کردہ نسخہ کی خصوصیات

تدوین قرآن کی کمیٹی نے انتہائی احتیاط اور سخت محنت کے بعد قرآن کو ایک سال کی مدت میں جمع کر دیا، جسے تمام صحابہ کرام نے اتفاقاً قبول کیا اور یوں امت بھی اس پر جمع ہو گئی۔ اس نسخہ کی خصوصیات حسب ذیل تھیں:

- نسخہ میں قرآنی آیات کی ترتیب آپ ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق تھی لیکن سورتیں مرتب نہ تھیں بلکہ ہر سورت الگ اور علیحدہ صحیفہ میں تھی جن کی ترتیب عہد عثمانؓ میں ہوئی۔ اس نسخہ کا نام مصحف اُم رکھا گیا۔
- اس نسخہ میں ساتوں حروف جمع تھے۔
- یہ نسخہ خط حیری میں لکھا گیا تھا۔
- اس میں صرف وہ آیات لکھی گئیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ اس میں آیۃ الرجم نہیں لکھی گئی کیونکہ اس کی تلاوت منسوخ تھی مگر حکم باقی تھا۔
- یہ امت کے لئے ایک ایسا متفقہ مرتب نسخہ تھا جو اسے انتشار سے بچا گیا۔ اسی لئے سیدنا زیدؓ نے تمام گواہوں کی موجودگی میں اس کا اعلان کیا۔ جس کے صحیح ہونے کی سب نے بلا اعتراض گواہی دی۔

سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے تکمیل مصحف کے بعد اسے خلیفہ رسول ابو بکر صدیقؓ کے سپرد کر دیا جو ان کے پاس وفات تک رہا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آ گیا ان کی وفات کے بعد یہ مصحف ام المؤمنین سیدہ حفصہؓ کے پاس اس وقت تک رہا جب عثمانؓ نے ان سے طلب کر کے منتخب کمیٹی کے ذریعے نئے نسخے تیار کروائے اور اسے واپس لوٹا دیا جو ان کی وفات کے بعد سیدنا ابن عمرؓ کے ذریعے مروان بن الحکم کے پاس آیا تو مروان نے یہ سوچ کر کہ مبادا اس میں کوئی ایسی بات ہو جو نسخہ عثمانؓ سے مختلف ہو اسے ضائع کر دیا۔ سیدنا عمرؓ کے دور میں تدوین قرآن کی بجائے اشاعت قرآن پر زیادہ کام ہوا۔ آپؓ نے ہر جگہ تعلیم قرآن کو لازمی قرار دے دیا یہاں تک کہ فوجیوں اور دیہاتیوں کو بھی نہ چھوڑا۔ قرآن کی ترویج کے لئے آپؓ نے باجماعت تراویح کا اہتمام کیا اور ابی بن کعب و تمیم الداریؓ کو حکم دیا کہ لوگوں کو باجماعت تراویح پڑھائیں۔ (موطا امام مالک)۔ آپؓ نے ہر جگہ یہ احکام بھیجے کہ قرآن کی تعلیم کے ساتھ صحت الفاظ اور اعراب کی تعلیم پر بھی توجہ دی جائے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کریم ہر طرف پھیل گیا اور حفاظ کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف سعد بن ابی وقاصؓ کے لشکر میں 300 حفاظ موجود تھے۔

5.4 عہد عثمانی میں تدوین قرآن

جس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ کا سب سے بڑا کارنامہ جمع قرآن ہے، اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا کارنامہ پوری امت کو قرآن مجید کے اس متفق علیہ نسخہ پر جمع کرنا ہے جو "عہدِ صدیقی" میں تیار کیا گیا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ شروع میں آیات کے مضمون و معنی کی حفاظت کرتے ہوئے الفاظ میں ادنی تبدیلی کے ساتھ پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی، جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور اسلام کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا، تو جن لوگوں نے مذکوہ بالا رعایتوں کی بنیاد پر اپنے اپنے قبائلی اور انفرادی لہجوں یا مختلف متواتر تلفظ کے لحاظ سے قرآن مجید کے مختلف نسخے لکھے تھے، انکے درمیان شدید اختلاف رونما ہو گیا، حتیٰ کہ ایک دوسرے کی تکفیر کی جانے لگی، کافی غور و خوض کے بعد تمام صحابہ کرامؓ اس بات پر متفق ہو گئے کہ سبعۃ أحرف کی رعایت کرتے ہوئے کچھ مصاحف تیار کئے جائیں اور ہر علاقہ کی طرف ایک مصحف کا نسخہ روانہ کر دیا جائے تا کہ وہ اختلاف اور جھگڑے کے وقت اس کی طرف رجوع کر سکیں اور ان مصاحف

کے علاوہ باقی تمام صحیفے ختم کر دیے جائیں۔ یہی وہ قابل اعتماد صورت تھی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد پیدا کیا جاتا اور اختلاف کو جڑ سے اکھیڑا جا سکتا تھا۔

5.4.1 عہد عثمانی میں تدوین قرآن کا پس منظر

خلافتِ عثمانیہ کے دور میں اسلامی فتوحات کی وسعت بہت زیادہ ہو چکی تھی اور اسلام جزیرۂ عرب کی حدود سے نکل کر روم، فارس اور افریقی قبائل جیسے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ ان نو مسلم اقوام میں قرآن سیکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ عموماً اُن مقامی قراء کے توسط سے ہوتا جو ان علاقوں میں شہرت رکھتے تھے۔ مثلاً شام کے مسلمان حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت کے مطابق قرآن کی تلاوت کرتے، کوفہ کے لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت پر عمل کرتے، جبکہ بعض دیگر علاقوں کے لوگ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قرأت کے مطابق قرآن سیکھتے تھے۔ چونکہ ان جلیل القدر صحابہ کی قرأت میں بعض الفاظ کی ادائیگی، تلفظ اور اسلوب میں فطری طور پر اختلاف موجود تھا، اس لیے مختلف علاقوں کے مسلمانوں میں قرأت کا تنوع عام تھا۔ یہ اختلاف دراصل اس حکمتِ الٰہی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سات حروف (یعنی مختلف لہجات اور آدائیگیوں) پر نازل فرمایا تاکہ اہلِ عرب کو اپنی بولی اور لسانی عادات کے مطابق قرآن پڑھنے میں آسانی ہو۔ صحابۂ کرام اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے، اسی لیے وہ مختلف قرأت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اور اختلافِ قرأت کو فطری تنوع کے طور پر قبول کرتے تھے۔ لیکن ان کے برعکس نو مسلم اقوام، جو اس وقت اسلام میں داخل ہو رہی تھیں، ان قرأتی اختلافات کی حکمت سے ناواقف تھیں۔ ان کے لیے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ قرآن مختلف قرأت کے ساتھ بھی درست اور محفوظ رہتا ہے، چنانچہ جب وہ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کی تلاوت میں اختلاف دیکھتے تو بعض اوقات اسے غلطی سمجھ کر رد کر دیتے، حتیٰ کہ بعض مواقع پر سخت انکار اور جھگڑے تک کی نوبت آجاتی۔ اس فتنہ انگیز صورت حال نے اس امر کی فوری ضرورت کو جنم دیا کہ قرأتوں کے اس تنوع کو ایک معیاری مصحف اور قرأت کی صورت میں مرتب کیا جائے، تاکہ امت میں انتشار کے بجائے اتحاد قائم ہو۔

ان نازک حالات میں یہ شدید خطرہ پیدا ہو چکا تھا کہ امت مسلمہ کے بعض افراد قرآن مجید کی متواتر اور ثابت شدہ قرأتوں کو غلط یا غیر معتبر قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس وقت تک حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے زیر نگرانی تیار کیا گیا نسخہ ہی واحد ایسا مصحف تھا جسے تمام صحابہ کرام کے اجماع اور امت کی اجتماعی تصدیق حاصل تھی اور جو پوری امت کے لیے سند اور معیار بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس دیگر موجود نسخے انفرادی صحابہ کے ذاتی نسخے تھے، جو ان کی اپنی قرأت یا تعلیمی ضروریات کے مطابق ترتیب دیے گئے تھے، ان میں تمام متواتر قرأتوں کو یکجا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ایسی صورت حال میں فتنہ و انتشار سے بچنے اور امت کے درمیان وحدت برقرار رکھنے کا مؤثر اور قابلِ اعتماد حل یہی تھا کہ ایسے مصاحف تیار کیے جائیں جن میں ساتوں حروف کی گنجائش ہو، اور وہی مصاحف امت کے لیے معیار قرار پائیں۔ انہی مصاحف کی بنیاد پر درست اور نادرست قرأتوں میں امتیاز کیا جا سکے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہی اصولوں پر کاربند ہو کر ایک غیر معمولی اقدام کیا اور ایک متفق علیہ نسخے کی تدوین و اشاعت کو ممکن بنایا، جس سے

نہ صرف قرأت کا اختلاف حل ہوا بلکہ قرآن کی اصل عبارت اور تفسیری توضیحات کے مابین امتیاز بھی واضح ہوا۔

قبل ازیں، بعض نسخوں میں قرآن کے متن کے ساتھ تفسیری کلمات یا ذیلی تشریحات شامل ہو جاتی تھیں، جس کے باعث کچھ لوگوں نے غیر قرآن کو بھی قرآن سمجھنے کی خطا کی۔ اس وقت سخت ضرورت تھی کہ قرآن کا ایسا مستند نسخہ عام کیا جائے جو نص قرآنی کو مکمل اور قطعی صورت میں پیش کرے، تاکہ ہر مسلمان کو قرآن کے اصل متن کا یقینی اور غیر مشتبہ علم حاصل ہو، اور اگر کسی مقام پر کسی عبارت میں اختلاف سامنے آئے تو اس کا فیصلہ قرآن کے اس متفق علیہ متن کی روشنی میں کیا جا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہ متفقہ مصحف تیار ہو گیا، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ باقی تمام ذاتی نسخے، جن میں احتمالات، اختلافات یا غیر معتبر اضافے موجود تھے، تلف کر دیے جائیں، تاکہ قرآن کی حفاظت، وحدتِ امت اور دینی یکجہتی کا یہ عمل مکمل طور پر مؤثر ہو جائے، اور آئندہ کے لیے ہر قسم کے فکری و تحریری التباس کا دروازہ بند کر دیا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب اسلامی ریاست کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ قرآن سیکھنے کے لیے مدینہ منورہ آتے تھے، تو بعض عملی مسائل بھی جنم لینے لگے۔ ایک روایت کے مطابق مدینہ میں مختلف معلمین قرآن مختلف قرأت کے مطابق بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ جب یہ بچے آپس میں ملتے تو ان کی قرأت میں فرق ہوتا، جسے وہ اختلاف یا غلطی سمجھتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اختلافات صرف بچوں تک محدود نہ رہے بلکہ معلمین کے درمیان بھی پہنچ گئے، یہاں تک کہ بعض اوقات یہ نوبت تکفیر یعنی ایک دوسرے کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینے تک جا پہنچی۔

جب یہ نازک صورتِ حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علم میں آئی تو آپ نے نہایت بصیرت سے مسئلے کی سنگینی کو بھانپا اور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: "اگر تم میرے سامنے ہوتے ہوئے اس قدر اختلاف کر رہے ہو، تو ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جو مجھ سے دور شہروں میں رہتے ہیں!" آپ کی یہ تشویش درست ثابت ہوئی، جس کا عملی مظاہرہ شام اور عراق کے محاذِ جنگ پر دیکھنے میں آیا۔ صحیح بخاری کی ایک معتبر روایت کے مطابق، حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اس وقت آرمینیہ اور آذربائیجان کے محاذ پر اہل عراق کے ہمراہ برسرِ پیکار تھے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ اہلِ شام حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت پر قرآن پڑھتے ہیں، جبکہ اہلِ عراق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کے مطابق تلاوت کرتے ہیں۔ دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کی قرأت سے ناواقفیت تھی، اور یہ ناواقفیت اختلاف کا سبب بن رہی تھی، یہاں تک کہ بعض لوگ ایک دوسرے کی قرأت کو غلط یا باطل قرار دینے لگے۔

اس صورتِ حال سے شدید تشویش محسوس کرتے ہوئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ مدینہ واپس آئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: "اے امیر المؤمنین! پیشتر اس کے کہ یہ امت بھی یہود و نصاریٰ کی طرح کتابِ الٰہی میں اختلافات کا شکار ہو جائے، آپ فوراً اس کا سدِباب فرمائیں"۔ یہ مشورہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عظیم اقدام کی بنیاد بنا، جس کے تحت ایک متفق علیہ مصحفِ عثمانی تیار کیا گیا اور امت کو قرأتی انتشار سے محفوظ کیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہلے ہی اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھ چکے تھے، لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے واقعے نے انہیں مزید فکر و تدبر کی ضرورت کا احساس دلایا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی تشویش اور اس کے نتیجے

میں پیدا ہونے والے اختلافات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک ایسے اقدام کی ضرورت پر مائل کیا جس سے امت کو قرآن کی مختلف قرآت کے بارے میں درپیش مسائل سے بچایا جا سکے۔ اس نازک صورتِ حال کے پیش نظر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جمع کیا اور اس مسئلے پر ان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا: "مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میری قرآت تمہاری قرآت سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر تک پہنچ سکتی ہے"۔ صحابہ کرام نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بات سن کر ان سے پوچھا: "آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میری رائے ہے کہ ہم لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں تاکہ ان کے درمیان اختلافات نہ ہوں"۔ صحابہ کرام نے اس تجویز کو سراہا اور اس کی بھرپور تائید کی۔

اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے تیار کیے گئے وہ صحیفے جو ان کے پاس موجود ہیں، ہمارے پاس بھیج دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وعدہ کیا کہ ہم ان صحیفوں کی نقل کروا کر آپ کو واپس بھیج دیں گے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ نے فوراً وہ صحیفے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیج دیے۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس اہم کام کی تکمیل کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس میں ابتدائی طور پر چار ارکان تھے:

1. حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ
2. حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ
3. حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ
4. حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ

ان تمام ارکان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مامور کیا کہ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صحیفوں سے قرآن مجید کی نقل تیار کر کے ایک ایسا مصحف مرتب کریں جو سورتوں کے اعتبار سے مکمل اور ترتیب شدہ ہو۔ ابتدائی طور پر ان چار حضرات کو ہی اس کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا، لیکن بعد میں ضرورت کے تحت مزید آٹھ افراد کو اس کمیٹی میں شامل کیا گیا جن میں سے بعض کے نام درج ذیل ہیں:

1. حضرت مالک بن ابی عامر رضی اللہ عنہ
2. حضرت کثیر بن افلح رضی اللہ عنہ
3. حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ
4. حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ
5. حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

اس کمیٹی کی ذمہ داری تھی کہ وہ قرآن مجید کی نقل کر کے ایک مکمل اور متفقہ نسخہ تیار کرے جسے تمام مسلمانوں کے لیے مرجع قرار دیا جا سکے۔

5.4.2 عہد عثمانی میں تدوین قرآن کا طریق کار

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں قرآن کریم کو مختلف صحیفوں میں جمع کیا گیا تھا، مگر یہ صحیفے سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے منظم نہ تھے، بلکہ ہر سورت علیحدہ علیحدہ صحیفے میں موجود تھی۔ بعد ازاں، خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے قرآن کو مکمل طور پر سورتوں کی ترتیب کے مطابق منظم کروا کر ایک جامع مصحف میں مدوّن کروایا۔ اس سے قبل امت کے پاس صرف ایک نسخہ موجود تھا، جو متفقہ طور پر درست تسلیم کیا گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اس نئے مرتب شدہ مصحف کی متعدد نقلیں تیار کروا کر مختلف اسلامی مراکز میں ارسال کیں۔ ان مصاحف کی تعداد کے حوالے سے متعدد اقوال پائے جاتے ہیں، تاہم راجح قول کے مطابق چھ مصاحف تیار کیے گئے: مکی، مدنی (دو نسخے، ایک عوام کے لیے اور دوسرا ذاتی حفاظت کے لیے)، بصری، کوفی، اور شامی مصحف۔ ذاتی مصحف کو "مصحفِ امام" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، غالباً اس لیے کہ یہ پہلا نسخہ تھا جسے بنیاد بنا کر دیگر نسخے تیار کیے گئے۔ چنانچہ ہر علاقائی مصحف کو بھی "مصحفِ امام" کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ مقامی مسلمانوں کے لیے معیار قرار پایا۔

حضرت عثمانؓ کا مقصد محض قرآن کو جلدوں میں محفوظ کرنا نہ تھا، بلکہ ان کا اصل ہدف یہ تھا کہ پوری امت کو ان قرأت پر مجتمع کیا جائے جو رسول اللہ ﷺ سے متواتر اور معروف طور پر منقول تھیں، اور اُن قرأت کو خارج کیا جائے جو ثابت نہیں تھیں یا جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی۔ نیز، ایسا مصحف امت کے سامنے پیش کیا جائے جو ہر قسم کی کمی بیشی، تقدیم و تاخیر اور غیر ثابت شدہ قرأت سے پاک ہو۔ اس مصحف کی کتابت اس فنی انداز سے کی گئی کہ اس کا رسم الخط متواتر قرأت کی گنجائش رکھتا ہو، تاکہ آئندہ زمانوں میں کسی قسم کے اختلاف یا شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن مجید کو اس انداز سے تحریر کیا گیا کہ اس کا رسم الخط تمام متواتر قرأت کی گنجائش رکھتا ہو۔ قرآن میں کئی ایسے الفاظ موجود ہیں جنہیں اگر بغیر نقطوں اور حرکات کے لکھا جائے تو وہ مختلف قرأت کے مطابق پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثلاً آیت "إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا "میں ایک قرأت" فَتَبَيَّنُوا " ہے جبکہ دوسری" فَتَثَبَّتُوا" ، اسی طرح الفاظ " تَتْلُوا " اور" تَبْلُوا " رسم الخط کے نقطوں سے خالی ہونے کی صورت میں دونوں قرأت کو محیط کرتے ہیں۔ تاہم بعض مواقع پر ایسا ممکن نہ تھا کہ مختلف قرأت کو ایک ہی رسم الخط میں جمع کیا جا سکے، جیسا کہ آیت" وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ " میں" وَصَّى " اور " أَوْصَى " کی قرأت ایک ہی تحریری صورت میں نہیں سما سکتیں۔ ایسے مواقع پر ایک قرأت کو ایک مصحف میں جبکہ دوسری کو کسی دوسرے مصحف میں نقل کیا گیا، تاکہ مجموعی طور پر تمام متواتر قرأت محفوظ رہ سکیں۔

تحریری کام کی انجام دہی کے لیے قریش کے افراد کا انتخاب اس بنا پر کیا گیا کہ وہ لسانِ قریش میں مہارت رکھتے تھے، نیز چونکہ معیار قرآن وہی ہو سکتا تھا جو قریشی لہجے میں ہو، اس لیے غیر قریشی لہجات کی کثرت سے ممکنہ اختلافات سے بچنے کے لیے یہ اقدام ناگزیر

تھا۔ حضرت عثمانؓ نے مشاورت اور اجماع کے بعد تحریر کے عمل کی قیادت کے لیے حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو املا کے لیے اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو کتابت کے لیے مقرر کیا۔ چونکہ یہ کام نہایت دقت طلب تھا، اس لیے مزید معاونین کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہما کو بھی اس عمل میں شامل کیا گیا۔ روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، جو کہ مدنی اور خزرجی النسل تھے، بھی املا کے عمل میں شریک تھے۔ اگرچہ وہ قریشی نہ تھے، لیکن چونکہ وہ کاتبِ رسول ﷺ اور کاتبِ وحی تھے، اس لیے ان کی شمولیت ایک اہم اور وزنی فیصلہ تھا۔ علاوہ ازیں، مختلف مصاحف کی تیاری کے لیے کئی کاتبین کی موجودگی بھی ضروری تھی، تاکہ ہر مصحف کی کتابت نہایت دقت اور دیانت سے مکمل کی جا سکے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جن حالات کا سامنا تھا، وہ محض منصبی یا رسمی نوعیت کا مسئلہ نہ تھا، بلکہ فوری اور عملی اقدام کا متقاضی تھا۔ اگرچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس عظیم الشان ذمہ داری کے لیے منتخب کیا گیا، لیکن ان کی تقرری صرف منصب یا شہرت کی بنیاد پر نہ تھی، بلکہ ان کی علمی، دینی، اور عملی صلاحیتیں اس انتخاب کی اصل بنیاد تھیں۔ وہ نہ صرف جلیل القدر حافظِ قرآن، ماہر قاری اور لغت و اعراب القرآن کے فقیہ تھے، بلکہ وحیِ نبوی کے باقاعدہ کاتب بھی تھے، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے آخری دور میں جبریلؑ کے ساتھ قرآن کی آخری ترتیب کے موقع پر بھی شرکت کی۔ ان کی ذات میں زہد، تقویٰ، عقل و فہم، امانت و دیانت اور دینی بصیرت جیسے اوصاف ایک ساتھ جمع تھے، جو کئی دیگر جلیل القدر صحابہ میں بھی اس جامعیت سے نہیں پائے جاتے تھے۔ یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ان پر اعتماد کرتے ہوئے جمعِ قرآن کا کام ان کے سپرد کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحفِ عثمانیہ کی تیاری کے بعد ان پر تنقیدی و تحقیقی نظرِ ثانی کے لیے صرف ذاتی رائے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اہلِ شوریٰ، علمائے صحابہ اور اربابِ تقویٰ کی اجتماعی مشاورت سے کام لیا۔ ان مصاحف کو ان کے اتفاق اور منظوری کے بغیر سندِ استناد حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ روایات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام کے اجماع سے ہی یہ عمل مکمل ہوا، چنانچہ یہ لازم آتا ہے کہ ان تمام مصاحف پر اجتماعی نظرِ ثانی اور منظوری کی گئی۔

مزید برآں، قرآن کریم کی نقل و اشاعت کا اصل ذریعہ ہمیشہ تلاوت اور سماع رہا ہے، یعنی ہر نسل نے اسے معتبر اور ثقہ اساتذہ سے سماع کے ذریعے حاصل کیا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ براہِ راست عہدِ نبوی تک متصل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کو مختلف علاقوں میں بھیجنے کا فیصلہ فرمایا، تو انہوں نے محض مصاحف بھیجنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان کے ساتھ ماہر، عادل، اور ثقہ قراء کو بھی روانہ کیا تاکہ وہ ان نسخوں کی قرأت کی صحیح تعلیم و تدریس کے ذمہ دار ہوں۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں مدنی مصحف کی تدریس سونپی گئی، حضرت عبداللہ بن سائب مکی مصحف کے ساتھ مکہ روانہ کیے گئے، حضرت مغیرہ بن شہاب کو شام کے

لیے، ابوعبدالرحمٰن سلمی کو کوفہ کے لیے اور حضرت عامر بن عبدالقیس کو بصرہ کے لیے مقرر کیا گیا، تاکہ ہر علاقے میں مصحف کے ساتھ درست قرأت کی روایت بھی متواتر اور محفوظ طریقے سے جاری رہے۔

5.4.3 قرآن کی ترتیب

صحفِ قرآنی جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مرتب کیے گئے تھے، چونکہ الگ الگ اوراق تھے، لہٰذا ان میں سورتیں ترتیب سے نہیں تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب انہیں مصحف کی شکل دی تو موجودہ ترتیب لگائی گئی۔ سورتوں کی ترتیب کے متعلق قاضی باقلانیؒ کا قول حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے نقل کیا ہے کہ سورتوں کی ترتیب نہ تو تلاوت میں واجب ہے، نہ نماز میں اور نہ ہی درس و تعلیم میں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمعِ قرآن کی بنیاد اس ترتیب پر تھی جس ترتیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم نے دوسری مرتبہ وفات سے پہلے حضرت جبریل کو قرآن سنایا تھا اور حضرت جبریل نے آپ کو سنایا تھا۔ اس بات کی دلیل کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے، یہ ہے کہ "حوامیم" (وہ سورتیں جو حٰم) سے شروع ہوتی ہیں) ایک ترتیب سے اور مسلسل ہیں۔ اسی طرح "طواسین" (وہ سورتیں جو طٰس سے شروع ہوتی ہیں) مسلسل ہیں لیکن مسبحات (جو سورتیں سبّح اور یسبّح سے شروع ہوتی ہیں) ان میں تسلسل نہیں ہے۔ درمیان میں دوسری سورتیں ہیں۔ اسی طرح مکی اور مدنی سورتیں الگ الگ نہیں، بلکہ ملی جلی ہیں۔ یہ تمام امور اس بات کا ثبوت ہیں کہ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔

قرآن کا ہر لحاظ سے معیاری مستند اور متفقہ نسخہ تیار ہو جانے کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کرام اور تابعین عظام کے پاس موجود سارے نسخوں کو نذرِ آتش کرنے کا حکم نافذ فرما دیا تاکہ کتاب الٰہی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ رہ جائے، ایک طرف تو چھ مصاحف عثمانی تیار کرا کے تمام بلادِ اسلامی میں پھیلا دیے اور ان کو معیاری مصحف قرار دے کر صرف انہی کی نقل کرنا لازمی قرار دیا، دوسری طرف ایسے تمام نسخوں اور صحیفوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا جو اس اصل معیاری قرآن مجید کے نسخہ سے مختلف تھے، تاکہ امت اسلامی کتاب اللہ پر متحد و متفق رہی۔ یہ کارنامہ عظیم تھا جس نے وحدتِ کتابِ الٰہی کے ذریعہ وحدتِ امت اور اتحاد اسلامی کی راہ ہموار کی۔ یہی حکمت تھی کہ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا: " لو كنت الوالي وقت عثمان لفعلتُ في المصاحف مثل الذي فعل عثمان" "اگر حضرت عثمانؓ کی جگہ پر میں حکمران ہوتا تو میں بھی وہی کچھ کرتا جو حضرت عثمانؓ نے کیا ہے"۔

قرآن کریم کے انفرادی نسخوں کے جلانے کا یہ اقدام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مشورے کے مطابق کیا تھا۔ تمام مصاحف قرآنی کے نسخے فنا ہونے کے بعد صرف مصحفِ عثمانی کی صورت میں قرآنِ مجید کا مستند ترین متن مقدس محفوظ ہو گیا تھا اور اس پر صحابہ کرام کا اجتماع و اجماع اور اتفاق تھا۔ مصاحف عثمانی کی صورت میں اتحادِ امت اور وحدت قرآن کی حکمت سمجھ میں آ گئی تو ان کا شکوہ جاتا رہا اور وہ بھی متفق ہو گئے۔ یہی اعتماد ان مصاحف کو تمام عالم اسلام میں ملا، جن علاقوں میں یہ مصاحف بھیجے گئے تھے، وہاں کے باشندوں نے بھی ان مصاحف کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان مصاحف کو ان کے ہاں اعلیٰ مقام اور مقدس حیثیت حاصل ہو گئی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان

مصاحف کی تدوین کسی فردِ واحد کی کارروائی نہیں ہے، بلکہ ان کی پشت پر قرآن کے اولین حفاظ، کاتبین وحی تمام اصحابِ رسولؐ کا اِجماع موجود ہے، جنہیں دربارِ رسالتؐ سے مدح و توصیف کا وہ پروانہ عطا ہوا ہے جس کے وہ واقعی مستحق تھے۔

5.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں قرآن کو ایک مستند اور صحیح نسخہ کی صورت میں محفوظ کیا گیا، جس سے اس کی تحریف یا تبدیلی کو روکا گیا۔
- حضرت عثمانؓ کے دور میں قرآن کے ایک ہی نسخے کی موجودگی نے مسلمانوں میں اتحاد کو فروغ دیا اور قرأت کے مختلف اختلافات کو ختم کیا۔
- قرآن کی جمع و تدوین نے اسلامی ثقافت اور علمی ورثے کی بنیاد رکھی، جو نسلوں تک منتقل ہونے والا ایک عظیم تحفہ ثابت ہوا۔
- ان اقدامات کی بدولت قرآن کا متن آج تک ایک عالمی معیار کی شکل میں برقرار ہے، جو ہر مسلمان کے لیے ایک رہنمائی کا ذریعہ ہے۔
- یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عہدِ ابو بکرؓ اور عثمانؓ میں قرآن کی جمع و تدوین نے نہ صرف قرآن کی حفاظت کی بلکہ مسلمانوں کی فکری اور ثقافتی یکجہتی کو بھی مضبوط کیا۔

5.6 نمونہ امتحانی سوالات

5.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. کس جنگ میں حفاظ صحابہ کی کثیر تعداد نے جام شہادت حاصل کی؟

(a). قادسیہ (b). تبوک (c). یمامہ (d). اجنادین

2. حضرت ابو بکرؓ نے کس صحابی کو جمع و تدوین قرآن کی ذمہ داری سونپی تھی؟

(a). حضرت ابن مسعودؓ (b). حضرت ابی بن کعبؓ (c). حضرت عمرؓ (d). حضرت زید بن ثابتؓ

3. کس صحابی کے کہنے پر حضرت ابو بکرؓ نے قرآن کی تدوین کا کارنامہ انجام دیا؟

(a). حضرت علیؓ (b). حضرت عثمانؓ (c). حضرت عمرؓ (d). حضرت خالدؓ

4. قرآن کو کتنے حروف (یعنی پڑھنے کے طریقہ) پر جمع کیا گیا؟

(a). سات (b). نو (c). دس (d). چار

5. قرآن کی تدوین ثانی میں حضرت عثمانؓ نے کتنے افراد کو معمور کیا تھا؟

(a). تین (b). پانچ (c). چار (d). دو

5.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. عہد عثمانی میں تدوین قرآن کے طریقہ کار پر روشنی ڈالیے۔
2. جنگ یمامہ تدوین قرآن کا سبب بنی روشنی ڈالیے۔
3. عہد صدیقی میں تدوین قرآن کے طریقہ کار پر نوٹ تحریر کیجیے۔
4. حضرت ابو بکرؓ نے تدوین قرآن کے لئے کیا عمل اختیار کیا واضح کیجیے۔
5. عہد عثمانی میں ترتیب قرآن کو بیان کیجیے۔

5.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. عہد عثمانی میں تدوین قرآن کا پس منظر بیان کیجیے۔
2. عہد صدیقی میں تدوین قرآن کا پس منظر بیان کیجیے۔
3. تدوین قرآن کے ضمن میں حضرت زید بن ثابتؓ کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

5.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تدوین قرآن (قرآن کیسے جمع ہوا) : مولانا احمد اعظمی مصباحی
2. تدوین قرآن : مولانا سید مناظر احسن گیلانی
3. جمع و تدوین قرآن : ڈاکٹر حافظ محمد عبد القیوم
4. جمع و تدوین قرآن : سید صدیق حسن
5. تاریخ تدوین و جمع القرآن : ڈاکٹر اسماعیل احمد الطاحان ترجمہ محمد رضی الاسلام ندوی

معروضی سوالات کے جوابات

1. C	2.D	3.C	4.A	5.C

اکائی 6: تفسیر کا تعارف

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 ضرورت واہمیت

6.3 لغوی واصطلاحی معنی

6.4 تفسیر عہد نبوی میں

6.4.1 تفسیر بذریعہ قرآن کریم

6.4.2 تفسیر بذریعہ احادیث نبویہ

6.5 تفسیر عہد صحابہ میں

6.5.1 عہد صحابہ کی تفسیری کاوشیں

6.5.2 بعض اہم مفسر صحابہ کرام

6.6 تفسیر: عہد تابعین میں

6.6.1 بعض مفسر تابعین عظام

6.6.2 تفسیر آل بیت

6.7 علوم القرآن

6.8 علم قرأت

6.9 اکتسابی نتائج

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

6.10.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

6.10.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

6.10.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

6.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

قرآن کریم اللہ کی جانب سے نازل کی گئی آخری آسمانی کتاب ہے۔ اس کی تلاوت کو عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ کتاب تا قیامت تک کے لیے ایک محفوظ دستور حیات ہے۔ یہ کتاب تمام انسانوں کے لیے نازل کی گئی ہے۔ اور قرآن میں وارد ہے کہ اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ قرآن ایک پر مغز اور جامع کتاب ہے جس کے ہر لفظ اور جملہ میں ہمہ گیریت اور معنویت ہے۔ قرآن ہر انسان کو اپنے اندر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس کے فہم اور تدبر کے ذریعے اس عبادت کو درجہ احسان تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید جس رشد ہدایت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جب تک ان سے آگاہی حاصل نہ کی جائے تب تک اس کی پیروی کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے نزول وحی کے ساتھ ہی قرآن کریم کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کے لیے صحابہ کرام نبی ﷺ سے رجوع کرتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ قرآن کی تشریح، توضیح اور تفسیر فرماتے تھے۔ بلاشبہ علمِ تفسیر کو اسلامی علوم میں سب سے قدیم اور افضل و اشرف ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس اکائی میں تفسیر قرآن کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تفسیر کے لغوی و اصطلاحی معنی نیز تفسیر و تاویل کا فرق پر گفتگو کی جائے گی۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- تفسیر قرآن مجید کے لغوی اور اصطلاحی معنی سے واقف ہوں۔
- تفسیر کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا جائزہ لے سکیں۔
- نبی ﷺ، صحابہ اور تابعین کے دور میں تفسیری روایات پر گفتگو کر سکیں۔
- تفسیر قرآن کے ضمن میں علوم قرآن اور علم قرأت کے بارے جان سکیں گے۔

6.2 ضرورت و اہمیت

قرآن فہمی بہت بڑی نعمت ہے۔ تلاوت قرآن کے ساتھ معانی قرآن بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ علّامہ قرطبی سے منقول ہے کہ: جو لوگ قرآنِ مجید پڑھتے ہیں اور وہ اس کی تفسیر نہیں جانتے ان کی مثال اُن لوگوں کی طرح ہے جن کے پاس رات کے وقت ان کے بادشاہ کا خط آیا اور ان کے پاس چراغ نہیں جس کی روشنی میں وہ اس خط کو پڑھ سکیں تو ان کے دل ڈر گئے اور انہیں معلوم نہیں کہ اس خط میں کیا لکھا ہے؟ اور وہ شخص جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کی تفسیر جانتا ہے اس کی مثال اس قوم کی طرح ہے جن کے پاس قاصد چراغ لے کر آیا تو

انہوں نے چراغ کی روشنی سے خط میں لکھاہوا پڑھ لیااور انہیں معلوم ہو گیا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔

قرآن مجید خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی آخری کتاب ہے، اور اللہ تعالی نے اعلان کر دیا ہے کہ یہ کتاب قیامت تک محفوظ رہے گی، یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہے، زبان و ادب کے حسن کا ایک پہلو یہ ہے کہ بعض باتوں کو کھلے ہوئے الفاظ میں کہا جائے اور بعض باتیں استعارہ اور کنایہ کے پردہ میں ذکر کی جائیں، جیسے ہر لفظ کا مبہم ہونا ایک عیب ہے، اسی طرح ہر لفظ کا کنایہ و تشبیہ سے عاری ہونا بھی زبان کی خوبصورتی اور کشش کو مجروح کر دیتا ہے، نیز بعض دفعہ کلام میں ابہام سے اس کی معنویت دوبالا ہو جاتی ہے، یہ سب عربی زبان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر زبان کے ادب میں اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں بھی ایسی آیات ہیں، جن کا مفہوم بالکل واضح ہے اور جن کو خود قرآن میں "محکمات" سے تعبیر کیا گیا ہے، وہیں ایسی آیات بھی ہیں، جن میں تشبیہ و تمثیل سے کام لیا گیا ہے، یا جن میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہے اور یہ احتمال و ابہام بھی معنوی اعتبار سے فائدہ سے خالی نہیں ہے، مثال کے طور پر قرآن نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے لباس سے تعبیر کیا ہے، لباس میں کئی خصوصیات ہیں:

- لباس انسان کے لئے زینت اور وقار کا سبب ہے
- لباس کے ذریعہ خارجی اثرات سے انسان کی حفاظت ہوتی ہے
- لباس جسم کے عیوب کو ڈھانک دیتا ہے
- لباس انسان کے جسم کا سب سے قریبی راز دار ہوتا ہے
- لباس انسان کے وجود سے سب سے قریب تر شئے ہوتی ہے

اب غور کیجیے! کہ اس ایک تشبیہ میں ازدواجی رشتہ کے کتنے تقاضوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے اور پھر تعبیر کی خوبصورتی اور اہل ذوق کے لیے اس کا لطف الگ رہا۔

اسی طرح اللہ تعالی نے وضو کے افعال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: "وَامۡسَحُوا بِرُءُوسِكُمۡ" (مائدہ: 6) آیت کے اس ٹکڑے میں سر پر مسح کرنے کا حکم ہے، اس میں "رؤس" پر "ب" داخل ہے، "ب" کے معنی عربی میں "بعض" کے آتے ہیں اور بعض صورتوں میں یہ زائد بھی ہوتی ہے، جس کا مقصد دو کلمات کو باہم مربوط کرنا ہوتا ہے، اس کا کوئی مستقل اور علاحدہ معنی نہیں ہوتا، اگر "ب" پہلے معنی میں ہو تو مقصد ہو گا کہ سر کے کچھ حصہ کا مسح کر لو اور دوسری صورت میں پورے سر کا مسح مراد ہو گا، اب اس لفظ کی مناسب تشریح کے لیے لغت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے روشنی حاصل کرنی پڑتی ہے۔

پس قرآن مجید کی کچھ آیات تو بالکل واضح ہیں کہ عربی زبان سے واقفیت ان کو سمجھنے کے لیے کافی ہے؛ لیکن قرآن کی بہت سی تعبیرات میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال بھی ہے، ایسے کلمات اور فقروں کی تشریح و توضیح کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی کے لیے علم تفسیر کی ضرورت پیش آئی۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن اللہ کی زمین پر اللہ کا دستر خوان ہے، اس سے جس قدر ہو سکے علم حاصل کر لو۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم تفسیر گویا اللہ تعالی کے دستر خوان سے فائدہ اُٹھانا ہے، ایک اور حدیث میں ہے کہ اہل قرآن اہل اللہ اور اللہ کے خاص بندے ہیں، علما کے نزدیک یہاں "اہل اللہ" سے مراد مفسرین قرآن ہیں، اس سے علم تفسیر کی اہمیت و فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

6.3 لغوی واصطلاحی معنی

تفسیر کا مادہ ''ف، س، ر'' ہے، جس کے معنی واضح کرنے اور کھولنے کے ہیں، علم تفسیر سے معانی قرآن کی وضاحت ہوتی ہے، اسی لیے اسے ''تفسیر'' کہتے ہیں۔

تفسیر کی فنی تعریف کے سلسلہ میں اہل علم نے مختلف باتیں لکھی ہیں، لیکن ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے، اس سلسلہ میں علامہ بدر الدین زرکشی کی تعریف بہت واضح ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں: ''**علم يفهم به كتاب الله المنزل على نبيه محمد صلى الله عليه وسلم وبيان معانيه واستخراج أحكامه وحكمه**''۔ یعنی تفسیر وہ علم ہے جس سے نبی محمد ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کو سمجھا جائے، اس کی مرادات کو واضح کیا جائے اور اس سے احکام اور حکمتوں کا استخراج کیا جائے۔

اس تعریف میں قرآن سے متعلق سارے علوم شامل ہیں، علم قرأت، اسباب نزول کا علم، مفردات القرآن کا علم، قرآن کی ترکیبی حیثیت کا علم، جو نحو و صرف اور معانی و بیان کے جاننے پر موقوف ہے اور قرآن سے احکام کا اخذ واستنباط اور اس کے قصص و واقعات اور آیاتِ منسوخہ سے آگہی؛ کیوں کہ ان سب کو جانے بغیر معانی قرآن کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

تفسیر سے قریب ایک اور لفظ ''تاویل'' ہے، ''اول'' کے معنی رجوع کرنے کے ہیں، جب کسی کلام کی وضاحت کرنی ہوتی ہے تو الفاظ کے راستہ سے معانی کی طرف رُجوع کیا جاتا ہے، اسی مناسبت سے تشریح قرآنی کے لیے تاویل کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

اب اس میں اختلاف ہے کہ اصطلاحی اعتبار سے تفسیر اور تاویل ایک ہی ہے یا دونوں میں کچھ فرق ہے ؟--- ابتدائی دور میں تو تفسیر اور تاویل کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا تھا؛ لیکن بعد کے ادوار میں ان دونوں اصطلاحات کے درمیان تھوڑا سا فرق کیا جانے لگا،--- تفسیر و تاویل کے درمیان کیا فرق ہے ؟ اس سلسلہ میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ اگر تشریح روایت کی بنیاد پر ہو تو تفسیر ہے اور اگر درایت یعنی فہم کی بنیاد پر ہو تو تاویل ہے، ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ عبارت سے جو مفہوم صراحتاً سمجھا جائے وہ تفسیر ہے اور جو بات اشارہ سے ثابت ہوتی ہو وہ تاویل ہے، اس طرح کے اور بھی اقوال ہیں، مگر اس سلسلہ میں زیادہ تر اہل علم کا رجحان امام ابو المنصور ماتُرِیدی کے قول کی طرف ہے کہ آیات کے متبادر معنی کو بیان کرنا اور واضح مفہوم کو نقل کرنا 'تفسیر' ہے اور آیت سے دلیل کی بنیاد پر ایسا معنی مراد لینا، جس کی طرف بلا تأمل ذہن کا تبادر نہ ہوتا ہو یا جس میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہو، ان میں سے ایک معنی کو متعین کرنا 'تاویل' ہے،----ویسے یہ محض تعبیری اختلاف ہے، قرآن کی تشریح وتوضیح پر اس اختلاف کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

6.4 تفسیر عہد نبوی میں

6.4.1 تفسیر بذریعہ قرآن کریم

قرآن کریم کی تفسیر کا آغاز اس کی پہلی وحی کے نزول کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے، گویا یہی اس کی تاریخ کا نکتہ آغاز بھی تھا۔ یہ

پہلا دور عہد نبوی ﷺ کا ہے۔ اس دور میں قرآن کریم کی تفسیر کے دو بنیادی مآخذ تھے، پہلا خود کلام الٰہی 'قرآن کریم' اور دوسرا نبی ﷺ کی حدیث و سنت۔ قرآن کی تفسیر کے لئے اصول تفسیر کے ماہرین نے جو اصول پیش کئے ہیں، اس کے پیش نظر قرآن کی تفسیر سب سے پہلے خود آیات قرآنیہ کے ذریعہ کی جائے گی۔ قرآن میں ایک ہی مضمون کی مختلف آیتیں، مختلف اوقات، حالات اور مواقع کی مناسبت سے الگ الگ جگہوں پر مذکور ہیں۔ ایک ہی واقعہ کسی جگہ اختصار کے ساتھ مذکور ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے، یا کسی جگہ ایک حکم اجمال کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور دوسری جگہ اس کی توضیح اور تفصیل آ گئی ہے۔ یعنی قرآن کریم کی بعض آیتیں بعض دوسری آیتوں کی تشریح و توضیح اور تفسیر بیان کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پہلے دور میں جب قرآن کریم کے نزول کا سلسلہ جاری تھا، تو لازماً قرآنی آیات کی تفسیر کا یہ طریقہ اس دور میں رہا، تا آنکہ آنحضور ﷺ مالک حقیقی سے جاملے اور نزول وحی کا سلسلہ رک گیا۔ آیئے اس کی چند مثالوں پر نظر ڈالتے ہیں:

1. سورہ بقرہ کے بالکل آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ [قرآن کریم] ایسی کتاب ہے، جس میں کوئی شک نہیں، اس میں متقیوں کے لئے ہدایت ہے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اور نمازیں قائم کرتے ہیں اور اللہ نے انہیں جو عطا کیا ہے اس میں سے [اللہ کی راہ میں] خرچ کرتے ہیں "الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ" (بقرہ:3)۔ اس آیت کریمہ میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں سے کس قدر خرچ کر دینا مومنین کا شعار ہے؟ کیا انہیں اللہ کی راہ میں سب کچھ خرچ کر دینا چاہئے یا کچھ چیزیں اپنی ضرورتوں کے لئے رکھ لینے کی اجازت ہے۔ اس سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی ہی آیت 219 میں دیا ہے، فرماتے ہیں: "وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ"۔ یعنی مومنین پوچھتے ہیں کہ انہیں کیا خرچ کرنا چاہئے، [اے رسول!] آپ کہہ دیجئے، جو ضرورت سے زائد ہو۔ گویا یہ آیت پہلی آیت کی وضاحت اور تفسیر ہے کہ ضرورت سے زائد مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا مومنین کا شعار ہے۔
2. "وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ" (شوریٰ: 5)۔ اس آیت میں فرشتوں سے متعلق یہ بات بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور زمین والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ سورہ غافر کی آیت 7 میں ان زمین والوں کی وضاحت کر دی گئی ہے جن کے لئے فرشتے استغفار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا"۔ یعنی فرشتوں کا استغفار مومنین کے لئے خاص ہے، نہ کہ تمام اہل زمین کے لئے۔

6.4.2 تفسیر بذریعہ احادیث نبویہ

قرآن کریم کی تفسیر کے دوسرے اصول کی رو سے اگر کسی آیت کی تفسیر قرآن کریم میں نہ ملے تو اس کے لئے اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال وافعال کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ آپ ﷺ نے اس سے متعلق کیا رہنمائی فرمائی ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نازل فرمایا تو ساتھ ہی اس میں دیئے گئے احکام اور اِس دنیا میں زندگی گذارنے کے لئے فراہم کردہ رہنمایانہ ہدایات کی تشریح اور توضیح کے لئے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفی ﷺ کو مبعوث فرمایا، اور اسے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد قرار دیا۔ اور چونکہ آپ ﷺ کی تمام تر سرگرمیاں خود خالق کائنات کے زیر نگرانی اور اس کی مرضی کے مطابق انجام پائیں، لہٰذا آپ ﷺ کی ہر ایک

بات اور ہر ایک عمل قرآنی آیات کی تفسیر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى، عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى“ (نجم:5-3)۔ ([نبی ﷺ] اپنی نفسانی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے، یہ تو وحی ہے جو ان پر اتاری جاتی ہے، ان کو بڑے طاقتور فرشتے نے تعلیم دی ہے)۔ اور سورہ نساء میں فرمایا: ”إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ“ (آیت: 105)۔ (بے شک ہم نے آپ کی طرف برحق کتاب اتاری ہے؛ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق جو اللہ آپ کو سمجھائے، فیصلہ کریں)۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس سند کے باوجود کہ آپ ﷺ جو کچھ بولتے یا کرتے ہیں وہ سب اللہ کے منشاء کے مطابق ہوتے ہیں، بسا اوقات آپ ﷺ بعض آیتوں کی تفسیر بیان کرنے سے رک جاتے تھے اور پھر اس کی تشریح و توضیح میں اللہ عزوجل خود کوئی آیت نازل فرما دیتے تھے۔ اس دور میں ہمیں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ پھر قرآنی آیات اور اس کے احکام کی براہ راست تشریح و تفسیر میں آپ ﷺ سے جو احادیث روایت کی گئی ہیں ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔ محدثین نے انہیں اپنی کتابوں میں مستقل ابواب کے تحت جمع کئے ہیں۔ ان احادیث کے علاوہ آپ ﷺ کی زندگی کی حیثیت قرآن کریم کے عملی نمونہ اور تشریح و توضیح کی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کی اس حیثیت کو مختلف مقامات پر نمایاں کیا ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا“ (احزاب: 21)۔ (اللہ کے پیغمبر کی ذات میں تم میں سے ان لوگوں کے لئے بہترین نمونہ ہے جو اللہ کا اور آخرت کا یقین رکھتے ہوں اور اللہ کو خوب یاد کرتے ہوں)۔

اور رسول اللہ ﷺ نے اسی چیز کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ (ابن ماجہ: ح229)، (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)۔

قرآنی آیات اور ان میں مذکور احکام کی تشریح و توضیح اور تفسیر احادیث میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ ان کی تفسیر میں کبھی ایسا ہوا کہ آپ ﷺ عمومی طور پر لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے اور مختلف قرآنی آیات کے احکام کی وضاحت فرما دیتے، کبھی لوگوں کی مختلف سرگرمیوں کے پیش نظر اللہ کی ہدایات پر روشنی ڈالتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کچھ ارشاد فرماتے اور اس سے متعلق یہ صراحت فرما دیتے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یا اس کام کو اللہ تعالیٰ نے جائز یا ناجائز قرار دیا ہے، فلاں کام کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔ کبھی اصحاب رسول ﷺ میں سے کوئی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کوئی مسئلہ دریافت کرتے تو آپ ﷺ اسے محض زبانی بتانے پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ اسے عملی طور پر کرکے دکھاتے تھے، مثلاً ایک شخص کے نماز سے متعلق دریافت کرنے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس طرح نماز پڑھو جیسا کہ تم مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو (بخاری: ح631) ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ کے سامنے کوئی بات پیش آتی یا آپ ﷺ کو صحابہ کرام کے کسی عمل کا علم ہوتا تو اس کے صحیح یا غلط اور جائز یا ناجائز ہونے سے متعلق کوئی حکم بیان فرمانے کے بجائے خاموشی اختیار کرتے تھے۔ تو آپ ﷺ کی یہ خاموشی بھی اللہ کی جانب سے آپ ﷺ کے دل میں ڈالی ہوئی بات ہوتی تھی، لہٰذا یہ بھی اللہ کے حکم کی تشریح اور تفسیر ہے۔ یہ تمام صورتیں قرآن کریم کی تفسیر میں داخل ہیں، کیونکہ آنحضور ﷺ قرآن کریم کے شارح

اور ترجمان تھے۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ سے جو روایتیں منقول ہیں، ان کی چند مثالیں یہاں پیش کی جارہی ہیں:

1. ''الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ...'' (انعام:82)۔ (جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کی آمیزش سے محفوظ رکھا، ان ہی کے لئے اطمینان کا موقع ہے اور وہی ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔) قرآن کریم کی اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام کافی بے چین ہو گئے، انہوں نے یہ خیال کیا کہ ان میں کون ہو گا جنہوں نے ظلم نہ کیا ہو گا اور اس سے ان کا ایمان آلودہ نہ ہو گیا ہو گا۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی بے چینی دور فرماتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے، جیسا کہ حضرت لقمان نے اپنے صاحبزادہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ'' (لقمان:13)۔ (اور وہ وقت یاد کئے جانے کے لائق ہے جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، یقیناً شرک کرنا بڑا ہی ظلم (ناانصافی) کی بات ہے)۔

2. ''وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ'' (مائدہ:06)۔ اس آیت میں وضو میں سر کے مسح سے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ سر کا مسح کریں، لیکن مسح کرنے کا صحیح طریقہ یہاں نہیں بتایا گیا ہے۔ حدیث میں اس کے طریقہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سر کے کتنے حصہ پر مسح کر لینا کافی ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ دیگر تفصیلات بھی حدیث شریف میں ملتی ہیں۔

اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی قرآن کریم کی تفسیر اور تشریح ہے اور اس کی چند مثالیں بھی پیش کی گئیں۔ ان کے علاوہ بھی قرآن کریم میں بکثرت ایسی مثالیں موجود ہیں جن پر عمل کرنے کے لئے احادیث نبوی لازمی اور ضروری ہیں۔ صحابہ کرام جو عربی زبان سے بخوبی واقف تھے جب قرآن کریم میں نماز، زکاۃ، روزہ، حج، جہاد، اخلاق، بر و تقویٰ، نکاح و طلاق اور معروف و منکر وغیرہ سے متعلق آیات نازل ہوئیں تو انہوں نے ان احکام کی تعمیل آپ ﷺ کی احادیث و سنتوں کی روشنی میں ہی کی، انہی کے مطابق اپنی زندگی میں عمل پیرا ہوئے اور اسی کو آگے بڑھایا۔

اس دور میں شروع میں قرآن اور غیر قرآن میں التباس اور آمیزش کے اندیشہ کے پیش نظر آپ ﷺ نے کتابت حدیث سے منع فرما دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے کئی صحابہ کرام کو کتابت حدیث کی اجازت بھی دی تھی، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ ایک انصاری صحابی کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے، لیکن ان کو آپ ﷺ کی باتیں یاد نہیں رہتی تھیں، تو وہ حضرت ابو ہریرہ سے ان احادیث کو دوبارہ سنانے کی درخواست کرتے تھے اور حضرت ابو ہریرہ ان کو حدیثیں سنا دیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے حافظہ کی شکایت حضور اقدس ﷺ سے کی، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اپنے حافظہ کی مدد اپنے دائیں ہاتھ سے کرو، اور اپنے ہاتھ سے لکھنے کا اشارہ کیا (ترمذی: ح2666)۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ مشہور صحابی ہیں۔ ان کی احادیث پر مشتمل کتاب ''الصحیفة الصادقة'' کے نام سے ہے۔ یہ احادیث کا مجموعہ عہد نبوی ﷺ ہی میں تیار ہو گیا تھا۔ حضرت ابن عمرو کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ

میں آپ ﷺ سے احادیث بیان کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لئے اپنے حافظہ کی مدد کے لئے حدیثیں لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں؟ نبی ﷺ نے جواب دیا: یہ میری حدیثیں ہیں تم لکھ لیا کرو(سنن دارمی: ح502)۔

ان مخصوص افراد کو کتابت حدیث کی اجازت کے بعد، جب آیات قرآنیہ کے ساتھ ان کے التباس کا خدشہ نہ رہا تو، عام اجازت دے دی گئی تھی۔ یہ سب گویا قرآن کی تفسیر اور احکام الٰہی کی تشریح و توضیح کو تحریری شکل دینے کا آغاز تھا۔

6.5 تفسیر عہد صحابہ میں

عہد نبوی ﷺ کے بعد عہد صحابہ میں عموماً کسی آیت کی تفسیر وہی کی جاتی تھی جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا یا جس کا سبب نزول انہوں نے خود ملاحظہ کیا تھا۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد قرآن کریم کی تدوین، فتوحات کی وجہ سے جدید شرعی مسائل اور دیگر ملکی معاملات سے صحابہ کرام دوچار رہے۔ لہٰذا تفسیر قرآن کے لئے زیادہ کوششیں نہ ہو سکیں، لیکن اس کے باوجود اس دور کی بعض تفسیری روایات کے مجموعے ملتے ہیں جنہیں صحابہ کرام نے جمع کئے تھے۔ ان کے علاوہ صحابہ کرام کی آیات قرآنیہ کے سلسلہ میں انفرادی آراء بھی ہیں، مثلاً ایک صحابی نے اجتہاد کی بنیاد پر میراث کے مسئلہ میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا، پھر بعد میں اسی کے مطابق ایک حدیث مل گئی تھی تو انہوں نے بے انتہاء خوشی کا اظہار کیا تھا۔ بسا اوقات صحابہ کرام نے اجتماعی طور پر بھی تشریح و توضیح کی کوششیں کیں۔

عہد خلافت راشدہ میں قرآن کریم کی تفسیر کے سلسلہ میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن زبیر، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صحابہ کرام میں مجموعی اعتبار سے سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت عبد اللہ بن عباس سے منقول ہیں۔ خلفائے راشدین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سب سے زیادہ تفسیری روایات منقول ہیں۔ علاقوں کے اعتبار سے حضرت عبد اللہ بن عباس کی تفسیری روایات کو مکہ مکرمہ میں، مدینہ میں حضرت ابی بن کعب اور کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی تفسیری روایات نے خاص طور پر مقبولیت اور رواج حاصل کی، اور پھر بعد میں ان کے شاگردوں نے ان روایات کو آگے بڑھایا۔ اس دور میں مختلف صحابہ کرام قرآن کریم کے مختلف احکام و مسائل میں اختصاص رکھتے تھے، مثلاً میراث سے متعلق مسائل پر حضرت زید بن ثابتؓ کو اختصاص حاصل تھا، فقہی احکام و مسائل میں حضرت معاذ بن جبلؓ مقام بلند پر فائز تھے۔ قرآن کریم کی بہترین قرأت اور فن تجوید میں حضرت ابی بن کعبؓ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ قرآن کریم سے متعلق حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے علم و فضل کی تعریف خود رسول عربی ﷺ نے فرمائی تھی۔

6.5.1 عہد صحابہ کی تفسیری کاوشیں

اس دور میں بعض صحابہ کرام نے اپنی تفسیری روایات کو تحریری شکل بھی دینے کی کوشش کی تھی۔ جن میں پہلا نام حضرت ابی بن کعب کا ہے۔ آپ کی یہ تحریر پورے قرآن کی تفسیر پر محیط نہیں تھی، البتہ قرآن کریم کے بڑے حصہ سے متعلق تفسیری روایات اس میں جمع

تھیں۔ آپ کے شاگردوں میں سے ابو العالیہ آپ کی تفسیری روایات کو نقل کرتے تھے، پھر بعد میں ربیع بن انس کے واسطہ سے ابو جعفر رازی اور ان کے بعد ابن جریر، ابن ابی حاتم اور امام احمد بن حنبل وغیرہ نے آپ کی تفسیری روایات نقل کی ہیں۔ آپ کا یہ تفسیری مجموعہ پانچویں صدی ہجری تک موجود رہا۔ تفسیری روایات پر مشتمل ایک اور تحریر حضرت عبد اللہ بن عباس کی جانب منسوب ہے۔ یہ تحریر دراصل حضرت عبد اللہ بن عباس کے شاگردوں کی وہ روایات ہیں جنہیں وہ حضرت عبد اللہ بن عباس کی مجلس درس میں سنتے تھے اور انہیں اپنے پاس تحریری شکل میں محفوظ کر لیتے تھے۔ یہی تحریریں بعد میں تفسیر ابن عباس کے طور پر معروف ہو گئیں۔ آپ کے شاگردوں میں مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح اور طاؤس بن کیسان قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب سے مضبوط اور مستند تفسیری روایت وہ ہے جسے علی بن ابی طلحہ نے مجاہد یا سعید کے واسطہ سے نقل کیا ہے، اور ان میں ضعیف ترین روایت وہ ہے جسے کلبی، ابو صالح کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام تر اقوال وافعال دراصل قرآن کریم کی تفسیر، تشریح اور توضیح ہیں۔ لہٰذا اصحابہ کرام نے آپ ﷺ سے جو بھی روایتیں نقل کیں اور ان کو تحریری شکل دی، وہ دراصل قرآن کریم کی تفسیر کے ضمن ہی میں شمار ہو گی۔ اس دور میں بڑے بڑے مسائل بہت جلد پیش آ گئے، مثلاً نو مسلموں کا اسلام سے پھر جانا، زکوٰۃ دینے سے انکار کرنا، جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرنا، قرآن کریم کا ایک جگہ جمع کرنا، وراثت کے بعض اہم مسائل، مفتوحہ علاقوں کے بعض اہم مالی وانتظامی مسائل، فوج کی تشکیل، بیت المال کا قیام، باغیوں اور خارجیوں سے مقابلہ وغیرہ۔ ان مسائل میں کسی بھی طرح کا حکم جاری کرنے سے پہلے خلفائے راشدین صحابہ کرام سے مشورہ کرتے، وہ آپس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں ان مسائل کو حل کرنے اور ان کا شرعی حکم معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے، پھر ان احکام کا اجراء ہوتا اور ان پر عمل درآمد ہوا جاتا۔ یہ سب دراصل کلام الٰہی کی تفسیر کی کوششیں تھیں۔ جو مرکزی مقامات تھے ان میں جلیل القدر صحابہ بطور مفتی و قاضی اور شرعی رہنما و رہبر متعین کئے جاتے تھے جو قرآن وسنت کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کیا کرتے تھے۔

6.5.2 بعض اہم مفسر صحابہ کرام

حضرت ابی بن کعبؓ: آپ صحابہ کرام میں سب سے بہترین قرآن کریم کی قرأت کرنے والے تھے، چنانچہ "سید القراء" کے طور پر آپ صحابہ کرام میں معروف تھے۔ آپ کاتبین وحی میں سے ہونے کے علاوہ عہد نبوی ﷺ میں ان اجلہ صحابہ کرام میں سے تھے جو فتویٰ دیا کرتے تھے۔ آپ کو وہ عظیم سعادت حاصل ہے جو کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کو سورہ بینہ تلاوت کر کے سنانے کی خواہش کی اور فرمایا کہ اے ابی! اللہ تعالیٰ نے تیرا نام لے کر فرمایا کہ میں قرآن پڑھوں اور تو سنے۔ آپ سے جو تفسیری روایات منقول ہیں ان کو امام حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے تفسیر قرآن میں ایک بڑی کتاب لکھی تھی جس کی اسناد صحیح ہے۔ آپ سے 164 حدیثیں مروی ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ: ابتدائی عمر ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا، جب اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا اور اس کی سلطنت کی سرحدیں

ایران تک پہنچ گئیں تو ایران کے بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ لیکن عربی سے ناواقفیت کی وجہ سے انہیں نماز پڑھنے میں کافی دشواری پیش آتی تھی، چنانچہ انہوں نے اپنا یہ مسئلہ حضرت سلمان فارسیؓ کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اس کے جواب میں سورہ فاتحہ کو فارسی زبان میں ترجمہ کر کے بھیج دیا، جسے وہ نو مسلم ایرانی عربی زبان سیکھنے تک پڑھا کرتے تھے۔ گویا قرآن کریم کے کسی بھی حصہ کا ترجمہ کرنے والے پہلے شخص حضرت سلمان فارسی ہیں۔

حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ: اسلام کے شروعاتی دور سے ہی قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے احکام و مسائل سے واقفیت حاصل ہوتی رہی، اور اس میں پختگی حاصل ہوتی گئی۔ اسی بناء پر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ زیادہ تر تفسیری روایات حضرت علی سے نقل کیا کرتے تھے۔ جسے اکثر اوقات خود بھی لکھ لیتے تھے اور آپ کے شاگرد بھی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اس تحریر کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے جواب دیا یہ ''فہم القرآن'' ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ حضرت علیؓ کی تفسیر میں مہارت سے متعلق فرماتے ہیں: قرآن کریم سات حرفوں پر نازل ہوا ہے، ان میں ہر حرف کا ایک ظاہری معنی و مفہوم ہے اور دوسرا باطنی معنی و مفہوم۔ حضرت علیؓ کو ان دونوں قسموں کے معانی و مفاہیم کی گہری واقفیت حاصل تھی۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ: ازواج مطہرات میں آپؓ رسول اللہ ﷺ کی سب سے محبوب بیوی تھیں۔ آپ ﷺ کی صحبت میں قرآنی تعلیمات اور اس کے احکام و مسائل کو سیکھنے اور جاننے کے زیادہ مواقع میسر آئے۔ علمی قابلیت کی بنا پر آپؓ کے قرآن کریم اور حدیث نبویہ ﷺ کے حلقے لگتے تھے جن میں آپ درس دیا کرتی تھیں۔ ان حلقوں میں بڑے بڑے صحابہ آپ کی شاگردی اختیار کرتے تھے۔ انفرادی طور پر بھی لوگ آپ سے بکثرت علمی استفادہ کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں: ہمیں جب بھی قرآن کریم سے متعلق کوئی مشکل یا دین و شریعت سے متعلق کوئی مسئلہ پیش آتا تو ہم حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ضرور رجوع کرتے، آپ ہمارے مسئلہ کا حل کر کے مشکل دور فرما دیا کرتی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ: آپ نے بچپن ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ آپ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ زوجہ مطہرہ حضرت میمونہؓ کے بھانجے بھی تھے۔ آپ اکثر اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے پاس رہتے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتے، اور آپ ﷺ کے روزانہ کے معمولات کا مطالعہ کرتے، انہیں سیکھنے اور برتنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی انہیں کوششوں سے خوش ہو کر رسول اللہ ﷺ نے آپ کو دعا دی تھی کہ اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تفسیر کا علم سکھا۔ ایک اور موقع پر فرمایا: ''نِعْمَ تُرْجُمَانُ الْقُرْآنِ ابْنُ عَبَّاسٍ''، یعنی ابن عباس قرآن کریم کے بہترین ترجمان ہیں۔ انہی دعاؤں کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دونوں طرح کے علوم سے بھرپور نوازا تھا۔ آپ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اصحاب شوریٰ میں داخل تھے۔

حضرت ابن عباس کا روزانہ حلقہ درس لگا کرتا تھا، جن میں آپ قرآن وحدیث کا درس اور حاضرین کے سوالوں کے جواب دیا کرتے تھے۔ آپ نے غیر عرب افراد کے لئے ترجمان رکھا ہوا تھا جو انہیں حضرت ابن عباس کے دروس اور احکام و مسائل ان کی زبان میں سمجھایا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباس تفسیری نکات کی بھی رہنمائی فرمایا کرتے تھے، جنہیں آپ کے شاگرد اپنے پاس نوٹ کر لیا کرتے تھے۔

آپ کا طریقہ تدریس نہایت ہی مؤثر تھا، چنانچہ حضرت ابو وائل فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت ابن عباس کو امیر حج مقرر کیا۔ حج میں حضرت ابن عباس نے ایسی مؤثر تفسیر بیان کی کہ اگر وہاں ترک، روم اور دیلم کے لوگ ہوتے تو وہ سب کے سب اسلام قبول کر لیتے۔ آپ کے طریقہ تعلیم سے آپ کے بعض شاگرد اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ کئی کئی مرتبہ آپ کے حلقہ درس میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ممتاز شاگرد مجاہد جن کا تفسیری روایات میں بڑا نام ہے فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کے درس میں تیس (30) مرتبہ اور ایک روایت کے مطابق تین (3) مرتبہ قرآن کریم پڑھا۔

آپ سے جن لوگوں نے علمی استفادہ کیا ان میں سعید بن جبیر، عکرمہ، طاؤس، عطاء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کی تفسیری روایات کی قوی ترین سند علی بن طلحہ ہاشمی (م:143ھ) کے واسطہ سے ہے۔ اسی سند سے امام بخاری نے حضرت ابن عباس کی تفسیری روایتیں اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے تفسیری اقوال کو ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی شافعی (م:810ھ) نے اپنی کتاب ''تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباس'' میں جمع کر دیا ہے۔ تفسیر کی انہیں امتیازی خصوصیات کی بنیاد پر آپ کو ''ترجمان القرآن'' کہا جاتا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود: حضرت عبد اللہ بن مسعود ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن سے تفسیری روایات بڑی تعداد میں نقل کی گئی ہے۔ قرآن کریم کے ساتھ ان کو بے انتہاء محبت وعقیدت تھی، اسی بناء پر نبی ﷺ نے آپ سے فرمایا تھا کہ: تم قرآن کریم کی تلاوت کرو اور میں سنوں گا۔ چنانچہ آپ نے سورہ نساء کی تلاوت فرمائی اور آپ ﷺ نے تحسین فرمائی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ قرآن کریم کی جو بھی آیت نازل ہوئی ہے اس کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ کس شخص کے متعلق اور کس جگہ نازل ہوئی ہے۔ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا علم ہو جس کے پاس کتاب اللہ کا علم مجھ سے زیادہ ہو تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا، بشرطیکہ وہاں تک سواریاں جاسکتی ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر، ج:1، ص:9)

6.6 تفسیر: عہد تابعین میں

عہد صحابہ کے بعد تابعین نے علم تفسیر کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے صحابہ کرام سے جو کچھ حاصل کیا تھا انہیں بعد والوں تک پہنچایا۔ جس طرح درس و تدریس کے حلقے لگتے تھے تابعین کے دور میں ان میں مزید اضافہ ہوا۔ اس دور میں تفسیر الگ سے مستقل کوئی فن نہیں تھا، لہٰذا عموماً جو حدیث و فقہ میں مہارت رکھتے تھے وہ علم تفسیر سے بھی آراستہ ہوتے تھے۔ مشہور فقہائے سبعہ (سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد بن ابی بکر، خارجہ بن زید بن ثابت، عبید اللہ بن عبد اللہ، سلیمان بن یسار، ابو بکر بن عبد الرحمن رحمہم اللہ) جو مدینہ میں مسلمانوں کے شرعی امام تھے انہیں علم تفسیر میں بھی مہارت حاصل تھی۔ مکہ مکرمہ جہاں حضرت ابن عباس کے درس کے حلقے لگا کرتے تھے، اور آپ سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا تھا، وہاں آپ کے شاگرد تفسیری خدمات انجام دیتے تھے، جن میں مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح اور طاؤس بن کیسان وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ پھر کوفہ میں پہلے حضرت ابن مسعود اور دار الخلافہ کوفہ منتقل ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علمی فیوض سے وہاں کے لوگ مستفیض ہوئے تھے، لہٰذا ان کے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت تھی جو مرجع خلائق بنی ہوئی تھی۔ اس جماعت میں ابراہیم نخعی اور عامر بن شراحیل شعبی وغیرہ شامل تھے۔ حضرت حسن بصری اور ابن

سیرین، بصرہ میں علم تفسیر میں لوگوں کے مرجع تھے۔ اسی دور میں ابو العالیہ، ابو عبد الرحمن سلمی، امام ضحاک اور امام قتادہ وغیرہ تھے جو علم تفسیر وحدیث کے مقام بلند پر فائز تھے۔

تفسیر قرآن کے سلسلہ میں تابعین کرام نے بطور مآخذ یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب انہیں کسی آیت کی تفسیر دیکھنے کی ضرورت ہوتی توسب سے پہلے قرآن کریم ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اگر قرآن کریم میں اس کی تفسیر نہ ملتی تو احادیث مبارکہ سے مراجعت کرتے، اور اگر ان میں بھی انہیں کسی آیت کی تفسیر نہ ملتی تو صحابہ کرام کے آثار میں اس کی تفسیر تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اگر کبھی ایسا ہوا کہ کسی آیت کی تفسیر انہیں ان تینوں مصادر میں نہیں ملی تو اس وقت انہوں نے اجتہاد اور غور وفکر سے کام لیا اور اس کی تفسیر کی۔

6.6.1 بعض مفسر تابعین عظام

صحابہ کرام سے جن افراد واشخاص نے علمی فیض اٹھایا تھا ان کی بہت بڑی تعداد ہے، لیکن جن شخصیات نے علم تفسیر کے موضوع پر خدمات انجام دیں ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ذیل میں ان میں سے بعض مفسرین کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

حضرت ابو الحجاج مجاہد بن جبیر المخزومی (متوفی: 103ھ): تابعین میں تفسیری روایات کے سلسلہ میں آپ کا نام نہایت ہی ممتاز تھا۔ آپ اصلاً حضرت عبد اللہ بن عباس کے شاگرد خاص تھے، لیکن ساتھ ہی آپ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ آپ نے قرآن کریم حضرت ابن عباسؓ سے تیس مرتبہ پڑھا تھا، اور ایک دوسرے قول کے مطابق تین مرتبہ پڑھا تھا۔ بعض لوگوں نے ان دونوں اقوال کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے کہ حفظ اور دور کے لئے آپ نے حضرت ابن عباس کے سامنے تیس مرتبہ قرآن کریم ختم کی اور ترجمہ وتفسیر کے ساتھ تین مرتبہ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حافظہ بڑا کمال کا عطا فرمایا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک مرتبہ انہیں مخاطب کر کے فرمایا: کاش میرے بیٹے سالم اور نافع کا حافظہ بھی تمہاری طرح ہوتا۔ آپ کی تفسیر ''تفسیر مجاہد'' حکومت قطر کے تعاون سے شائع ہو چکی ہے۔ آپ کی تفاسیر کا ایک مجموعہ مصر کے کتب خانہ ''خدیویہ'' میں موجود ہے۔

حضرت سعید بن جبیر الاسدی (متوفی: 94ھ): حضرت سعید بن جبیر نے حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن زبیر، حضرت انس، حضرت عبد اللہ بن مغفل اور حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہم کی شاگردی میں رہے تھے۔ اپنے وقت کے بڑی عظیم مفسر مانے جاتے تھے۔ حضرت قتادہ فرمایا کرتے تھے کہ تابعین میں علم تفسیر کے سب سے بڑے عالم حضرت سعید بن جبیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کا اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے آپ سے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ حضرت سعید بن جبیر نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تفسیر لکھ کر اس کے حوالہ کر دی تھی، جسے اس نے شاہی کتب خانہ کا بہتر طریقہ پر حصہ بنا دیا تھا۔ گویا یہ تفسیر کسی بھی مسلم حکمراں کے ذریعہ حکومت کی سرپرستی میں منظر عام پر آنے والی پہلی تفسیر تھی۔ پھر بعد میں حضرت سعید بن جبیر کے ایک شاگرد حضرت عطاء بن دینار نے اسے کسی طرح شاہی خزانہ سے حاصل کر لیا تھا اور اس سے تفسیری روایات نقل کیا کرتے تھے۔

حضرت عکرمہ مولی ابن عباس (متوفی:105ھ): حضرت عکرمہ، حضرت ابن عباس کو ہدیہ میں ملے تھے۔ حضرت ابن عباس ان سے بہت محبت کرتے تھے اور اسی محبت اور محنت سے انہیں تعلیم دی تھی، جس کی وجہ سے وہ علم تفسیر کے بڑے بلند مقام پر فائز ہو گئے تھے۔ انہوں نے حضرت ابن عباس کے علاوہ حضرت علی، حضرت حسن بن علی، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبد اللہ ابن عمر، حضرت عبد اللہ بن عمرو، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت جابر اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کی بھی شاگردی اختیار کی تھی۔ ان سب سے آپ روایتیں بھی نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے حصول علم کے لئے مختلف مقامات مثلاً مصر، شام، عراق، افریقہ وغیرہ کے اسفار بھی کئے تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں نے چالیس سالوں تک علم حاصل کیا ہے۔ ان کی علم تفسیر میں مہارت کا اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شعبی جو خود اپنے وقت کے بڑے عالم تھے فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں علم تفسیر اور کتاب اللہ کا ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ قتادہ بن دعامہ بھی ان کے تفسیری کمالات کے معترف تھے۔ حضرت عکرمہ سے امام بخاری، امام مسلم اور امام مالک سبھی نے روایتیں نقل کی ہیں اور انہیں اپنی اپنی کتابوں کا حصہ بنایا ہے۔

حضرت طاؤس بن کیسان (متوفی: 106ھ): آپ کا پورا نام ابو عبد الرحمن طاؤس بن کیسان الحمیری الجندی ہے۔ آپ کے استاذ صحابہ کی فہرست کافی لمبی ہے جن میں حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں۔ بعض لوگوں نے آپ کے استاذ صحابہ کی تعداد 49 تک شمار کرائی ہے۔ (تذکرۃ المفسرین از قاضی محمد زاہد الحسینی: 67) چونکہ آپ حضرت عبد اللہ بن عباس کے خاص شاگرد تھے، لہٰذا ان کی روایت سے آپ نے تفسیر مرتب کی تھی۔ آپ سے روایت کردہ مختلف حدیثیں صحاح ستہ اور دیگر معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ نے چالیس حج کئے تھے۔

عہد تابعین کی بعض تفسیریں

اوپر گذر چکا ہے کہ اس دور میں تفسیر پر کتابیں وجود میں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس سلسلہ کی پہلی بڑی کوشش حضرت سعید بن جبیر (متوفی: 95ھ) نے کی تھی۔ دراصل اموی حکمران عبد الملک بن مروان (متوفی: 86ھ) نے آپ سے فرمائش کی تھی کہ آپ اس کے لئے قرآن کریم کی ایک تفسیر تحریر فرمادیں۔ چنانچہ انہوں نے حکم کی تعمیل میں تفسیر تحریر کی، اور عبد الملک بن مروان کی خدمت میں پیش کر دی۔ عبد الملک نے اسے شاہی کتب خانہ میں رکھوا دیا تھا۔ پھر بعد میں یہ تفسیر حضرت عطاء بن دینار (متوفی: 126ھ) کو مل گئی تھی، اور انہیں کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت ابو ہریرہ کے مشہور شاگرد ہمام بن منبہ نے احادیث پر مشتمل ایک کتاب "بدء الخلق" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب کے اخیر میں انہوں نے بعض آیتوں کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ امام مجاہد (متوفی: 104ھ) جو حضرت عبد اللہ بن عباس کے لائق شاگرد تھے، انہوں نے بھی ایک تفسیر مدون کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تفسیر مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے۔ حضرت ابو العالیہ ریاحی (متوفی: 90ھ) نے ایک تفسیر حضرت ابی بن کعب کی روایات اور اقوال پر مشتمل مرتب کی تھی۔ ایک قول کے مطابق یہ دراصل حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی ہی تفسیر تھی۔ پھر ابو العالیہ سے ربیع بن انس نے اور پھر ان کے واسطہ سے ابن ابی حاتم حضرت ابی بن کعب کی تفسیری روایات کو نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ اس دور میں جو تفسیریں منصہ شہود پر آئیں ان میں حضرت ابراہیم نخعی (متوفی: 95ھ) کی تفسیر نخعی، حضرت عکرمہ (حضرت عبد اللہ بن عباس کے آزاد کردہ غلام، متوفی: 105ھ) کی تفسیر عکرمہ، حضرت امام باقر یعنی امام زین

العابدین کے صاحبزادہ (متوفی:112ھ) کی تفسیر امام باقر، حضرت عطاء بن ابی رباح (متوفی:114ھ) کی تفسیر عطاء، حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی (متوفی:117ھ) کی تفسیر قتادہ، شیخ عبد الملک بن عبد العزیز اموی معروف ابن جریج (متوفی:150ھ) کی تفسیر ابن جریج، امام سفیان ثوری (متوفی:161ھ) کی تفسیر ثوری وغیرہ شامل ہیں۔

6.6.2 تفسیر آل بیت

سورہ نحل میں اللہ تعالی فرماتا ہے کہ قرآن کی تفصیل بیان کرنا آنحضرت ﷺ کا کام تھا۔" **وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ**..."(نحل:64)۔(اور ہم نے اسی لئے آپ پر کتاب نازل کی ہے کہ آپ ان کے لئے انکی اختلافی باتوں کا کھول کر بیان کرے...)۔ یہاں شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ "حدیث الثقلین" کے مطابق پیغمبر کے بعد یہ کام آل بیت (اہل بیت رسول اللہ ﷺ) کو دیا گیا تھا اور ان کی حدیث کو حدیث نبوی کی وہی سند حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں امام جعفر صادق کا کہنا ہے کہ آل بیت کی تعلیمات نبی ﷺ سے ماخوذ ہیں۔ شیعہ مصادر کی مشہور کتاب 'اصول کافی' میں حدیث الثقلین اس صورت میں مذکور ہوئی ہے:

"... **إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا، كِتَابَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَأَهْلَ بَيْتِي عِتْرَتِي**..."(میں تمہارے درمیان میں دو امانتیں چھوڑے جارہا ہوں، تم ان کا دامن تھامے رکھوگے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے :اللہ کی کتاب اور میرے اہل بیت جو میری عترت ہیں)۔ ثقلین کی حدیث کو صحیح مسلم میں اس صورت میں وارد کیا گیا ہے:

"... **أَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللَّهِ فِيهِ الْهُدَى وَالنُّورُ فَخُذُوا بِكِتَابِ اللَّهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ"، فَحَثَّ عَلَى كِتَابِ اللَّهِ وَرَغَّبَ فِيهِ ثُمَّ قَالَ: " وَأَهْلُ بَيْتِي أُذَكِّرُكُمُ اللَّهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي**..."،("...میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہاہوں ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے لہذا اللہ کی کتاب کا دامن تھامے رکھو اور اسے تمسک کرنا"، نبی کریم ﷺ نے کتاب اللہ کی بہت زیادہ سفارش اور تاکید کی اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب دلائی، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: "اور میرے اہل بیت، میں تمہیں اپنے اہل بیت کی سفارش اور تاکید کرتا ہوں..." آخری عبارت کو تین بار دہرایا)۔

حضرت علی، کرم اللہ وجہہ، قرآن کی تفسیر اور اس کے نزول کے مواقع کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کے سب سے زیادہ علم والے ساتھی تھے۔ سنی اور شیعہ احادیث اور تاریخی اطلاعات کے مطابق، قرآن کا ایک "مصحف" تھا جسے حضرت علی نے جمع کیا تھا۔ اس مصحف میں قرآن کی آیات کو ان کے نزول کی ترتیب کے مطابق ترتیب دیا گیا تھا۔ اس میں دیگر چیزوں کے علاوہ ناسخ اور منسوخ آیات کے بارے میں تفسیری نوٹ اور معلومات بھی فراہم تھے۔ شیعہ علما ذکر کرتے ہیں کہ اس مصحف کو آل جعفر صادق کے پاس محفوظ رکھا گیا تھا۔ ابوالجرود زیاد بن منذر، امام باقر کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے امام کے تفسیری اقوال جمع کیے، جن کا تعلق زیادہ تر دیگر قرآنی آیات کا حوالہ دے کر مشکل آیات اور الفاظ کو بیان کرنے سے ہے۔

قرآن کی تفسیر قرآن کے طریقہ کار کے علاوہ، ائمہ اپنی تفسیر میں نبی کریم ﷺ یا دوسرے ائمہ کے اقوال واخبار استعمال کرتے

ہیں، جسے 'تفسیر بذریعہ احادیث' کی ایک قسم قرار دیا جا سکتا ہے۔ امام جعفر الصادق کی تفسیریں احادیث کے مجموعوں میں جمع ہیں اور احادیث پر مبنی ہیں۔ اس طرح قرآنی آیات کی تفسیر سے متعلق ائمہ کے اقوال ان کے شاگردوں کی تصانیف میں موجود ہیں۔

6.7 علوم القرآن

قرآن کریم سے متعلق اسباب نزول، رسم قرآنی، اعجاز قرآن، اعراب قرآن، ناسخ و منسوخ، مکی و مدنی، عام و خاص اور قصص واحکام وغیرہ کے علوم کو "علوم القرآن" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق مذکورہ امور کا علم ہو تو لازماً اس آیت میں احکام الٰہی سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ کے مضافات میں تھے، اور رسول اللہ ﷺ وہاں ایک شاخ سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ اسی دوران وہاں سے یہودیوں کی ایک جماعت گذری۔ ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ آپ ﷺ سے روح کے متعلق سوال کیا جائے، لیکن بعض دوسرے لوگوں نے اس سے روک دیا کہ آپ ﷺ ایسی بات فرما دیں گے جو ان کو ناگوار ہوگی۔ پھر وہ آپ ﷺ کے سامنے آگئے اور کہا کہ اے ابو القاسم! ہمیں روح کے بارے میں بتائیے۔ تو آپ ﷺ نے کچھ دیر توقف اختیار کیا۔ حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے جان لیا کہ وحی نازل ہو رہی ہے، لہٰذا میں وہاں سے پیچھے ہٹ گیا، پھر جب وحی کے نزول کا سلسلہ ختم ہو گیا تو آپ ﷺ سورہ اسراء کی آیت نمبر 85 "وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" تلاوت فرمائی۔ (بخاری:7297) ظاہر ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت حضرت عبد اللہ بن مسعود وہاں موجود تھے، لہٰذا اس آیت کے اسباب نزول جس بہتر طریقہ پر حضرت ابن مسعود بیان کریں گے اس سے بہتر بیان کرنا کسی دوسرے کے لئے مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسباب نزول کا جاننا جو علوم القرآن کا ایک حصہ ہے اہمیت کا حامل ہے۔

عہد نبوی ﷺ میں جبکہ وحی کے نزول کا سلسلہ جاری تھا، تو مذکورہ امور کی اہمیت نا ہونے کے برابر تھی، کیونکہ وحی کا نزول کن حالات اور واقعات کے پیش نظر ہو رہا تھا ان کا وہ خود مشاہدہ کر رہے تھے، نزول قرآن کی کیفیت، آیات کے سبب نزول اور ان کے ناسخ ومنسوخ وغیرہ سے وہ بخوبی واقف تھے، اس کے علاوہ قرآن کریم کی تفسیر اور تشریح وتوضیح کے لئے رسول اللہ ﷺ بذات خود موجود تھے۔ پھر اس کے بعد کے قریبی ادوار میں بھی اس کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی گئی لہٰذا اس کی تدوین کی جانب لوگوں نے توجہ نہ کی۔ البتہ اس کا باقاعدہ آغاز مفسرین کے مطابق حضرت عثمان غنی کے زمانہ میں اس وقت ہوا، جب مختلف علاقوں کے باشندے اختلاف قرأت کی بنیاد پر آپس میں الجھنے لگے تھے۔ اس اختلاف کو ختم کرنے کے لئے حضرت عثمان غنیؓ نے ان کو ایک مصحف پر جمع کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ کا یہ عمل ہی دراصل علوم القرآن کا نکتہ آغاز ثابت ہوا۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہد خلافت میں عربی کے اصول وضوابط مرتب کروائے تاکہ غیر عرب عربی زبان اور قرآن کریم کو اچھی طرح پڑھ اور سمجھ سکے۔ آپ کے اس عمل سے اعراب قرآن کی بنیاد پڑی جو علوم القرآن کا ایک حصہ ہے۔

علوم القرآن کی تدوین کا باقاعدہ آغاز تیسری صدی ہجری سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ زور پکڑتا گیا اور ہر دور میں بیش قیمتی

کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ آغاز سے انتہاء تک علوم القرآن پر کتابوں کی لمبی فہرست ہے، جن میں قتادہ بن دعامہ السدوسی (م:117ھ) کی کتاب الناسخ والمنسوخ فی کتاب اللہ تعالیٰ، ابو عبیدہ معمر بن مثنی (م:210ھ) کی مجاز القرآن، سعید بن سعدہ اخفش (م:215ھ) کی معانی القرآن، ابو عبیدہ قاسم بن سلام (م:224ھ) کی فضائل القرآن اور غریب القرآن، عبد اللہ بن یحیٰ یزیدی (م:237ھ) کی غریب القرآن، ابن قتیبہ (م:276ھ) کی تفسیر غریب القرآن، محمد بن ایوب (م:294ھ) کی فضائل القرآن وما انزل من القرآن بمكة وما نزل بالمدينة، محمد بن خلف بن مرزبان (م:310ھ) کی الحاوی فی علوم القرآن، ابو بکر محمد بن قاسم الانباری (م:328ھ) کی عجائب علوم القرآن، واحدی (م:468ھ) کی اسباب النزول، قاضی باقلانی (م:403ھ) کی اعجاز القرآن وغیرہ شامل ہیں۔ یہ علوم القرآن پر صرف وہ تالیفات ہیں جو بالکل ابتدائی عہد میں لکھی گئی تھیں۔

6.8 علم قرأت

تفسیر قرآن کریم کے ضمن میں کئی علوم نے جنم لئے، انہیں میں سے ایک اہم علم، علم قرأت و تجوید ہے۔ اس علم کا آغاز قرآن کریم کے نزول کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، البتہ اِس دور سے پہلے اس علم کا زور اس قدر نہ تھا کہ اسے مستقل ایک علم کے طور پر جانا جاتا۔ اس دور میں مختلف علاقوں میں سات قراء مشہور ہوئے جن کا تذکرہ امام کبیر ابو بکر احمد بن موسیٰ بن عباس نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان قراء میں نافع بن عبد الرحمن مدنی (م:169)، عبد اللہ بن کثیر مکی (م:119ھ)، ابو عمرو بن علاء بصری (م:154ھ)، عبد اللہ ابن عامر شامی (م: 118ھ)، عاصم بن ابی النجود کوفی (م:128ھ)، حمزہ بن حبیب کوفی (م:155ھ)، علی بن حمزہ کسائی کوفی (م:189ھ) شامل ہیں۔

حدیث نبوی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ میں قرآن کے سات حرفوں پر نزول کی جو بات کہی گئی ہے اس سے مذکورہ بالا قراء کی قرأت مراد نہیں ہے، بلکہ اکثر مفسرین اس رائے کے حامل ہیں کہ امام کبیر ابو بکر نے اپنی کتاب میں ان سات قاریوں کو ایک جگہ جمع کر کے عوام کو مغالطہ میں ڈال دیا ہے، حالانکہ ان کے دور میں اور بھی بہت سے بہترین قراء موجود تھے۔ چنانچہ بعد میں بعض لوگوں نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ان سات قرأتوں کے ساتھ چند قرأتوں کا اضافہ بھی کیا، اور قراء عشرہ یعنی دس قاری کی اصطلاح جاری کی گئی جن میں مذکورہ سات قاریوں کے علاوہ ابو جعفر یزید بن قعقاع (م:132ھ)، یعقوب بن اسحاق حضرمی (م:185ھ) اور خلف بن ہشام (م:229ھ) کو شامل کیا گیا۔ پھر اس فہرست میں مزید چار قاریوں: حسن بصری (م:110ھ)، محمد بن عبد الرحمن (م:123ھ) یحییٰ بن مبارک یزیدی (م:202ھ) اور ابو الفرج محمد بن احمد (م:388ھ) کا اضافہ کیا گیا۔ بعد کے ادوار میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اس پر کتابیں لکھی گئیں اور عظیم قراء منصہ شہور پر آتے رہے۔ اس کی تفصیل کے لئے اس موضوع کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

6.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- قرآن مجید کی بعض عبارتیں مجمل اور قابل وضاحت ہیں، ان کی تشریح کو تفسیر کہتے ہیں۔
- تفسیر سے قریب ایک اور لفظ "تاویل" ہے، اگر قرآن مجید کے معنی تک پہنچنے میں غور و استنباط کی ضرورت نہ پیش آتی ہو تو زیادہ تر اسے تفسیر کہا جاتا ہے اور اگر غور و استنباط کے ذریعہ معنی اخذ کیا جائے، تو اس کو "تاویل" کہا جاتا ہے۔
- جب تک وحی کے نزول کا سلسلہ جاری رہا اور رسول اللہ ﷺ باحیات رہے، قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم کے ذریعہ کی جاتی رہی اور اس کے بعد آنحضورؐ کی سنتوں اور حدیثوں کے ذریعہ تفسیر کی گئی۔
- عہد صحابہ میں تفسیر قرآن کی تفسیر، قرآن کریم اور احادیث نبویہؐ سے کرنے کے علاوہ صحابہ کرام نے آپسی مشورہ سے بھی بعض مقامات پر تفسیریں کیں اور بعض انفرادی رائے بھی سامنے آئیں۔
- عہد تابعین میں قرآن کریم کی تفسیر کے لئے قرآن اور حدیث کے علاوہ آثار صحابہ سے بھی رجوع کیا جانے لگا تھا۔

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

6.10.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. تفسیر قرآن کا آغاز کس دور سے ہوا؟

(a). عہد نبوی ﷺ (b). خلفاء راشدین (c). عہد اموی (d). عہد عباسی

2. تفسیر کا لفظی معنی کیا ہے؟

(a). بند کرنا (b). واضح کرنا (c). مشکوک (d). سب صحیح

3. محکمات کسے کہتے ہیں؟

(a). صاف و صریح باتیں (b). تاویل کی ضرورت ہو (c). مخفی معنی (d). سب غلط

4. رسول اللہ ﷺ کی ہر ایک بات اور ہر ایک عمل قرآنی آیات کی تفسیر ہے؟

(a). صحیح (b). غلط

5. "**الصحيفة الصادقة**" کس صحابی رسول کی مرتب کردہ حدیث کی کتاب ہے؟

(a). حضرت زید بن ثابت (b). حضرت علی مرتضیٰ (c). حضرت عمرو بن العاص (d). حضرت ابوہریرہ

6.10.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. تفسیر کی لغوی و اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق واضح کیجیے۔
2. تفسیر کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
3. حضرت عبد اللہ بن عباس کی تفسیری خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے عہد صحابہ کی تفسیروں پر روشنی ڈالیے۔

4. عہد تابعین کے تفسیری سرمایہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کسی تین تابعی مفسر کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
5. تفسیر آل بیت پر ایک نوٹ لکھیے۔

6.10.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. عہد نبوی میں تفسیر قرآن کریم کی کیا صورت حال تھی؟ تجزیاتی نوٹ لکھیے۔
2. عہد صحابہ کے مفسرین اور ان کی تفسیری خدمات پر ایک مضمون لکھیے۔
3. عہد تابعین میں تفسیر قرآن کے لئے تابعین عظام کی کوششوں روشنی ڈالیے۔

6.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تدوین قرآن : مولانا سید مناظر احسن گیلانی
2. تاریخ القرآن : ڈاکٹر عبد الصمد صارم ازہری
3. جمع قرآن : مولانا تمنا عمادی
4. علوم القرآن (اُردو ترجمہ) : ڈاکٹر صبحی محمصانی
5. علوم القرآن : مولانا محمد تقی عثمانی

معروضی سوالات کے جوابات

5.C	4.A	3.A	2.B	A

اکائی 7: تاریخ اور مصادر تفسیر

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید
7.1 مقاصد
7.2 تفسیر کے تدوینی مراحل
7.2.1 تدوین تفسیر کا پہلا مرحلہ
7.2.2 تدوین تفسیر کا دوسرا مرحلہ
7.2.3 تدوین تفسیر کا تیسرا مرحلہ
7.3 برصغیر ہندوپاک میں تفسیر قرآن کریم
7.4 تفسیر قرآن کے مصادر
7.4.1 قرآن سے قرآن کی تفسیر
7.4.2 حدیث سے تفسیر
7.4.3 تفسیر اور آثارِ صحابہ
7.4.4 تفسیر اور عربی زبان ولغت
7.4.5 تفسیر اور عقل سلیم
7.4.6 اسرائیلی روایات
7.4.7 تفسیر بالرائے
7.5 اکتسابی نتائج
7.6 نمونہ امتحانی سوالات
7.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

7.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات
7.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات
7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

آپ نے پچھلی اکائی میں تفسیر کا تعارف اور اس کی اہمیت کے بارے میں سیکھا۔ آپ نے مختلف عہد میں تفسیر کی تدوین پر بھی گفتگو کی۔ اس اکائی میں ہم علم تفسیر کے آغاز وارتقاء کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ علم تفسیر کے ماخذ کے بارے میں بحث کریں گے۔ برصغیر پاک وہند میں تفسیر کی تاریخ پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جائے گی۔ اور تفسیر کے ضمن میں وجود میں آنے والے علوم میں سے بعض کا اجمالاً تعارف پیش کیا جائے گا۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ:

- علم تفسیر کی تاریخ کا احاطہ کرسکیں۔
- مختلف تفسیری مناہج اور ان کی اہم کتب کا مطالعہ کر سکیں۔
- علم تفسیر کی اہمیت اور اس کے ماخذ پر گفتگو کر سکیں۔
- ہندوستان میں علم تفسیر کی روایت سے واقفیت حاصل کر سکیں

7.2 تفسیر کے تدوینی مراحل

آپ نے پچھلی اکائی میں تفسیر کے تعارف اور اہمیت کے ضمن میں پڑھا کہ تفسیر کا آغاز نزول وحی کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ آپ نے نبی ﷺ کے دور اور آپؐ کے بعد صحابہ اور تابعین کی تفسیری خدمات کا جائزہ لیا آیئے ہم تدوین تفسیر کے مختلف مراحل کا تاریخی جائزہ لیں۔

7.2.1 تدوین تفسیر کا پہلا مرحلہ

تدوین تفسیر قرآن کریم کے اس مرحلہ کا آغاز اس وقت ہوا جب احادیث نبویہ ﷺ کی تدوین کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا اور ان کو مجموعوں کی شکل میں مرتب کیا جانے لگا تھا۔ ان مجموعوں میں احادیث کو مختلف ابواب کے تحت موضوعات کے اعتبار سے جمع کیا جاتا تھا۔ تدوین تفسیر کے اس شروعاتی مرحلہ میں قرآن کریم کی تفسیر میں آنحضور ﷺ سے منقول روایتوں کو حدیث کی ان کتابوں میں مستقل

ابواب کے تحت کتاب التفسیر یا ابواب التفسیر کے نام سے ایک جگہ جمع کیا جانے لگا۔ اس کی مثالیں بعد کے ادوار میں مرتب کی گئی حدیث کے مجموعوں میں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ اس دور میں جن افراد نے حدیث کی تلاش و جستجو کی اور مختلف علاقوں کے اسفار کئے اور دیگر احادیث کے ساتھ تفسیری روایات کو بھی اپنے پاس محفوظ کیا ان میں یزید بن ہارون السلمی (م: 117ھ)، شعبہ بن حجاج (م: 118ھ)، اسماعیل بن عبدالرحمن سدی (م:127ھ) عطاء الخراسانی (م:135ھ)، ابو نصر محمد بن سائب کلبی (م:146ھ)، سفیان ثوری (م:161ھ)، وکیع بن الجراح (م:197ھ)، سفیان بن عیینہ (م:198ھ)، یحییٰ بن سعید القطان (م:198ھ)، روح بن عبادہ بصری (م:205ھ)، عبدالرزاق بن ہمام (م:211ھ) آدم بن ابی ایاس (م:220ھ)، اسحاق بن راہویہ (م:238ھ) اور عبد بن حمید (م:249ھ) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تاہم اس دور میں ہمیں بعض ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ تفسیر کے موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر یہ سوال قائم ہوا کہ قرآن کریم کا پہلا مفسر کون ہے جس نے مکمل قرآن کریم کی تفسیر آیتوں اور سورتوں کی ترتیب کے ساتھ انجام دی۔ تدوین تفسیر کے اِس پہلے مرحلہ میں بھی اگرچہ اس طرز پر قرآن کریم کی تفسیر کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کی بعض مثالیں شروع ہی سے ملتی ہیں۔ عہد خلافت بنو امیہ میں خلیفہ عبدالملک بن مروان (م:86ھ) نے حضرت سعید بن جبیر (م:95ھ) کو حکم دیا تھا کہ آپ مکمل قرآن کریم کی ایک تفسیر اس کے لئے لکھ دیں۔ چنانچہ حضرت سعید بن جبیر نے حکم کی تعمیل میں مکمل قرآن کریم کی تفسیر میں ایک کتاب تحریر کر دی تھی جسے عبدالملک بن مروان نے اپنی شاہی لائبریری کی زینت بنایا تھا۔ چونکہ عبدالملک بن مروان کا انتقال 86 ہجری میں ہو گیا تھا، لہٰذا یہ بات لازمی ہے کہ یہ تفسیر 86 ہجری سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔ پھر بعد میں حضرت سعید بن جبیر کے ایک لائق شاگرد عطاء بن دینار (م:126ھ) نے یہ تفسیر کوشش کر کے حاصل کر لی تھی، اور اس سے تفسیری اقوال و آراء نقل کیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مشہور شاگرد امام مجاہد (م:103ھ) کے متعلق ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ وہ حضرت ابن عباس کے درس میں جب شریک ہوتے تو اپنے ہمراہ تختیاں بھی لیتے جاتے تھے، جن پر حضرت ابن عباس کے تفسیری اقوال و آراء اور روایات تحریری طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔ بسا اوقات وہ حضرت ابن عباس سے بعض آیتوں کی تفسیر دریافت بھی کرتے تھے، اور جب آپ ان کی تفسیر بیان کرتے تو انہیں ضبط تحریر میں لے آتے تھے۔ حضرت ابن عباس نے خود فرمایا تھا کہ لکھتے جاؤ۔ یہاں تک پورے قرآن کریم کی تفسیر امام مجاہد نے حضرت ابن عباس کی شاگردی میں اپنے پاس جمع کر لی تھی۔

ابن الندیم نے اپنی کتاب ''الفہرست'' میں فراء نحوی (م: 207ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے ابو العباس ثعلب (م: 291ھ) کی خواہش پر ایک تفسیر ''معانی القرآن'' کے نام سے املاء کرائی تھی۔ اس کی پہلی جلد 1956ء میں قاہرہ کے ایک ناشر دار الکتاب سے شائع ہوئی تھی، جو سورہ یونس تک کی تفسیر پر محیط تھی۔ ان تفاسیر کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد ہمام بن منبہ نے ایک کتاب ''بدء الخلق'' کے نام سے لکھی تھی جس میں قرآن کریم کی بعض آیتوں کی تفسیر بھی بیان کی تھی۔ محمد بن کعب القرضی کے متعلق منقول ہے کہ انہوں نے بھی تفسیر پر ایک کتاب لکھی تھی۔ عمرو بن عبید معتزلی کے متعلق بھی یہ بات کہی گئی ہے کہ اس نے حضرت حسن بصری کی روایت

سے ایک تفسیر مرتب کی تھی۔ ابن جریج نے تین ضخیم جلدوں میں ایک تفسیر تیار کی تھی جسے بعد میں محمد بن ثور نے روایت کی تھی۔ ان مفسرین کے علاوہ ابو فید مورج نے غرائب القرآن پر، امام کسائی نحوی نے قرآن کریم کے تشابہات پر اور امام شافعی نے قرآن کریم کے احکام سے متعلق آیات پر کتابیں لکھی تھیں، جو بعد میں تفسیر قرآن کریم کی باقاعدہ تدوین وترتیب کے وقت بنیاد ثابت ہوئیں۔

7.2.2 تدوین تفسیر کا دوسرا مرحلہ

تفسیر کے اس تدوینی مرحلہ میں تفسیر قرآن کے لئے کتابیں لکھے جانے کا مستقل طور پر آغاز ہوا۔ اس سے پہلے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ سے مروی احادیث کو کتب احادیث میں کتاب التفسیر اور ابواب التفسیر کے ناموں سے معنون ابواب کے تحت جمع کیا جاتا تھا۔ لیکن تدوین تفسیر کے اس مرحلہ میں ان روایات اور آثار صحابہ وتابعین کو ایک کتاب میں آیات قرآنیہ کے ذیل میں ذکر کئے جانے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔

جب کتابی شکل میں تفسیر کی تدوین کا آغاز ہوا تو اس تدوینی دور کی شروعات میں تفسیری روایات اور دیگر اقوال وآراء کو سند کے ساتھ نقل کیا جاتا تھا۔ اس طرز پر کئی مفسرین نے اپنی تفسیریں مرتب کیں، جن میں ایک معروف نام ابن راہویہ (م:238ھ) کا ہے۔ وہ قرآنی آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اپنے اساتذہ وشیوخ کے اقوال سند کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔ یہی طرز مشہور مفسر حسین بن مسعودی (م:516ھ) جو بغوی کے نام سے معروف ہیں نے اپنی تفسیر "معالم التنزیل" میں اختیار کیا۔ امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اقوال نقل کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی چند مثالیں نیچے دی جارہی ہیں:

- بغوی ◄ ابو اسحاق ◄ محمد بن عبد اللہ ◄ احمد بن محمد ◄ عثمان بن سعید ◄ عبد اللہ بن صالح ◄ معاویہ بن صالح ◄ علی بن ابی طلحہ ◄ عبد اللہ بن عباس
- بغوی ◄ ابو محمد عبد اللہ بن حامد ◄ ابن بطہ ◄ عبد اللہ بن محمد بن زکریا ◄ سعید بن یحییٰ ◄ مسلم بن خالد ◄ مجاہد
- بغوی ◄ ابو القاسم ◄ حسن بن محمد ◄ احمد بن لیس ◄ ابو بکر محمد بن بکر بن سہل ◄ عبد الغنی بن سعید الثقفی ◄ ابو محمد موسیٰ بن عبد الرحمن ابن جریج ◄ عطاء بن ابی رباح

یعنی امام بغوی جب کسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں جو روایات نقل کرتے ہیں انہیں مختلف واسطوں سے آنحضرت ﷺ تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن اس تدوینی مرحلہ کے شروعاتی دور کے بعد بہت جلد ہی یہ فرق نمایاں طور پر سامنے آیا کہ تفسیری روایات کی اسناد کو مختصر کیا جانے لگا، اور اصل زور حدیث میں مذکور تفسیری اقوال پر دیا جانے لگا۔ اسی طریقہ سے دیگر اقوال صحابہ وتابعین اور ان کی آراء کو یا تو مختصر سند کے ساتھ یا بلا سند تحریر کیا جانے لگا۔

اسی دور میں مختلف وجوہات کی بنا پر بطور تفسیری اقوال وروایات بہت سی بے سند باتیں تفسیر قرآن کریم میں شامل ہونے لگیں۔ جن وجوہات کے پیش نظر یہ باتیں سامنے آئیں ان میں سے بعض اہم وجوہات پر ذیل میں اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جارہی ہے۔

- **گروہی تعصب:** تفسیری اقوال گڑھنے کا آغاز حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت کے آخری دور سے ہوتا ہے۔ اسی دور میں مختلف

گروہ وجود میں آئے۔ انہوں نے حتی المقدور اپنے افکار و نظریات کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنے کی کوششیں کیں، اور اس سلسلہ میں اپنی بات مضبوط اور باوزن بنانے کے لئے انہوں نے اپنے حق میں بہت سی ایسی باتیں محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی جانب منسوب کر کے عوام میں مشہور کرنی شروع کی جن کا دراصل حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ ان باتوں کو خود اپنی جانب منسوب کرتے تو ان کے عقائد و نظریات کو اتنے بڑے پیمانہ پر رواج و شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہوتی جس کے وہ متوقع تھے۔ اس کے برعکس انہوں نے یہ باتیں آقا تاجدار مدینہ حضرت محمد ﷺ کی جانب منسوب کیا، تاکہ ان کے افکار و نظریات کی اشاعت اور مقبولیت کے سلسلہ میں وہ جن نتائج کی امید رکھتے ہیں وہ انہیں آسانی سے ساتھ حاصل ہو جائیں۔

- **سیاسی برتری:** حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ ہی کے زمانہ میں یہ وجہ بھی پیش آئی اور اس کے بعد یہ سلسلہ زور پکڑ تا گیا۔ حضرت علیؓ کے دور میں بہت سے سیاسی اتار چڑھاؤ پیش آئے۔ اسی زمانہ میں خوارج و شیعیان علی کا مقابلہ ہوا، جنگ جمل اور جنگ صفین کا واقعہ پیش آیا، فرقہ بنوسبا نے بڑے پیمانہ پر مسلمانوں کے درمیان افراتفری کا ماحول پیدا کر دیا۔ ان کے علاوہ خلافت بنوامیہ اور خلافت بنوعباس کے قیام کے دوران بہت سے تفسیری اقوال گڑھے گئے تاکہ سیاسی طور پر ایک دوسرے سے برتری حاصل کی جاسکے۔
- **جذبہ انتقام:** جب دشمنان اسلام نے خود اپنے آپ میں اس بات کو تسلیم کر لیا کہ وہ مسلمانوں کو میدان جنگ میں اور دلائل کی بنیاد پر شکست نہیں دے سکتے تو انہوں نے جھوٹ کا لبادہ اوڑھنا شروع کیا کہ وہ بظاہر مسلمان ہو جائیں اور دل سے اپنے سابقہ مذہب سے وابستہ رہیں گے، اور اس طریقہ سے وہ اندرونی طور پر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے بہت سی من گھڑت باتیں جن کا مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا مسلمانوں میں پھیلایا، اور چونکہ ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ اور صحابہ و تابعین کی جانب ہوتی تھی اس لئے آسانی کے ساتھ ان کو مقبولیت بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ لہٰذا مسلمانوں میں بے سند باتوں کے رواج پا جانے کی ایک وجہ یہ بھی بنی۔

حالانکہ بعد میں مفسرین نے اسناد کی تحقیق کی بنیادی پر ان تمام بے سند اور گڑھی ہوئی تفسیری روایات واقوال کو ناقابل اعتبار قرار دیا۔

7.2.2.1. تفسیر قرآن کریم میں اسرائیلی روایات کا عمل دخل اور ان کا حکم

آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ تدوین تفسیر کے پہلے مرحلہ میں قرآنی آیات سے متعلق تفسیری روایات کو سند کے ساتھ نقل کئے جانے کا اہتمام ہوتا تھا۔ بعد میں باوجودیکہ بہت سی بے سند باتیں تفسیری روایات میں شامل ہو گئی تھیں، اس دور میں جو بھی تفسیریں مرتب ہوئیں وہ "تفسیر بالماثور" کے تحت منظر عام پر آئیں، یعنی یہ ساری تفاسیر خود قرآن کریم، احادیث نبویہ ﷺ اور صحابہ و تابعین کے اقوال وآراء کی روشنی میں مرتب ہوئیں۔ البتہ ان میں تفسیر کرتے ہوئے اسرائیلی روایات (سابقہ آسمانی کتابیں) کا بھی کافی عمل دخل رہا۔ قرآن کریم میں بہت سے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جو اسرائیلی روایات میں پہلے سے موجود تھے خاص طور پر سابقہ انبیاء اور اقوام و ملل کے حالات وواقعات کا تذکرہ قرآن کریم کے مقابلہ زیادہ تفصیل سے ان میں موجود ہے۔ ظاہر ہے اس دور میں دیگر اقوام کے ساتھ یہود و نصاریٰ بھی بڑی تعداد میں حلقہ بگوش اسلام ہو رہے تھے جن میں بہت سے اپنے سابقہ مذہبی کتابوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب وہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور اس میں انہیں وہ احکام وواقعات ملتے جو انہوں نے پہلے پڑھی ہوئی تھی تو لازماً اس کی تشریح و تفسیر میں وہ ان مذہبی

کتابوں کا تذکرہ کر دیتے تھے۔ اس طریقہ سے اسرائیلی روایات کا عمل دخل کا آغاز ہوا، جو بتدریج مضبوطی اختیار کرتا گیا۔ پھر بسا اوقات مفسرین بعض قرآنی آیات کی تفصیل جاننے کی غرض سے اسرائیلی روایات سے رجوع بھی کر لیا کرتے تھے۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی اسرائیلی روایات قرآن کریم کی تفسیر میں داخل ہو گئیں۔

لیکن چونکہ قرآن کریم کے نزول کے بعد سابقہ تمام آسمانی کتابیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ لہٰذا ایسی اسرائیلی روایات جو تفسیر قرآن میں در آئیں مفسرین نے ان کی قبولیت اور عدم قبولیت کے سلسلہ میں انہیں تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی قسم کی اسرائیلی روایات وہ ہیں جن کی تائید خود قرآن کریم میں موجود ہو یا جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمادی ہو، مثلاً قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں آپ کے جس رفیق کا تذکرہ کیا گیا ہے، حدیث نبوی ﷺ میں ان کا نام حضرت خضر بتایا گیا ہے، جس سے اسرائیلی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ تو اسرائیلی روایات کی یہ قسم قابل اعتبار اور قابل قبول ہوں گی۔ دوسری قسم کی اسرائیلی روایات وہ ہیں جن کی قرآن کریم یا رسول اللہ ﷺ نے تردید کر دی ہو، مثلاً یہ اسرائیلی روایت کہ حضرت سلیمانؑ اپنی آخری عمر میں بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ اسرائیلی روایت بہر حال نا قابل اعتبار ہے کیونکہ قرآن مجید میں بالکل واضح طور پر اس کی تردید کی گئی ہے۔ اسرائیلی روایات کی تیسری قسم میں وہ روایات داخل ہوں گی جن کے متعلق کتاب و سنت خاموش ہیں، جن کے متعلق صراحتاً ہمیں کچھ معلوم نہیں مثلاً تورات میں مذکور تعلیمات۔ چونکہ تورات کی ان تعلیمات کے متعلق یقینی طور پر نہیں معلوم کہ یہ صحیح ہیں یا غلط ان کے متعلق خاموشی اختیار کی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا ہے: نہ تم ان کی تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب، اور کہو کہ ہم نے اللہ اور جو کچھ ہماری جانب اتارا گیا ہے ان پر ایمان لے آئے۔ اسرائیلی روایات کی اس قسم کا تعلق دراصل براہ راست دین و شریعت سے نہیں ہے، چنانچہ خود اہل کتاب بھی اس سلسلہ میں مختلف الخیال ہیں۔ مثلاً اصحاب کہف کے نام، ان کے کتا کا رنگ، جن پرندوں کو حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے زندہ کیا تھا ان کے نام، حضرت موسیٰ کی لاٹھی کس درخت کی لکڑی سے بنی تھی؟ وغیرہ۔

7.2.2.2. تفسیر بالماثور کی بعض ابتدائی تفسیریں

بعد کے ادوار میں بھی اس طرز (تفسیر بالماثور) پر تفسیریں مرتب کی جاتی رہیں، جن میں سے بعض نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ ذیل میں چند تفاسیر پیش کی جارہی ہیں:

1. **جامع البیان عن تاویل آ القرآن:** امام ابن جریر طبری (م:310) کی یہ تفسیر "تفسیر طبری" کے نام سے معروف ہے۔ امام ابن جریر طبری کو مفسرین کے نزدیک بہت بلند مقام حاصل ہے۔ آپ کی تفسیر کو تفسیر بالماثور کا اولین مصدر اور ماخذ شمار کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی تفسیر بالرائے میں بھی اس تفسیر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس تفسیر کی خصوصیات کا تفصیلی مطالعہ آپ اگلی اکائی میں کریں گے۔

2. **تفسیر بحر العلوم:** زیر نظر تفسیر ابو اللیث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی (م: 373ھ) کی مرتب کردہ ہے، جو تفسیر ابو اللیث سمرقندی کے طور پر جانی جاتی ہے۔ امام سمرقندی نے اپنی اس تفسیر کے شروع میں ایک مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں علمائے متقدمین کی روایات کی روشنی میں علم تفسیر کی اہمیت و فضیلت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ جسے عربی زبان وادب اور اسباب

نزول وغیرہ کا اچھی طرح علم نہ ہو اس کے لئے قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنا ناجائز ہے۔ امام سمرقندی جب کسی آیت کی تفسیر میں روایتیں نقل کرتے ہیں تو اس میں پوری سند ذکر کرنے کا التزام نہیں کرتے، بلکہ اختصار کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔

3. معالم التنزیل: یہ تفسیر ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی (م:510ھ) کی مرتب کردہ ہے، جو "تفسیر بغوی" کے نام سے معروف ہے۔ یہ تفسیر بالماثور کی اہم تفسیر شمار کی جاتی ہے کیونکہ اس میں امام بغوی نے قرآنی آیات کی تفسیر میں صرف صحیح اور مستند روایات کو نقل کرنے کا التزام کیا ہے۔ اس تفسیر کا اختصار شیخ تاج الدین ابو نصر عبد الوہاب بن محمد حسینی (م:875ھ) نے تیار کیا ہے۔

4۔ تفسیر القرآن العظیم: یہ "تفسیر ابن کثیر" کے نام سے معروف ہے۔ حافظ ابن کثیر کا پورا نام "عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمرو بن کثیر" (م:774ھ) ہے۔ تفسیر بالماثور پر جن تفاسیر نے شہرت دوام حاصل کیا ان میں تفسیر ابن کثیر کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ تفسیر اس اعتبار سے نمایاں وصف کی حامل ہے کہ حافظ ابن کثیر نے اس میں تفسیر بالقرآن کا خاص اہتمام کیا ہے، لہٰذا اگر کسی آیت کی تفسیر قرآن کی کسی دوسری آیت سے ہو رہی ہو تو اسے ضرور ذکر کرتے ہیں۔ جب کسی آیت کی تفسیر قرآن کی دوسری آیتیں نہیں کر رہی ہوتی ہیں تو پھر اس کی تفسیر میں رسول اللہ کی احادیث اور آثار صحابہ نقل کرتے ہیں۔ ان روایات کو نقل کرنے کے بعد ان کی اسانید پر قابل اعتبار اور نا قابل اعتبار ہونے کی بنیاد پر کلام بھی کرتے ہیں۔

7.2.3 تدوین تفسیر کا تیسرا مرحلہ

تفسیر کے اس تدوینی مرحلہ میں جبکہ تفسیر قرآن کی تدوین کا آغاز ہو چکا تھا اور اس کی ایک بڑی تعداد منظر عام پر آچکی تھی، اور ساتھ ہی اس نے ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس دور میں سابقہ طرز تفسیر کے مقابلہ یہ ایک نمایاں فرق رونما ہوا کہ قرآن کریم کی تفسیر بیان کرتے ہوئے احادیث وآثار کے ساتھ عقل و فہم کو بھی بروئے کار لایا جانے لگا۔ گویا "تفسیر بالماثور" کے بعد اب یہاں سے "تفسیر بالرائے" کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ اس کی بنیادی اور اہم ترین وجہ یہ تھی کہ اس دور میں جب کہ اسلام حدود عرب سے باہر نکل کر اپنی حقانیت کے ڈنکے بجانے لگا تھا اور لوگ بڑی تعداد میں حلقہ بگوش اسلام ہوتے جا رہے تھے، اس کے پہلو بہ پہلو غیر اسلامی نظریات بھی اپنی راہ بناتے جا رہے تھے اور اس کی اشاعت کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ فرقہ پرستی، الحاد، انکار حدیث، عقلیت پسندی جیسے فتنوں اور معتزلہ، مرجیہ، قدریہ اور دیگر باطل فرقوں کا اسی دور میں ظہور ہوا تھا اور انہوں نے قرآنی آیات ہی کی آڑ میں اپنے نظریات کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا اس دور کے مفسرین نے تفسیر قرآن کریم کے دوران ان افکار و نظریات کی تردید کو بھی دین کی حفاظت کا طریقہ سمجھا، چنانچہ تفسیر قرآن کریم کے دوران جہاں کسی آیت کی تفسیر دوسری آیات یا احادیث وآثار سے کی جاتی وہیں عقل و فہم کے ذریعہ بھی اس کی تشریح وتوضیح کی کوشش کی جاتی تھی، اور اس کے ساتھ ہی باطل افکار وخیالات کی تردید کی بھی کوششیں کرتے تھے۔ ابو عمرو بن العلاء، امام شعبہ، سفیان ثوری، امام مالک بن انس، یونس بن حبیب، وکیع بن الجراح اور دیگر افراد نے تفسیر کے مخصوص موضوعات پر کتابیں لکھیں، اسی طرح محدث سفیان بن عیینہ نے عقل پرستوں کے نظریات کی تردید کے لئے ایک مستقل کتاب "جوابات القرآن" کے نام سے لکھی۔ اور پھر بعد میں انہیں عقل پسندوں کی وجہ سے کلامی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے اور علم کلام کا آغاز ہوا،

اور پھر اس موضوع پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔

اسی طرح اسلامی حدود مملکت کی وسعت کے پیش نظر یہ ضرورت بھی پیش آئی کہ اس کے لئے مذہب اسلام کے احکام کو واضح کیا جائے اور اس کی تشریح و تفصیل لوگوں کے سامنے آئے، چنانچہ احکام القرآن پر تفسیریں لکھنے کا آغاز ہوا۔ پھر اسلامی فقہ نے بھی مستقل فن کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس کے مذاہب و مسالک ظاہر ہونے لگے تھے، اس کے ساتھ ہی عربی گرامر (صرف و نحو) اور عربی لغت کی تدوین کا بھی اسی دور میں آغاز ہوا تھا، فلسفہ و منطق کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ چنانچہ ان سبھی موضوعات کو بنیاد بنا کر تفسیریں مرتب کی جانے لگیں۔ مفسرین عام طور پر اپنے ذاتی رجحان اور اپنی لیاقت کی بنیاد پر ایک یا دو یا اس سے زیادہ موضوعات کو منتخب کر کے اپنی تفسیریں تیار کرتے تھے۔ یہ سب اگرچہ کتاب و سنت اور آثار صحابہ و تابعین کی روشنی ہی میں انجام پاتی تھیں، لیکن چونکہ ان میں عقل و فہم کا عمل دخل نسبتاً زیادہ ہوتا تھا، لہٰذا اس قسم کی تفسیر کو "تفسیر بالرائے" کا نام دیا گیا۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس طرز پر جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں مصنف کے ذاتی رجحانات کی چھاپ زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ بسا اوقات ان تفاسیر میں اس قسم کے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں کہ مصنف کسی آیت کی ایک تفسیر بیان کرتا ہے بعد ازاں اس کی تائید و توثیق میں احادیث و آثار لاتا ہے اور جو احادیث و آثار اس کی بیان کردہ تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتے ان کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرز تفسیر پر بے شمار تفسیریں لکھی گئیں، جن کو شمار کر پانا محال ہے۔

7.2.3.1. تفسیر بالرائے کی بعض ابتدائی تفسیریں

ذیل میں تفسیر بالرائے پر لکھی گئی بعض تفاسیر کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے:

1. **مفاتیح الغیب:** یہ امام فخر الرازی کی مرتب کردہ تفسیر ہے۔ یہ تفسیر "تفسیر الکبیر" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس تفسیر کی کئی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس تفسیر کے بارے میں بھی تفصیلی مواد آگے کی اکائی میں آئے گا۔

2. **انوار التنزیل واسرار التاویل:** یہ تفسیر "تفسیر بیضاوی" کے نام سے زیادہ جانی جاتی ہے۔ اسے ابو الخیر ناصر الدین عبد اللہ بن عمر بن محمد بیضاوی (م: 691ھ) نے مرتب کیا ہے۔ آپ مسلکاً شافعی تھے اور شیراز کے قاضی القضاۃ تھے۔ امام بیضاوی نے اپنی اس تفسیر کی تحریر میں بہت دقیق اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس میں انہوں نے مختلف قرأتوں کا تذکرہ کیا ہے جس میں قرأت متداولہ کے ساتھ قرأت شاذہ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ نحوی مسائل کو بھی زیر بحث لایا ہے، شافعی مسلک کی تائید کرتے ہوئے فقہی احکام و مسائل کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

3. **مدارک التنزیل وحقائق التاویل:** یہ تفسیر "تفسیر نسفی" کے طور پر معروف ہے، اور خود مفسر ابو البرکات نسفی کے طور پر مشہور و معروف ہیں، حالانکہ ان کا اصل نام عبد اللہ بن احمد بن محمود ہے۔ امام نسفی نے اپنی اس تفسیر کو عربی زبان وادب کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کیا ہے۔ انہوں نے اس کے لئے تفسیر بیضاوی اور تفسیر کشاف سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

4. **لباب التاویل فی معانی التنزیل:** اس تفسیر کو تفسیر خازن کے نام سے شہرت حاصل ہے۔ اس کے مرتب علاء الدین ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم ہیں۔ مؤلف نے اس تفسیر کو مرتب کرنے کے لئے سابقہ تفاسیر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

7.3 برصغیر ہندوپاک میں تفسیر قرآن کریم

عرب وہند تعلقات بہت پرانے ہیں۔ اسی بنا پر عرب میں اسلام کی اشاعت کے بعد بہت جلد ہی ہندوستان میں بھی اسلام کے چرچے ہونے لگے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ اسلامی علوم وفنون بھی ہندوستان آئے تھے، جن میں سب سے زیادہ قابل قدر خود قرآن کریم ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے قرآن کریم کی خدمت میں کوئی کمی نہ چھوڑی، ہر دور میں انہوں نے اس ضمن میں بے شمار اور بیش بہا تفسیریں اور اس کے متعلقات پر کتابیں تحریر کیں۔ اس سلسلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کو قرآن کریم کی خدمت کا پہلا موقع بالکل ابتدائی زمانہ ہی میں ہاتھ آگیا تھا۔ 270ھ میں ایک ہندوراجہ مہروک بن رائق کی خواہش پر منصورہ کے امیر عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز نے ایک مقامی مسلمان عالم سے قرآن کریم کا وہاں کے مقامی زبان میں ترجمہ کرایا تھا۔ بعد ازاں پانچویں صدی ہجری میں جن اشخاص نے قرآن کے موضوع پر خدمات انجام دیں ان میں سید محمد اسماعیل بخاری لاہوری کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مخلص بن عبد اللہ دہلوی (م:766ھ) نے ایک تفسیر "کشف الکشاف" کے نام لکھی تھی۔ نظام الدین قمی نیشاپوری (م:730ھ) جو اصلاً ایران کے رہنے والے تھے اور بعد میں دولت آباد آکر اقامت پذیر ہو گئے تھے، انہوں نے پہلی مرتبہ آٹھویں صدی ہجری میں قرآن کریم کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔ امیر تاتار خان دہلوی (م: 799ھ) نے "تفسیر تاتارخانی" کے نام سے ایک تفسیر مرتب کی تھی۔ شیخ اشرف جہانگیر سمنانی (م:808ھ) نے ایک تفسیر "نور بخشیہ" کے نام سے تحریر کی تھی۔ حضرت گیسو دراز (م: 825ھ) نے تفسیر کشاف پر حاشیہ لکھا تھا۔ شیخ احمد بن علی المہائمی (م:836ھ) نے "تفسیر رحمانی" کے نام سے ایک تفسیر لکھی۔ "بحر مواج" کے نام سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م:840ھ) نے فارسی زبان میں تفسیر تحریر کی تھی۔ آنحضور ﷺ کی محبت میں ہر وقت سرشار رہنے والے عاشق رسول خواجہ حسین ناگوری (م: 901ھ) نے ایک تفسیر "نور النبی" کے نام سے لکھی تھی۔ اسی طرح ایک اور عاشق رسول شیخ حسن محمد المعروف بہ شیخ احمد گجراتی (م:982ھ) "تفسیر محمدی" کے نام سے ایک تفسیر مرتب کی تھی۔ دسویں صدی ہجری کے آخر میں "مجمع البحرین" کے نام سے شیخ طاہر سندھی برہانپوری نے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھی تھی۔ ان کے بعد ایک اہم نام شیخ ملا احمد جیون (م:1130ھ) کا آتا ہے، یہ اورنگ زیب عالمگیر کے استاذ تھے۔ انہوں نے تفسیر کے موضوع پر ایک اہم کتاب "تفسیرات الاحمدیہ" کے نام سے مرتب کی تھی۔

بعد میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م:1176ھ) کے گھرانہ نے اس کام کو بڑے پیمانہ پر آگے بڑھایا، اور خود شاہ صاحب نے مکمل قرآن کریم کا فارسی زبان میں "فتح الرحمن" کے نام سے ترجمہ فرمایا اور مختلف مقامات پر مختصر تفسیر بھی درج کی۔ شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادہ شاہ عبد العزیز (م:1239ھ) نے بھی فارسی زبان ہی میں ایک تفسیر "فتح العزیز" کے نام سے لکھی تھی جو "تفسیر عزیزی" کے نام سے معروف ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دوسرے صاحبزادہ شاہ رفیع الدین نے اردو زبان میں قرآن کریم کا لفظی ترجمہ کیا تھا۔ پھر تیسرے صاحبزادہ شاہ عبد القادر دہلوی نے والد بزرگوار کی فارسی زبان کی تفسیر "فتح الرحمن" کو اردو کے بامحاورہ قالب میں ڈھالا، بعض مقامات پر اردو زبان میں تفسیریں بھی لکھیں۔ اردو کا یہ قالب "موضح القرآن" کے نام سے معروف ہوا۔ شاہ صاحب کے گھرانہ کی ان خدمات قرآن کے بعد مسلمانان ہند نے اس باب میں گراں قدر خدمات انجام دیں، جن میں نواب صدیق حسن خان (م:1307ھ) کی فتح

القدیر، فتح البیان اور نیل المرام، مولانا ابو محمد عبد الحق حقانی (م: 1335ھ) کی فتح المنان، مولانا احمد حسن دہلوی (م: 1338ھ) کی احسن التفاسیر، مولانا احمد رضا خان بریلوی (م: 1340ھ) کی کنز الایمان وخزائن الفرقان، مولانا اشرف علی تھانوی (م: 1362ھ) کی بیان القرآن، مولانا ثناءاللہ امرتسری (م: 1367ھ) کی تفسیر ثنائی، خواجہ حسن نظامی (م: 1373ھ) کی عام فہم تفسیر قرآن، مولانا ابوالکلام آزاد (م: 1378ھ) کی ترجمان القرآن، مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری (م: 1380ھ) کی تفسیر الحسنات، مفتی احمد یار خان نعیمی (م: 1391ھ) کی تفسیر نعیمی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی (م: 1394ھ) کی معارف القرآن، مفتی محمد شفیع (م: 1396ھ) کی معارف القرآن، مولانا عبد الماجد دریابادی (م: 1397ھ) کی تفسیر ماجدی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی (م: 1399ھ) کی تفہیم القرآن، مولانا امین احسن اصلاحی (م: 1418ھ) کی تدبر قرآن، مولانا پیر کرم شاہ ازہری (م: 1419ھ) کی ضیاء القرآن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر اور اہمیت کے حامل ہیں۔

7.4 تفسیر قرآن کے مصادر

قرآن مجید چوں کہ اللہ کا کلام ہے، اس لیے اس کی تشریح وتوضیح میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے؛ اسی لیے وہ مآخذ ومصادر متعین ہیں، جن کی مدد سے قرآن مجید کی تفسیر کی جاسکتی ہے، یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر ہر شخص کو اپنی رائے اور قیاس پر توضیح قرآن کا حق دے دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ اس سے قرآن مجید میں معنوی تحریف کا راستہ کھل جائے، اسی لیے ان مراجع اور ماخذ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، جن کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی جائے گی، یہ مآخذ سات ہیں جن میں سے پہلے پانچ معتبر ہیں اور آخری دو نا معتبر مانے جاتے ہیں:

1- قرآن مجید　　2- حدیث نبوی　　3- آثار صحابہ　　4- عربی زبان　　5- عقل سلیم

6۔ اسرائیلی روایات　　7۔ رائے

7.4.1 قرآن سے قرآن کی تفسیر

پہلا درجہ ظاہر ہے کہ قرآن کا ہے، یعنی قرآن کی تشریح خود قرآن سے کی جائے، جو لوگ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں اور قرآن پر ان کی وسیع نظر ہو گئی ہے، ان کو اس کا خوب اندازہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتیں ایک دوسرے کی تفسیر وتوضیح ہیں، پس قرآن مجید کی ایک آیت کی وہ تشریح سب سے اہم ہے جس کو دوسری آیت بیان کرتی ہے، قرآن مجید کی ایک آیت سے دوسری آیت کی تفسیر و تشریح کی مختلف صورتیں ہیں:

1۔ قرآن کی ایک آیت میں کوئی بات اجمال کے ساتھ کہی گئی، دوسری آیت نے اس کو واضح کر دیا، جیسے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ "(بقرہ: 37)۔ (حضرت آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی)۔

یہ کلمات جو حضرت آدمؑ نے سیکھے تھے، کیا تھے؟ اس آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے؛ لیکن دوسری آیت اس کو واضح کرتی ہے، چنانچہ ایک اور موقع پر اللہ کا ارشاد ہے: ''قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ '' (اعراف:23)۔ (آدم و حوا نے کہا: پروردگارا! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کرلیا ہے اور اگر آپ نے معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہیں فرمایا تو ہم ضرور نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے)۔ اس آیت نے واضح کر دیا کہ پہلی آیت میں کلمات سے یہی دُعا مراد ہے۔

2. کبھی ایک جگہ مشترک لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جس میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہے، دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ یہاں لفظ مشترک کا کونسا معنی مراد ہے؟ جیسے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ''(حج:29)۔ (اور چاہئے کہ ''بیت عتیق'' کا طواف کریں)۔ ''عتیق'' کے معنی قدیم اور پرانے کے ہیں، اس طرح اس آیت کے معنی ہوئے کہ ''قدیم گھر کا طواف کرنا چاہیے''---- قدیم گھر متعدد ہو سکتے ہیں اور کسی بھی گھر کا نام ''بیت عتیق'' رکھا جا سکتا ہے، قرآن مجید کی ایک اور آیت ''بیت عتیق'' کی مراد کو واضح کرتی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ''إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا ''(آلِ عمران:96)۔ (بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے [عبادت کی غرض سے بنایا گیا] مکہ میں ہے، جو برکت والا ہے)۔ معلوم ہوا کہ بیت عتیق --- جس کے طواف کا حکم دیا گیا ہے --- سے مراد مکہ میں تعمیر ہونے والا ''کعبۃ اللہ'' ہے، جو عبادت الٰہی کے لیے تعمیر ہونے والا سب سے قدیم گھر ہے۔

3. بعض دفعہ ایک جگہ کوئی حکم کسی قید کے بغیر مطلقاً مذکور ہوتا ہے، دوسری جگہ وہی حکم قید کے ساتھ مذکور ہوتا ہے، اس سے وضاحت ہوتی ہے کہ یہ حکم قید کے ساتھ ہے بلا قید کے نہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ ''(مائدہ:3)۔ (تم پر مردار اور خون حرام کیے گئے ہیں)۔ دوسری جگہ حرام اشیا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا ''(انعام:145)۔ (یا بہتا ہوا خون)--- معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں بھی مطلق خون مراد نہیں ہے؛ بلکہ بہتا ہوا خون مراد ہے۔

4. بعض دفعہ ایک آیت میں کوئی نامانوس لفظ استعمال ہوتا ہے، دوسری آیت میں اس مفہوم کو معروف و متداول لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس طرح ایک لفظ سے دوسرے لفظ کی تشریح ہو جاتی ہے، جیسے '': وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ ''(حجر:74)۔ (اور ہم نے ان پر کنکر کے پتھر برسائے)۔ اس میں ''سجیل'' سے مراد ہے: مٹی سے بنا ہوا کنکر --- یہ بات ''لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ طِينٍ ''(ذاریات:33) سے واضح ہوتی ہے۔

5. کبھی ایک جگہ کسی واقعہ کو اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے، جیسے :''وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَى أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ ''(بقرہ:51) (اور وہ وقت بھی یاد کیے جانے کے لائق ہے، جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ لیا، پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا)۔ دوسری جگہ چالیس راتوں کی تفصیل ہے کہ پہلے تیس راتوں کے اعتکاف کا حکم دیا گیا، پھر اس پر دس راتوں کا اضافہ کیا گیا: ''وَوَاعَدْنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ''(اعراف: 142)۔

6. کبھی ایک جگہ کوئی حکم عموم کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ اس کی تخصیص کی جاتی ہے، جیسے: رؤیت اللہ تعالیٰ کے بارے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی: ''لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ''(انعام:103)۔[وہ ایسا ہے کہ] نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے اور وہ بھید جاننے والا خبر دار ہے)۔ اس آیت مبارکہ میں دیدار الٰہی کی عمومی نفی کی گئی ہے، لیکن دیگر آیات میں اہل جنت کی تخصیص کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ''وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ○ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ''(قیامہ:22-23)۔(اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔[اور] اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے)

7. قرآن سے قرآن کی تفسیر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض کلماتِ قرآن کے سلسلہ میں ایک سے زیادہ قرأتیں منقول ہیں، ان میں ایک قرأت دوسری قرأت کی مراد متعین کرنے میں معاون ہوتی ہے؛ جیسے: کفارہ قسم کے سلسلہ میں فرمایا گیا: ''فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ'' (مائدہ:88) یعنی پس تین دن روزہ رکھنا ہے--- حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں ''**فصيام ثلاثة أيّام متتابعات**'' ہے۔ یعنی پس تین دن لگاتار روزہ رکھنا ہے۔ اس سے یہ بات اخذ کی گئی ہے کہ کفارہ کے یہ تین روزے مسلسل رکھے جانے ضروری ہیں۔ اسی طرح قرآن کی بہت سی آیتیں ہیں، جو ایک دوسرے کی تشریح کرتی ہیں۔

7.4.2 حدیث سے تفسیر

تفسیر کا دوسرا ماخذ حدیث نبوی ہے، رسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی بعثت کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا کہ آپ اپنے قول و عمل کے ذریعہ قرآن مجید کی توضیح فرمائیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ''۔(نحل:44)۔(اور ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل فرمایا ہے کہ جو باتیں ان کی طرف نازل کی گئی ہیں، انہیں آپ ان پر واضح فرمادیں)۔

اس لیے حقیقت یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا سب سے بڑا ماخذ 'حدیث' ہے اور جن کتابوں کو 'تفسیر بالماثور' کی کتابیں کہا جاتا ہے، انہیں دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ قرآن مجید کی تشریح و توضیح میں حدیث کا کتنا اہم کردار ہے۔

حدیث سے قرآن کی توضیح کی چند بنیادی صورتیں یہ ہیں۔

1. قرآن میں بہت سے احکام نہایت اجمال کے ساتھ بیان کیے گیے ہیں اور ان کی کیفیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، حدیث اس اجمال کی توضیح کرتی ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ''(بقرہ:43)۔(نماز قائم کرو اور زکوۃ دو)، لیکن کیفیاتِ نماز اور احکام زکوٰۃ کی تفصیل حدیث کے بغیر متعین نہیں ہو سکتی۔

2. قرآن مجید میں بعض اشیا کا بھی مبہم ذکر فرمایا گیا ہے؛ جیسے : ''إِنَّآ أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ''(کوثر:1)۔(ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ہے)۔ اب اس آیت میں ''کوثر'' سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت حدیث سے ہوتی ہے، کہ یہ ایک خاص حوض ہے، جس سے میدان حشر میں آپ اپنی اُمت کو پانی عنایت فرمائیں گے۔

3. قرآن میں بہت سے عددی اشارات ہیں، ان کی توضیح ہمیں حدیث کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی، مثلاً: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ''(توبہ:40)۔(دو میں کا دوسرا جب وہ دونوں غار میں تھے)۔ اب یہ بات کہ ثانی اثنین سے حضرت ابو بکرؓ مراد تھے، حدیث ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔

4. قرآن میں بعض واقعات کی طرف مبہم اشارہ کیا گیا ہے، حدیثیں یہ بتاتی ہیں کہ اس کی مراد کیا ہے اور صاحب واقعہ کون ہیں؟ جیسے: ''عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ ○ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ ''(عبس:1-2)۔(پیشانی شکن آلود ہو گئی اور چہرہ پھیر لیا۔ کہ ان کے پاس نابینا آگیے)۔ اب یہ بات کہ حضور ﷺ کی پیشانی پر شکن آگیا اور آنے والے نابینا حضرت عبد اللہ بن مکتومؓ تھے، ہمیں حدیث ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

5. قرآن مجید کے بعض الفاظ ایسے ہیں، جن میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہے، حدیث اس احتمال کو متعین کرتی ہے، جیسے ارشاد ہے: ''حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ ''(بقرہ:238)۔(نمازوں اور] خاص کر] درمیانی نماز کی پابندی کرو۔ چوں کہ نمازیں پانچ ہیں، اس لیے ہر نماز بقیہ نمازوں کی نسبت سے درمیانی نماز ہے، اب سوال یہ ہے کہ 'صلوۃ وسطیٰ' سے کونسی نماز مراد ہے؟ حدیث نے بتایا کہ اس سے نماز عصر مراد ہے۔

6. کبھی قرآن مجید میں وارد ہونے والا کوئی لفظ اپنی مراد کے اعتبار سے نامانوس ہوتا ہے، حدیث سے اس کا مصداق متعین ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:'' وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا''(بقرہ:114)۔(ہم نے تم لوگوں کو اُمت وسط بنایا)۔ یہاں ''وسط'' سے کیا مراد ہے؟ یہ وضاحت طلب ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی تشریح ''عدل'' سے فرمائی، یعنی اُمت محمد یہ عدل و اعتدال کی حامل اُمت ہے۔ ''الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ ''(انعام:82)۔(جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، ان ہی کے لیے[آخرت کا]امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)۔ قرآن کی زبان میں ہر گناہ ظلم ہے، تو بظاہر اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو ایمان کے ساتھ کسی بھی گناہ کا مرتکب ہو، وہ آخرت کے امن کو نہیں پا سکتا، ظاہر ہے یہ ایسی بات ہے کہ اس کے بعد کسی بھی انسان کی نجات دشوار ہے، اس لیے صحابہ کو اس سے بہت گرانی ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے اس کی مراد واضح فرمائی کہ یہاں ظلم سے شرک مراد ہے، جو سب سے بڑا گناہ ہے اور اس کے لیے قرآن مجید ہی کی آیت پیش فرمائی:''إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ''(لقمان:13)۔ترجمہ: بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

7. بعض واقعات کی طرف قرآن مجید میں محض اشارہ کر دیا گیا ہے، حدیث کے ذریعہ ہمیں ان واقعات کی تفصیل معلوم ہوتی ہے، جیسے: واقعہ اسراو معراج، اصحابِ اخدود کا قصہ، وغیرہ۔

7.4.3 تفسیر اور آثارِ صحابہ

تفسیر کا تیسرا ماخذ، صحابہ کے اقوال وارشادات ہیں، جس شخص نے ایمان کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو اور اسلام ہی پر اس کی موت ہوئی ہو، اس کو "صحابی" کہتے ہیں --- صحابہ نے چوں کہ براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے دین کو سیکھا اور سمجھا ہے؛ اس لیے قرآن وحدیث کی تشریح وتوضیح میں ان کی وضاحتوں اور اقوال کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور جن آیات کی تفسیر میں قرآن وحدیث سے روشنی نہیں ملتی ہو، ان میں صحابہ کے اقوال تفسیر کا سب سے اہم ماخذ ہیں۔ صحابہ کے تفسیری اقوال تین طرح کے ہیں:

(الف) ایسے اقوال جن میں ذاتی قیاس واجتہاد کی گنجائش نہ ہو اور غالب گمان ہو کہ انہوں نے اسے نبی ﷺ سے سن کر ہی نقل کیا ہو گا۔

(ب) وہ اقوال جن میں ذاتی اجتہاد و قیاس کی گنجائش ہو۔

(ج) وہ اقوال جو پچھلی اقوام سے متعلق ہوں اور اس بات کا امکان ہو کہ انہیں اہل کتاب سے سنا گیا ہو گا۔

(الف) پہلی قسم کے تفسیری اقوال معتبر ہیں اور حدیث کے درجہ میں ہیں، اس کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں: حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے قرآن مجید کی آیت "لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى" (نجم: 18)۔ (بیشک انہوں نے [معراج کی شب] اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں)، کے سلسلہ میں فرمایا کہ اس سے "سفید رفرف" مراد ہے، جو پورے اُفق پر چھا گیا تھا۔

" فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى ○ فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى" (نجم: 9-10)۔ (پھر رہ گیا فرق دو کمان کے برابر یا اس سے بھی نزدیک)، کے سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ہی کی روایت ہے کہ اس سے حضرت جبرئیل مراد ہیں، آپ ﷺ نے ان کو اپنی اصل شکل میں دیکھا؛ جب کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔

اس طرح کے بہت سے تفسیری اقوال ہیں، جن میں اجتہاد کو دخل نہیں اور بہ ظاہر یہ رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہی انہوں نے فرمایا ہو گا، ایسے اقوال اگر مستند طور پر ثابت ہوں تو وہ حدیث کے درجہ میں ہیں اور حجت ہیں۔ صحابہ کی تفسیر مختلف جہتوں سے قرآن مجید کے سمجھنے میں معاون بنتی ہے۔

1. کبھی اس سے مبہم ومجمل مضامین کی وضاحت ہوتی ہے؛ جیسے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "هَذَانِ خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ" (حج: 19)۔ (یہ دو فریق ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا)۔ حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا: یہ آیت غزوۂ بدر میں حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہ بن حارثؓ کے عتبہ، شیبہ اور ولید کے مقابلہ نکلنے کے سلسلہ میں ہے۔

2. مضامین قرآن کو سمجھنے میں ان واقعات کی بڑی اہمیت ہے، جن کے پس منظر میں آیات نازل ہوئی ہیں، اس سلسلہ میں آثار صحابہ سے بڑی روشنی ملتی ہے، مثلاً: ''إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ '' (احزاب: 10)۔(جب کہ دشمن تمہارے پاس اوپر سے اور نیچے سے چڑھ آئے اور جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منھ کو آ گیے)۔ اس آیت میں کس موقع کا نقشہ کھینچا گیا ہے؟ یہ ہمیں حضرت عائشہؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس میں غزوۂ خندق کے زمانہ کا ذکر ہے۔

3. قرآن مجید کی بہت سی آیات کسی خاص واقعہ کی وجہ سے نازل ہوئی ہیں، اگرچہ ان آیات میں دیئے گیے احکام عام ہیں اور انہیں واقعات کے ساتھ خاص نہیں ہیں، تاہم ان واقعات سے آیت کا مفہوم سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے، ان کو اصطلاح میں ''سببِ نزول'' یا ''شانِ نزول'' کہا جاتا ہے، ان کی بھی تفسیر میں خاص اہمیت ہے، زیادہ تر اسبابِ نزول صحابہ ہی سے منقول ہیں۔

غرض کہ آثار صحابہ تفسیر قرآن کے لیے ایک اہم ماخذ ہے، اسی لئے جو کتابیں 'تفسیر بالماثور' کے منہج پر لکھی گئی ہیں، ان میں کثرت سے صحابہ کے آثار نقل کیے گیے ہیں اور اگر صحابہ کے تفسیری اقوال معتبر سندوں سے نقل کیے گیے ہوں تو وہ تفسیر میں معتبر و مقبول ہیں۔

(ب) صحابہ کے بعض تفسیری اقوال ان اُمور سے متعلق ہیں، جن میں قیاس و اجتہاد کی گنجائش ہے، یہ اقوال حجت نہیں ہیں، مثلاً: حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے سورہ نصر کے بارے میں فرمایا کہ اس میں ''فتح'' سے فتح مکہ مراد ہے اور اشارہ ہے کہ اب آپ ﷺ کی وفات کا وقت قریب آ چکا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا اجتہاد ہے۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ صحابہ نے کوئی بات پچھلی اقوام یا کتابوں سے متعلق کی ہو، یہ حجت نہیں ہے؛ البتہ اگر اس کا مضمون کتاب و سنت کے مغائر نہیں ہو تو اسے قبول کیا جا سکتا ہے، مثلاً: ''فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ '' (مائدہ: 26)۔(وہ [بیت المقدس] ان پر چالیس سال کے لئے حرام ہے، وہ زمین میں بھٹکتے رہیں گے۔ کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے تفصیل منقول ہے کہ اس وقت جن لوگوں کی عمر بیس سال تھی، ان لوگوں کا میدان تیہ میں انتقال ہو گیا، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی بھی وفات ہو گئی اور حضرت یوشع نے بیت المقدس کو فتح کیا---اسی نوعیت کی روایت ہے، چوں کہ اس تفصیل کا کتاب و سنت سے تعارض نہیں ہے، اس لئے اس کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

7.4.4 تفسیر اور عربی زبان و لغت

تفسیر کا چوتھا ماخذ 'عربی زبان و لغت' ہے، قرآن مجید عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، عربی لغت اور عربی قواعد کے محاورات کے بغیر قرآن مجید کو سمجھا نہیں جا سکتا؛ اس لیے ظاہر ہے کہ عربی زبان تفسیر قرآن کا ایک اہم ترین ماخذ ہے؛ لیکن اگر خود قرآن مجید کی کسی آیت سے یا حدیث اور صحابہ کے متفقہ قول سے معلوم ہو کہ کوئی لفظ اپنے معنی لغوی میں استعمال نہیں ہوا ہے، تو وہاں لغوی معنی پر وہ تشریح مقدم ہو گی، جو قرآن و حدیث اور آثار صحابہ سے ثابت ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا '' (بقرہ: 69)۔

اہل علم نے ''صفراء'' کا ترجمہ نہایت زرد رنگ سے کیا ہے؛ لیکن بعض حضرات نے نہایت سیاہ سے بھی اس کا ترجمہ کر دیا ہے، یہ عربی زبان سے ناواقفیت کی بنیاد پر ہے، علامہ طبری فرماتے ہیں کہ اگر اونٹ کے لئے ''صفراء'' کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے سیاہ اونٹ مراد ہوتے ہیں؛ کیوں کہ اس کی سیاہی زردی مائل ہوا کرتی ہے، بر خلاف بقرہ (گائے) کے، کہ اس کی صفت ''صفراء'' لائی جائے تو زرد رنگ ہی مراد ہوتا ہے۔

7.4.5 تفسیر اور عقل سلیم

تفسیر قرآن کا پانچواں ماخذ 'عقل سلیم' ہے، بہت سی آیات کا مفہوم عقل اور اہل عقل کی تحقیق سے متعین ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بچہ کے رحم مادر میں ہونے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ''(زمر:6)۔([جنین] تین تاریک پردوں کے اندر ہوتا ہے)۔ حیرت انگیز طور پر آج کی سائنس یہ بتاتی ہے کہ جنین واقعی تین پردوں میں ہوتا ہے، پیٹ کی دیوار، رحم مادر کا پردہ اور بچہ دانی کی اندرونی جھلی، اس طرح کے بہت سے سائنسی حقائق ہیں، جنہوں نے قرآن کی بعض آیات کے سمجھنے کو آسان کر دیا ہے؛ لیکن اس میں دو باتیں نہایت اہم ہیں:

- اول یہ کہ ہر عقل، عقل سلیم نہیں ہوتی، اس لیے جو شخص جو کچھ سمجھ لے قرآن مجید کے الفاظ کو اس پر منطبق کرنے لگے، یہ درست نہیں ہے؛ کیوں کہ انسان کی عقل ٹھوکر کھاتی رہتی ہے۔
- دوسرے یہ کہ قرآن کا اصل موضوع ہدایت ہے، یعنی انسان کو خدا سے جوڑنا اور اسے خدا کی مرضیات اور منہیات کے بارے میں بتانا؛ اس لیے بہ تکلف قرآن سے عقلی تصورات کو ثابت کرنا درست نہیں، ورنہ مستقبل میں اگر نظریات بدل جائیں اور گذشتہ فکر غلط ثابت ہو، تو قرآن مجید کی حقانیت کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

☆ تفسیر قرآن کے دو ایسے مآخذ کا ذکر بھی ضروری ہے جو نامعتبر ہیں:

7.4.6 اسرائیلی روایات

اسرائیلی روایات، اس سے مراد بائبل و تورات کے بیانات ہیں، چوں کہ قرن اول ہی میں بہت سے علما اہل کتاب نے اسلام قبول کیا تھا اور قرآن مجید میں متعدد ایسے واقعات موجود ہیں، جن کا ذکر تورات و انجیل میں بھی ہے، اس لیے بعض علما اسلام نے تفسیری معلومات میں اضافہ کے لیے اسرائیلی روایات کو شامل کر دیا اور بتدریج یہ غیر معتبر روایتیں تسلیم شدہ اقوال کے طور پر نقل ہوتی گئیں، اس سے تفسیر کے صاف و شفاف مواد کو بہت نقصان پہنچا اور بعض ایسی باتیں تفسیر کا حصہ بن گئیں، جو اسلامی تعلیمات کے بالکل مغائر ہیں، یا جن میں انبیاء کرام کی عظمت کو مجروح کیا گیا ہے، یا وہ عقل و مشاہدہ کے خلاف ہیں، اس لیے اسرائیلیات کے سلسلے میں علما کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ یہ روایات تین طرح کی ہیں:

1. وہ جن کا درست ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے، ---ان کو قبول کیا جائے گا۔

2. وہ جو قرآن وحدیث سے متعارض ہوں یا عقل کے خلاف ہوں،---ان کا اعتبار نہیں اور ان کو بلا تنقید نقل کرنا بھی درست نہیں۔

3. وہ اسرائیلی روایات ہیں جو نہ پہلی قسم میں داخل ہیں اور نہ دوسری قسم میں، ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے گا، نہ ہم اس کی تصدیق کرسکتے ہیں نہ تکذیب، اسرائیلیات کے بارے میں اس اُصول کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر ہے:

"**لا تصدقوا أهل الكتاب ولا تكذبوهم وقولوا آمنا باالله وما أنزل إلينا**" (صحیح بخاری)۔(اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو، نہ انہیں جھٹلاؤ، اور کہو ہم اللہ پر اور اللہ کی طرف سے ہم پر جو کتاب نازل ہوئی ہے، اس پر ایمان لائے)۔

7.4.7 تفسیر بالرائے

محض اپنی رائے کی بنا پر قرآن مجید کی تفسیر کی اجازت نہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :"**من قال في القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ**" (ترمذی)۔(جو شخص قرآن مجید میں اپنی رائے سے کلام کرے، اگر وہ صحیح بات بھی کہے، تب بھی اس نے غلطی کی)۔ اس حدیث میں ہر رائے کی مذمت کرنا مقصود نہیں ہے، جو رائے قرآن وحدیث کے مطالعہ، قواعد شرعیہ اور علم وتحقیق پر مبنی ہو وہ تو مطلوب ہے، یہاں رائے سے مراد "خود رائی" ہے۔ یعنی کوئی شخص پہلے سے کوئی رائے قائم کرلے اور بہ تکلف اسے قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرے؛ حالاں کہ قرآن وحدیث، آثارِ صحابہ اور عربی زبان ولغت اس رائے کے خلاف جاتے ہوں۔ درج ذیل چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

1. " وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ○ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ "(قیامہ:22-23)۔(اس دن چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے)۔ چوں کہ معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ اس دنیا میں ہوسکتا ہے نہ آخرت میں، اور اس آیت سے جنت میں دیدار الٰہی کا ثبوت مل رہا ہے؛ اس لیے انہوں نے "ناظرۃ" کا مفہوم بیان کیا کہ وہ اللہ کی طرف اُمید لگائے ہوں گے، یہ ظاہر ہے عربی لغت کے خلاف ہے۔

2. "وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا "(النساء:164)۔ اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے گفتگو کی۔ چوں کہ بعض لوگ اللہ کے انسان سے گفتگو کرنے کو محال سمجھتے ہیں؛ اس لیے انہوں نے یہاں " كَلَّمَ "کو" كَلَمٌ " سے ماخوذ ماناہے جس کے معنی زخم کے آتے ہیں، پھر اس آیت کی تشریح اس طرح سے کی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو مصائب کے ناخنوں اور فتنوں کے پنجوں سے زخمی کیا۔

3. اسی طرح روافض نے بہت سی آیات کی تشریح کی اور اس کے ظاہری معنی سے ہٹ کر اپنی فکر کی تائید کے لیے حسبِ خواہش تشریح کی؛ جیسے: "وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ "(بقرہ:35)۔([اے آدم وحوا!] تم دونوں اس درخت کے قریب بھی نہ جانا)۔ اس آیت میں جنت کے ممنوعہ درخت کا ذکر ہے؛ بعض روافض مفسرین کے نزدیک اس درخت کا نام "شجرۂ علم" ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آل بیتؓ کے لیے مخصوص ہے، دوسروں کو اس میں سے کھانے کی اجازت نہیں۔

جہاں قرآن مجید کے حفاظ اور قرا کے ذریعہ قرآن مجید کے الفاظ کی حفاظت ہوئی ہے، وہیں تفسیر کے سلسلہ میں مفسرین نے اخذ و استنباط کے جو اُصول مقرر کیے ہیں، ان سے قرآن مجید کے معانی کی حفاظت ہوئی ہے اور تحریف معنوی کا راستہ بند ہوا ہے۔

7.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- تفسیر قرآن کا آغاز نزول وحی کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔
- قرآنی آیات کی مراد کو سمجھنے کے لیے دوسری آیاتِ قرآنی، احادیث، صحابہ کے اقوال، عربی لغت اور عقل سلیم سے مدد لی جاتی ہے۔
- ایسی اسرائیلی روایات---جو قرآن مجید کی تعلیمات اور اسلام کی فکر سے متصادم ہوں---غیر معتبر ہیں، اسی طرح ایسی رائے کا بھی اعتبار نہیں، جس پر کوئی معتبر دلیل موجود نہ ہو۔
- تدوین تفسیر کے پہلے مرحلہ میں تفسیری روایات کتب احادیث میں جمع کی جاتی تھیں۔اس کے دوسرے مرحلہ میں تفسیر کی مستقل کتابیں مرتب کرنے کا آغاز ہوا، لیکن ان میں قرآنی آیات کی تفسیر قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور آثار صحابہ کے ذریعہ ہی کی جاتی تھی۔ان تفاسیر کو تفسیر بالماثور کے ضمن میں شمار کیا جاتا ہے۔تیسرے مرحلہ میں تفسیر کے موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس مرحلہ میں تفسیری کتابوں کو تفسیر بالرائے کے طرز پر مرتب کئے جانے کا آغاز ہوا۔
- تفسیری اقوال گڑھنے کے پیچھے بنیادی طور پر تین وجوہات تھیں: گروہی تعصب، سیاسی برتری اور جذبہ انتقام۔
- اسرائیلی روایات میں سے صرف وہی روایات قابل اعتبار ہیں جو شریعت کے مزاج اور مذاق سے ہم آہنگ ہیں۔
- برصغیر میں بھی تفسیر قرآن کریم کے باب میں گراں قدر خدمات انجام پائی ہیں۔ہندوستان میں اس کا پہلا ترجمہ 270ھ میں کیا گیا تھا۔

7.6 نمونہ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. اصول تفسیر کی رو سے قرآن کریم کی تفسیر سب سے پہلے کس کے ذریعہ کی جائے گی؟

(a). قرآن کریم (b). احادیث نبویہ ﷺ (c). آثار صحابہ (d). اجتہاد

2. تفسیر کا دوسرا ماخذ کیا ہے؟

(a). قرآن (b). فقہ (c). اجماع (d). حدیث

3. " ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ "سے کون مراد ہیں؟

(a). حضرت علیؓ (b). حضرت ابو بکرؓ (c). حضرت عثمانؓ (d). سب صحیح

4. تفسیر قرآن کا آغاز کب سے شروع ہوا تھا؟

(a) . صحابہ کے دور میں (b) . ہجرت کے ساتھ (c) . نزول وحی کے ساتھ (d) . تمام غلط

5. ''الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ''،اس آیت میں ''ظلم'' سے کیا مراد ہے؟

(a) . زیادتی (b) . گناہ (c) . شرک (d) . قتل وغارت

7.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. تفسیر بذریعہ قرآن کا کیا مطلب ہے؟ مثالوں کے ساتھ واضح کیجیے۔
2. تفسیر میں عربی زبان ولغت جاننے کی کیا اہمیت ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔
3. حدیث قرآن کی تشریح کرتی ہے، مثالوں سے واضح کیجیے۔
4. آثار صحابہ سے کیا مراد ہے؟
5. علم تفسیر کی ضمن میں نامعتبر مصادر کیا ہیں؟ مع وجوہات تحریر کیجیے۔

7.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. تدوین تفسیر کے مختلف مراحل پر ایک جامع مضمون قلمبند کیجیے۔
2. برصغیر پاک وہند میں تفسیر کا تاریخی جائزہ لیجیے۔
3. علم تفسیر کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے ماخذ پر تعریفی مضمون لکھیے۔

7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ التفسیر : ڈاکٹر عبد الصمد صارم ازہری
2. تذکرۃ المفسرین : قاضی محمد زاہد حسینی
3. علوم القرآن : مولانا محمد تقی عثمانی
4. تاریخ تفسیر ومفسرین : پروفیسر غلام احمد حریری
5. الاتقان فی علوم القرآن : علامہ جلال الدین سیوطی (اُردو ترجمہ)

معروضی سوالات کے جوابات

A	2.D	3.B	4.C	5.C

اکائی 8: اہم مناہج تفسیر: تفسیر بالماثور (جریر طبری) تفسیر بالرائے (امام رازی)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 تفسیری مناہج اور قسمیں

8.3 تفسیر طبری

8.3.1 امام طبری کا تعارف

8.3.2 تصانیف

8.4 تفسیر طبری کا تعارف

8.4.1 خصوصیات

8.4.2 سند پر بحث

8.4.3 جامع تفسیر

8.4.4 مقدمہ تفسیر

8.4.5 تفسیر طبری کا منہج

8.5 امام فخر الدین رازی

8.5.1 تصنیف و تالیف

8.6 تفسیر مفاتیح الغیب

8.6.1 اہم خوبیاں

8.6.2 سبب تالیف

8.6.3 تفسیر کبیر کے مفسرین

8.6.4 منہج تفسیر
8.6.5 تفسیر مفاتیح الغیب کے اردو ترجمے
8.7 اکتسابی نتائج
8.8 نمونہ امتحانی سوالات
8.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات
8.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات
8.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات
8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

آپ نے اس اکائی سے پہلے تفسیر کا تعارف اور اس کی تاریخ تدوین کا مطالعہ کیا۔ اب اس اکائی میں عربی کے اہم منہج اور ان کی دو اہم تفاسیر "جامع البیان عن تاویل القران"، اور "مفاتیح الغیب" سے آپ واقف ہوں گے۔ اس تفسیر سے پہلے اس کے مرتب امام رازی کے متعلق اختصار کے ساتھ آپ کو آگاہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ تفسیر کے تعارف، اہم خوبیاں، سبب تالیف، اس کے مفسرین اور منہج تفسیر کے متعلق تفصیل سے جانیں گے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ

- تفسیر طبری کا مطالعہ کرنا ہے، اس کے ذریعہ سے ہمیں تفسیر کی اہمیت، ان کی خصوصیات سے واقفیت حاصل ہو گی۔
- دونوں تفاسیر کے منہج اور طریقہ کار سے بھی واقف ہوں گے اور یہ بھی معلوم کر سکیں گے کہ ان سے استفادہ کا کیا طریقہ ہے اور تفسیری میدان میں ان دونوں تفاسیر کا کیا مقام ہے۔
- تفسیر بالرائے کے نہج پر لکھی گئی اہم عربی تفسیر "مفاتیح الغیب" سے آپ کو واقفیت حاصل ہو۔
- تفسیر کے مؤلف امام رازی کے حالات زندگی، علمی کمالات اور اہم علمی مشغولیات سے بھی واقف ہوں گے۔

8.2 تفسیری مناہج اور قسمیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر علاقے میں کتاب ہدایت اتاری اور ان کی تفہیم کے لیے

اپنے برگزیدہ بندوں کو بھی بھیجا۔ ان آسمانی کتابوں میں سب سے اہم اور آخری کتاب "قرآن کریم" کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ورسول حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پر اتارا۔ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ہر طریقہ سے اپنے امتیوں کو اس کتاب کو سمجھایا اور اس کی تعلیمات وہدایات پر عمل کر کے دکھایا، تاکہ امتیوں کے لئے ان کے معانی ومفاہیم اور مراد کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ ایک متعینہ مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو اپنے پاس بلالیا، لیکن آپؐ کی تعلیمات اور عملی نمونے قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیئے گیے، اور یہ فرمادیا گیا کہ اگر قرآن کریم اور آنحضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رہوگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ اس کے بعد صحابہ کرام نے ان تعلیمات اور عملی نمونوں کو بعد میں آنے والے لوگوں تک پہنچایا۔ پھر جیسے جیسے فتوحات کے ذریعہ اسلامی مملکت وسیع ہوتی گئی اور مختلف نظریات اور عقائد کے حاملین اسلام کے دائرہ میں آتے گیے، لوگوں کے درمیان نئے نئے مسائل ومشکلات پیش آتے گیے۔ جس کے نتیجہ میں علوم کی فنی تدوین کا آغاز ہوا، اور لوگوں نے اپنی اپنی علمی مہارت کی بنیاد پر قرآنی آیات اور احادیث رسولؐ کی تشریح وتوضیح کرنی شروع کی۔ چنانچہ ابتداً قرآن کریم کی آیتوں کی تفسیر بعض دیگر آیتوں سے کی گئی، پھر احادیث نبویہؐ میں ان کی تشریح تلاش کی گئی، اس کے بعد آثار صحابہ کے ذریعہ قرآنی آیات کی تفسیر کی گئی، پھر لوگ اپنی مختلف علوم میں قابلیت کی بناپر اور عقلی بنیادوں پر قرآن وحدیث سے تعارض کئے بغیر قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح کرنے لگے۔ اس قسم کی تشریح وتوضیح میں ان کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ اس کے ذریعہ اسلام مخالف مختلف نظریات کے حاملین کو کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیا جائے، یا انہیں راہ راست پر لایا جائے۔ چنانچہ انہی مختلف مناہج کی بنیاد پر تفاسیر کے پورے ذخیرہ کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، پہلی قسم کی تفاسیر کو تفسیر بالماثور کا نام دیا جاتا ہے، یعنی ایسی تفسیریں جن میں قرآن کی بعض آیتوں کی تفسیر بعض دوسری آیتوں کے ذریعہ کی گئی ہے، یا آنحضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی احادیث وسنت کے ذریعہ ان کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔ دوسری قسم کی تفسیریں وہ ہیں جنہیں تفسیر بالرائے کہا جاتا ہے۔ یہ وہ تفسیریں ہیں جن میں قرآنی آیتوں کی تفسیر بیان کرنے کے لیے کتاب وسنت اور آثار صحابہ کے ساتھ ساتھ عقلی بنیادوں اور مختلف علوم وفنون کا بھی سہارالیا جاتا ہے۔ ذیل میں تفسیر بالماثور کے نہج پر مرتب کی گئی چند نمائندہ تفسیریں درج کی جارہی ہیں:

1. تفسیر مقاتل بن سلیمان : ابوالحسن مقاتل بن سلیمان ازدی بلخی (م:150ھ/767ء)
2. جامع البیان فی تفسیر القرآن (تفسیر طبری) : امام محمد بن جریر طبری (م:310ھ/923ء)
3. تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن ابی حاتم) : عبدالرحمٰن بن محمد الرازی ابن ابی حاتم (م:327ھ/938ء)
4. تفسیر بحر العلوم (تفسیر ابواللیث سمرقندی) : ابواللیث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی (م:373ھ/983ء)
5. الکشف والبیان فی تفسیر القرآن : ابواسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی نیساپوری (م:427ھ/1035ء)

اب ذیل میں تفسیر بالرائے کی چند نمائندہ تفسیریں درج کی جارہی ہیں:

1. تفسیر الکشاف : ابوالقاسم جاراللہ زمخشری (م:538ھ/1144ء)
2. مفاتیح الغیب / تفسیر کبیر : فخرالدین رازی (م:606ھ/1209ء)

3. انوار التنزیل واسرار التاویل (تفسیر بیضاوی) : ناصر الدین عبداللہ بن عمر البیضاوی (م:685ھ/1292ء)
4. مدارک التنزیل وحقائق التاویل (تفسیر نسفی) : عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی (م:710ھ/1310ء)
5. لباب التاویل فی معانی التنزیل : علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد الخازن (م:741ھ/1341ء)

ان دونوں مناہج کی تفاسیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تفسیریں اگرچہ بنیادی طور پر دو قسموں پر منقسم ہیں، لیکن دوسری قسم میں داخلی طور پر مزید قسمیں در آئی ہیں۔ مثلاً فقہی احکام سے متعلق تفسیریں، صوفیانہ منہج پر مرتب کی گئی تفسیریں، عربی زبان وادب اور بلاغت کے پیش نظر لکھی گئی تفسیریں، کلامی مباحث پر مبنی تفسیریں وغیرہ۔ اوپر گزر چکا ہے کہ تفسیر "مفاتیح الغیب" کا تعلق اسی دوسری قسم سے ہے۔ اس سے متعلق مفصل گفتگو انشاء اللہ آئندہ کی سطروں میں آئے گی۔ یہاں پر پہلے اس تفسیر کے مرتب امام فخر الدین رازی سے متعلق ضروری باتیں آپ کے مطالعہ میں لائی جارہی ہیں تاکہ اس تفسیر کا منہج اور اس کی اہمیت صحیح طور پر واضح ہوسکے۔

8.3 تفسیر طبری

تفسیری کتابوں میں ایک اہم کتاب تفسیر طبری ہے، جو عربی زبان میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ تفسیر کی معتبر، بنیادی اور اولین کتابوں میں تفسیر طبری کا شمار ہوتا ہے۔

8.3.1 امام طبری کا تعارف

آپ کا نام محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب ہے اور کنیت ابو جعفر ہے۔ آپ کا تعلق ایران کے ایک مقام 'طبرستان' سے تھا، اسی علاقے کی وجہ سے آپ اپنے اصل نام سے زیادہ "طبری" سے مشہور ہوئے، بعض روایات کے مطابق آپ کی مکمل نسبت "الطبری الاملی" ہے۔

آپ کی پیدائش طبرستان کے ایک شہر آمل میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش کے سلسلے میں دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ خطیب بغدادی کے مطابق طبری کا سن پیدائش 224ھ کا آخر یا 225ھ کا آغاز ہے، اور جمہور مؤرخین کے مطابق سن پیدائش 224ھ ہے۔ امام طبری بچپن سے ہی حصول علم کی گہری تمناؤں سے مالا مال تھے۔ آپ کے والد وقت کے بہت بڑے زاہد اور متقی تھے، جس بنا پر امام طبری کے ذہن ودماغ میں علم کا شوق اور علم کی وابستگی بیٹھ گئی جو تلاش علم میں سفر کرنے کا جذبہ پیدا کرنے میں معاون ہوئی۔

آپ نے سات سال کی عمر میں حفظ مکمل کیا، نو سال کی عمر میں کتابت حدیث کا آغاز فرمایا۔ جب ذوق حدیث زیادہ ہوا تو اپنے علاقہ سے سفر کرکے امام احمد بن حنبل کی زیارت کے لیے شہر بغداد تشریف لے گئے۔ بعض سوانح نگاروں کے مطابق جب آپ پہلی مرتبہ حصول علم کے لیے نکلے تو آپ کی عمر بارہ سال تھی، اور بیس سال کی عمر میں بیشتر شہروں کا سفر کرچکے تھے۔ تاج الدین سبکی اپنی کتاب "**طبقات الشافعية الكبرى**" میں آپ کے بارے میں لکھا ہے "**طَوَّفَ الأقاليم لطلب العلم**"، یعنی آپ نے علم کی طلب میں کئی ملکوں کا سفر کیا جس میں مصر، شام، بغداد اور کوفہ بالخصوص شامل ہیں۔

8.3.2 تصانیف

علم کے حصول کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کرنے کے بعد بہت جلد امام طبری کی علمی شخصیت نکھر کر سامنے آگئی۔ آپ کا تحریری سرمایہ تمام شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے ماہرین و محققین اور طالبان علوم کے لیے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نہ صرف ایک مجتہد عالم تھے؛ بلکہ محدث، فقیہ اور مفسّر بھی تھے۔ تاریخ کے میدان میں بھی جداگانہ مقام رکھتے تھے۔ علامہ ابن جریر طبری نے ہر طرح کے علوم وفنون میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ کی چند مشہور تصانیف یہ ہیں:

جامع البیان فی تفسیر القرآن (مشہور نام: تفسیر طبری)، تاریخ الأمم والملوک (مشہور نام: تاریخ طبری)، تهذيب الآثار وتفصيل معانی ثابت عن رسول الله، اختلاف الفقهاء، أدب النفوس الجيدة وأخلاق النفيسة، آداب القاضی، آداب المناسک، التبصير فی معالم التنزيل، الذيل المذل، صريح السنة-

عبقریت اور وفات

ابن جریر طبری بلند پایہ مفسر اور فقیہ تھے، صاحب "**وفیات الاعیان**" ابن خلکان لکھتے ہیں:

ابو جعفر محمد بن جریر طبری جنہیں یزید بن کثیر بن غالب بھی کہا جاتا ہے، بڑے مفسر اور مشہور مؤرخ ہوئے ہیں، نیز فقہ تاریخ وغیرہ میں مختلف فنون پر ان کی بہت سے تصانیف ہیں جو ان کی وسعت علمی پر دلالت کرتی ہیں، مجتہد تھے کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔

ابن جریر طبری نے عباسی خلیفہ "المقتدر باللہ" کے عہد میں 26/ شوال المکرم 310ھ بروز اتوار مطابق 16/ فروری 923ء کو 86 سال کی عمر میں بغداد میں وفات پائی۔

8.4 تفسیر طبری کا تعارف

تیسری صدی ہجری کا آغاز عہد عباسی کے عروج اور علوم وفنون میں ترقی کا دور ہے۔ اس عہد میں جامع تفسیروں کا کام شروع ہوا اور بہت سے لوگوں نے مواد جمع کر کے جامع تفسیر تیار کرنی شروع کی، ان تفسیروں میں سب سے قابل ذکر اور قدیم ترین جامع تفسیر جو قرآن مجید کے تمام پہلوؤں سے بحث کرتی اور مرتب شکل میں پورے قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتی ہے امام طبری کی "جامع البيان فی تفسيرآيات القرآن" ہے۔ یہ مکمل قرآن کی تفسیر ہے۔ امام طبری نے پہلے بہت جامع اور مبسوط تفسیر لکھی تھی جس کے بارے میں مورخین کا خیال ہے کہ تیس ہزار صفحات پر مشتمل تھی، جب امام طبری اس قدر مبسوط اور طویل تفسیر لکھ کر فارغ ہوئے تو انہیں خیال آیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے لیے یہ تفسیر اکتاہٹ اور بے اعتنائی کا باعث ہو جائے اور مبسوط ہونے کی وجہ سے پڑھنا مشکل ہو جائے۔ اس لیے انہوں نے ایک دوسری تفسیر مختصر لکھی جو تفسیر طبری کے نام سے مشہور ہے۔

اس کی ایک خاص بات جس نے اس تفسیر کو بقیہ تمام تفاسیر کے لیے مرجع اور ماخذ کی شکل دے دی ہے یہ کہ صحابہ اور تابعین کے

ذریعہ سے جتنا مواد بھی طبری تک پہنچا تھا ان تمام اقوال کو انہوں نے اپنی تفسیر میں جمع کر دیا ہے۔ اگر ہمارے پاس صرف یہی ایک کتاب ہوتی تو صدر اول کے تفسیری سرمایہ کے لیے کسی اور کتاب کی طرف رجوع کی ضرورت نہ پڑتی۔ اس اعتبار سے اس تفسیر کی جامعیت ثابت ہوتی ہے۔

8.4.1 خصوصیات

امام طبری کی تفسیر کئی اعتبار سے بالکل ممتاز ہے۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

"كتاب في التفسير لم يصنّف أحدٌ مثله"۔ (تفسیر کی اس جیسی کتاب کسی نے نہیں لکھی)۔

سب سے پہلی مکمل تفسیر کا شرف اسے حاصل ہے۔ امام طبری یہ کتاب 'تفسیر بالماثور' کی نمائندہ کتاب مانی جاتی ہے۔ ابتداءً اس قسم کے تفسیری رجحانات نہیں پائے جاتے تھے، صرف تفسیر بالماثور ہی کا رواج تھا۔ علاوہ ازیں اس تفسیر میں فقہی احکام میں شوافع کے اقوال غالب ہیں؛ مگر باقی ائمہ کے اقوال سے بھی صَرف نظر نہیں کیا ہے بعض دفعہ اپنی اجتہادانہ صلاحیتوں کے تحت فقہی مسائل کا استنباط بھی کیا ہے۔

8.4.2 سند پر بحث

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں جو روایات اور احادیث ذکر کی گئی ہیں ان کی پوری سند بیان کر دی گئی ہے، لیکن انہوں نے صاف طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ میں نے سند کی تحقیق نہیں کی ہے اور اس کے ضعف اور مضبوطی کو نہیں پرکھا ہے۔ یہ امام طبری کے دیانت اور علمی امانت کی بڑی مثال ہے۔ تاہم سند بیان کر دینے سے قاری کے لئے یہ آسانی ہو جاتی ہے کہ وہ خود اس روایت کے معیار کی جانچ کرلے۔ چنانچہ امام طبری نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ محض اس تفسیر میں دیکھ کر کسی چیز کی نسبت سو فیصد حضور ﷺ کی طرف کرنا مناسب نہیں ہے۔ جب تک کہ ہر روایت کا الگ سے فنی طور پر داخلی اور خارجی شواہد کی بنا پر جائزہ نہ لے لیا جائے، اور محدثین کے اصولوں کی روشنی میں پرکھ نہ لیا جائے، اس وقت تک حضور ﷺ کی طرف اس کی نسبت نہ کی جائے۔

8.4.3 جامع تفسیر

امام جریر طبری کی یہ تفسیر کئی اعتبار سے جامع ہے، اس میں امام طبری نے تفسیری روایات کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ لغت اور کلام کی بحثوں کو بھی ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ طبری علم قرأت کے بھی ماہر تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی اس تفسیر میں علم قرأت کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے اور جہاں جہاں قرأت میں فرق ہے اسے بھی ذکر کیا ہے، اس طرح مختلف علوم کے جمع ہونے کی وجہ سے یہ تفسیر جامع کہلانے کی مستحق ہو گئی ہے۔ تفسیر طبری کے بعد بہت سی تفسیری کتابیں لکھی گئی ہیں ان تفاسیر کی تدوین میں اہل علم اور مفسرین نے علامہ ابن جریر طبری کی بیان کردہ تفسیری فوائد سے خوب استفادہ کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے اسلوب کی بھی پیروی کی ہے، مثلاً تفسیر ابن کثیر پر بہت زیادہ طبری کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اس اعتبار سے کہنا چاہیے کہ ابن جریر کی تفسیر دیگر تفاسیر کے لیے مرجع اور ماخذ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ تفسیر طبری کو دیگر کتب تفاسیر کے مقابلے میں فنی اور زمانی اعتبار سے تقدم حاصل ہے۔ لہٰذا زمانہ کے اعتبار سے یہ

اولین تفسیری مجموعہ ہے، جو مکمل طور پر ہم تک پہنچا ہے۔ فنی اعتبار سے اس تفسیر کی برتری کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو اسلوب نگارش اختیار کیا گیا ہے وہ طبری کا خود اختیار کردہ ہے۔

8.4.4 مقدمہ تفسیر

امام جریر طبری نے تفسیر کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں تفسیر کے تعلق سے بڑی قیمتی باتیں تحریر کی ہیں۔ اس مقدمہ میں انہوں نے قرآن کریم کے اسماء سے بحث کی ہے اور حضرات صحابہ و تابعین کے اقوال کی روشنی میں بیان کیا ہے کہ قرآن کریم کے ناموں میں ایک نام قرآن ہے اور دیگر ناموں میں فرقان، کتاب اور ذکر ہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ کے ناموں کو بھی زیر بحث لایا ہے، تفسیر بالرائے کی ممانعت پر کلام کیا ہے، قرآن کریم کے سات لغات پر نازل ہونے کے مسئلہ پر عمدہ گفتگو کی ہے، اسی طرح آیات کی تاویل و توجیہ سے متعلق کلام کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے اس مقدمہ میں انہوں نے تفسیر سیکھنے کی فضیلت و ضرورت سے بحث کی ہے اور تفسیر کے تعلق سے حضرات صحابہ کا عمل بیان کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

> عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ، قَالَ: كَانَ الرَّجُلُ مِنَّا إِذَا تَعَلَّمَ عَشْرَ آيَاتٍ، لَمْ يُجَاوِزْهُنَّ حَتَّى يُعْرَفَ مَعَانِيَهُنَّ وَالْعَمَلَ بِهِنَّ۔
>
> (حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ہم میں سے کوئی جب قرآن کریم کی دس آیات سیکھ لیتا تو اس سے آگے نہیں بڑھتا تھا، یہاں تک کہ اس کے معانی کو جان لیتا اور اس پر عمل شروع کر دیتا تھا۔

8.4.5 تفسیر طبری کا منہج

تفسیر طبری کی جامعیت اور اسلوب و نگارش کی انفرادیت کا تقاضا ہے کہ اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اس تفسیر کا منہج سمجھ لیا جائے تاکہ اس سے فائدہ اٹھانا آسان ہو۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ اس کے منہج سے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔

8.4.5.1. تفسیر بالماثور

تفسیر طبری تفسیر بالماثور ہے، اس میں حضور ﷺ، صحابہ اور تابعین کی روایات کو سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تفسیر بالماثور کا اس درجہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس میں نہ صرف روایت؛ بلکہ درایت کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ آیات کی تفسیر سے پہلے بعض دفعہ: "القول فی تأویل قوله كذا وكذا" کا اضافہ کرتے ہیں اور بیان کردہ سند کے ساتھ صحابہ و تابعین کی روایات سے اس کی تاویل کرنے سے پہلے آیت کے اجمالی معنی بیان کرتے ہیں۔ اخیر میں نقل کردہ اقوال کی توجیہ کرنے سے اعراض کرتے ہوئے کسی ایک قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ جب روایات ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں تو کسی ایک کو دوسری روایت پر ترجیح دیتے ہوئے لغت، اعراب، ترکیب شعری اور تاویل بالرائے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام طبری نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں تفسیر بالرائے کی ممانعت پر بھی بحث کی ہے اور اس پر متعدد احادیث سے بھی استدلال کیا ہے، لہٰذا تفسیر کرتے وقت اس نہج پر آیات کی تفسیر بیان کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

آیات کی تفسیر بیان کرنے میں امام طبری کا انداز یہ ہے کہ پہلے آیت ذکر کر کے اس کا معنی بیان کرتے ہیں، پھر احادیث اور اقوال صحابہ و تابعین کے ذریعہ اپنے اس قول کو مضبوط کرتے ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ کے شروع میں وہ لکھتے ہیں:

الْقَوْلُ فِي تَأْوِيلِ قَوْلِهِ تَعَالَى: {لَا رَيْبَ فِيهِ} لَا شَكَّ فِيهِ، ... عَنْ مُجَاهِدٍ: {لَا رَيْبَ فِيهِ}، قَالَ: لَا شَكَّ فِيهِ ، ... وَعَنْ مُرَّةَ الْهَمْدَانِيِّ، عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ، وَعَنْ نَاسٍ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: {لَا رَيْبَ فِيهِ} لَا شَكَّ فِيهِ "۔

اللہ تعالی کے ارشاد "لَا رَيْبَ فِيهِ" کا معنی "لَا شَكَّ فِيهِ "(کوئی شک نہیں ہے)،... جیسا کہ مجاہد سے منقول ہے "لَا رَيْبَ فِيهِ" کے بارے میں انہوں نے فرمایا: "لَا شَكَّ فِيهِ" (اس میں کوئی شک نہیں ہے) اور مرۃ ہمدانی حضرت عبد اللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ سے روایت کرتے ہیں کہ "لَا رَيْبَ فِيهِ " کے معنی "لَا شَكَّ فِيهِ" کے ہیں۔

امام جریر طبری نے اس کا خیال رکھا ہے کہ تفسیر بالماثور پر ہی اکتفا کی جائے۔ تاہم اس کے لیے قوی ترین اقوال اور صرفی ونحوی ابحاث میں صحیح ترین آراء کو مد نظر رکھا ہے اگر چہ بعض دفعہ لغت میں سے اشعار کا بھی استعمال کیا ہے لیکن اس کی تحدید معانی کی وضاحت تک ہے۔

8.5 امام فخر الدین رازی

پیدائش اور نام ونسب

امام فخر الدین رازی کی پیدائش ایران کے مشہور شہر 'رے' میں ہوئی تھی۔ آپ کے سن پیدائش کے سلسلہ میں مؤرخین کی مختلف رائیں ہیں۔ لیکن جو مضبوط رائیں ہیں ان کے مطابق آپ کی پیدائش سن 543ھ یا 544 ہجری میں ہوئی تھی۔

امام فخر الدین رازی کا اصل نام "محمد" ہے۔ آپ "ابو عبد اللہ" اور "ابو الفضل" کی کنیت اختیار کرتے تھے، اور "فخر الدین" کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ چونکہ آپ "رے" کے باشندہ تھے، اس لیے اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے "امام رازی" کے طور پر بھی معروف ہیں۔ آپ کے والد "عمر بن حسین" رے کے باکمال خطیب تھے اور "خطیب رے" کے طور پر مشہور تھے، لہٰذا امام رازی "ابن الخطیب" یعنی خطیب کے صاحبزادے کے بطور بھی معروف ہوئے۔ آپ کے والد ایک اچھے واعظ اور خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ اور علم کلام کے بھی بڑے عالم تھے۔ چنانچہ انہوں نے علم کلام کے موضوع پر "غایۃ المرام" کے نام سے ایک نہایت محققانہ کتاب دو جلدوں میں تالیف کی تھی۔ اس کے علاوہ آپ نے فن اصول اور وعظ پر بھی بعض اہم کتابیں تصنیف کی تھیں۔

سلسلۂ نسب کے بابت دو رائیں ہیں۔ پہلی رائے کے مطابق امام فخر الدین رازی کا خاندانی سلسلہ حضرت ابو بکر صدیق سے جڑا ہوا ہے۔ اس رائے کو شمس الدین شہر زوری نے اپنی کتاب 'تاریخ الحکماء' میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسری رائے کی وضاحت خود امام رازی نے کی ہے، جسے مولانا عبد السلام ندوی نے اپنی کتاب 'امام رازی' میں مفتاح السعادۃ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

تعلیم وتربیت

امام رازی نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز اپنے والد محترم کے زیر سایہ کیا۔ آپ کے والد صاحب امام بغوی کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ امام صاحب نے ان سے فقہ اور علم کلام کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نے اپنے تعلیمی سفر کو آگے بڑھاتے

ہوئے کمال سمنانی سے کسب فیض کرتے رہے۔ کمال سمنانی سے آپ نے فقہ میں گہرائی حاصل کی۔ اس کے بعد امام مجد الدین جیلی کی شاگردی اختیار کی، جو پہلے مقام 'رے' میں، پھر 'مراغہ' نامی مقام پر طویل مدت تک قائم رہی۔ مجد الدین جیلی، امام غزالی کے شاگردوں میں سے تھے۔ امام صاحب نے ان سے علم کلام اور حکمت وفلسفہ کی تعلیم پائی۔ اس دوران آپ نے امام جوینی کی "الشامل فی اصول الدین" جو علم الکلام پر اہم کتاب تھی زبانی یاد کر لی تھی۔ ان خاص اساتذہ کے علاوہ آپ نے اپنے زمانہ کے جلیل القدر اساتذہ سے بھی کسب فیض کیا۔ حصول علم کی خاطر مختلف علاقے کے اسفار بھی کئے اور بعض مدارس میں بھی باضابطہ داخلہ لے کر تعلیم حاصل کی۔ (امام رازی، ص:4)

امام رازی کے مشغلے

امام رازی کی ابتدائی زندگی انتہائی فقر وفاقہ کی حالت میں گذری تھی۔ چنانچہ جب حصول علم سے فراغت کے بعد آپ نے خوارزم اور ماوراء النہر وغیرہ علاقوں کا سفر کیا، اور مختلف علمی سرگرمیوں میں مصروف تھے، اس دوران آپ کو اسی مالی تنگی کی وجہ سے سب سے زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ بیمار پڑے تو ان کے علاج کے لئے چندہ کرنا پڑا تھا۔ البتہ ان اسفار سے وطن 'رے' واپسی کے بعد آپ کی یہ تنگ دستی دور ہو گئی۔ اس کی شکل یہ بنی کہ رے میں ایک مالدار طبیب رہتا تھا جس کی دو بیٹیاں تھیں۔ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے امام صاحب سے اصرار کے ساتھ یہ گذارش کی کہ آپ اپنے دونوں صاحبزادوں کا نکاح اس کی دونوں صاحبزادیوں سے کر دیں۔ چنانچہ امام صاحب نے ایسا ہی کیا، جس کی وجہ سے اس طبیب کی موت کے بعد وافر مقدار میں مال ودولت امام صاحب کے تصرف میں آگئی۔ اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ امام صاحب کی مالداری کا سبب یہ ہوا کہ آپ کے تعلقات شاہان خوارزم اور غوری سلاطین سے استوار ہو گئے تھے، اور انہوں نے آپ کے ساتھ نہایت فیاضانہ اور قدردانی کا سلوک کرتے ہوئے انعام واکرام سے نوازا تھا جس کی وجہ سے آپ مالدار ہو گئے تھے۔ بہر حال یہاں سے گویا آپ کی زندگی کے دوسرے حصہ کا آغاز ہوا۔

امام رازی اپنی زندگی میں مختلف علمی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ البتہ ان میں آپ کا اصل مشغلہ درس وتدریس اور وعظ ونصیحت کا تھا، آپ مختلف کلامی فرقوں سے مناظرہ ومباحثہ بھی کرتے تھے، اور تصنیف وتالیف کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ ذیل میں آپ کے ان مشاغل پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

درس وتدریس

درس وتدریس شروع ہی سے امام رازی کی مصروفیات کا اہم حصہ رہا تھا۔ لیکن اس کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی، البتہ مالداری کے بعد کے بعض واقعات اور حالات ملتے ہیں جن سے آپ کی تدریسی مشغلہ پر روشنی پڑتی ہے اور اس وقت کے آپ کے علمی دروس کی اہمیت ووقعت واضح ہوتی ہے۔ مولانا عبد السلام ندوی اپنی کتاب امام رازی میں قاضی محی الدین کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ:

> میں نے امام صاحب سے ہمدان اور ہرات میں تعلیم حاصل کی۔ ان کی مجلس درس میں بڑی شان پائی جاتی تھی اور وہ بادشاہوں سے بھی بڑے نظر آتے تھے۔ جب وہ درس دینے کے لئے بیٹھتے تھے تو ان کے اکابر تلامذہ مثلاً زین الدین کشی، قطب مصری اور شہاب الدین نیشاپوری کی ایک جماعت ان کے قریب بیٹھتی

تھی۔ ان کے متصل بقیہ تلامذہ اور دوسرے لوگ حسب مراتب بیٹھتے تھے۔ جب کوئی شخص کوئی علمی مسئلہ چھیڑتا تھا تو اس سے اکابر تلامذہ کی جماعت بھی بحث و مباحثہ کرتی تھی۔ البتہ جب کوئی مشکل بحث پیش آجاتی تھی تو امام صاحب خود اس میں حصہ لیتے تھے اور اس کے متعلق ایسی بحث کرتے تھے جس کی تعریف حد بیان میں نہیں آسکتی۔ تلامذہ کی کثرت کا یہ حال تھا کہ جب امام صاحب کی سواری چلتی تھی تو اس کے ساتھ تین سو شاگرد چلتے تھے۔

جب سلاطین غور سے تعلقات استوار ہوئے تو انہوں نے بھی آپ کے مقام کی بنیاد پر انعام واکرام سے بارش کر دی۔ بلکہ شہاب الدین غوری نے آپ کے لیے ہرات کی جامع مسجد کے قریب ایک مدرسہ بنوادیا تھا جہاں دور دراز علاقوں سے علم کے شوقین آپ کے پاس اپنی علمی پیاس بجھانے آیا کرتے تھے۔ ایک قول کے مطابق غیاث الدین غوری نے یہ مدرسہ اپنے شاہی محل میں کھولنے کی اجازت دی تھی۔ سلاطین غور کے بعد جب آپ کے تعلقات خوارزم شاہوں سے قائم ہوئے تو انہوں نے بھی آپ کے ساتھ بڑا قدر دانی کا معاملہ کیا۔ چنانچہ سلطان علاء الدین خوارزم شاہ نے شہزادہ محمد بن تکش خوارزم شاہ کے لئے آپ کو اتالیق مقرر کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب شہزادہ محمد بن تکش تخت نشین ہوا تو امام صاحب کی قدر و منزلت اور جاہ و جلال میں مزید اضافہ ہوا۔ اس بادشاہ نے بھی اپنی مملکت میں امام صاحب کے لئے ایک مخصوص مدرسہ بنوادیا تھا جس میں آپ درس دیا کرتے تھے۔

8.5.1 تصنیف و تالیف

امام صاحب نے مختلف علوم وفنون میں بہت سے مفید کتابیں تحریر کیں۔ آپ کی ان کتابوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ کی یہ کتابیں دور دراز علاقوں میں بہت تیزی سے پھیل گئیں اور لوگ متقدمین کی کتابوں پر آپ کی کتابوں کو ترجیح دینے لگ گئے۔ اس کی بڑی وجہ مولانا عبد السلام ندوی صاحب نے یہ بتائی ہے کہ انہوں نے اپنے متقدمین میں سے ہر علم کے خاص اور ممتاز لوگوں سے بھرپور استفادہ اور ان کا مطالعہ کیا تھا، اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس وقت کے حالات سے کتاب کے مباحث کو جوڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی۔

امام رازی کے تصنیفی سفر کا آغاز ماوراء النہر کے علاقہ 'سرخس' میں ہوا۔ وہاں آپ ایک طبیب 'عبد الرحمٰن بن عبد الکریم' کے مہمان تھے۔ چنانچہ جب آپ اس کے علاقہ میں تشریف لے گئے تو اس نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور خوب دل کھول کر آپ کی ضیافت کی۔ جس کے نتیجہ میں آپ نے خوش ہو کر بو علی سینا کی کتاب 'کلیات' کی ایک شرح لکھ کر اس طبیب کے نام منسوب کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا، چنانچہ جن سلاطین کے ساتھ آپ کا تعلق اور ان کی نوازشیں رہیں، آپ نے بعض کتابیں ان کے نام بھی منسوب کیں۔ ان کے علاوہ بھی آپ نے بکثرت تصنیفات یادگار چھوڑیں، جن کی تعداد کے سلسلہ میں تذکرہ اور سوانح نگاروں کے اقوال مختلف ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً70 تک پہنچتی ہے، اور دوسرے قول کے مطابق آپ نے تقریباً دو سو تصنیفات اپنے پیچھے چھوڑیں۔ البتہ مولانا عبد السلام ندوی نے اپنی کتاب "امام رازی" میں 80 کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض کتابیں بطور شرح لکھی گئیں، اور بعض ترجمہ کے طور پر بھی منظر عام پر آئیں، اس کے ساتھ ہی یہ کتابیں مختلف موضوعات کی حامل ہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند معروف کتابوں کے نام دیئے جارہے

ہیں۔

مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر)، التفسیر الحافل، المحصول فی علم اصول الفقہ، شرح الوجیز فی الفقہ للغزالی، المعالم فی اصول الدین، المعالم فی اصول الفقہ، المعالم فی الکلام، سراج القلوب، المباحث الشرقیہ، کتاب الاربعین فی اصول الدین، اصول الفقہ، کتاب البیان والبرہان علی اہل الزیغ والطغیان، کتاب المباحث العمادیہ فی المطالب المعادیہ، کتاب تہذی الدلائل وعیون المسائل، ارشاد النظار الی الطائف الاسرار، کتاب اجوبتہ المسائل التجابیہ، شرح کلیات القانون،، الخمسین فی اصول الدین، نہایۃ العقول فی الکلام فی درایۃ الاصول، کتاب القضا والقدر، اساس التقدیس، لطائف الغیاثیہ، عصمۃ الانبیاء، مطالب العالیہ، کتاب الملل والنحل، بحر الانساب، حدائق الانوار فی حدائق الاسرار۔

وفات

606ھ مطابق 1209ء میں جب امام رازی ہرات میں مقیم تھے، سخت بیماری میں مبتلا ہوئے، اور اسی بیماری میں آپ کا انتقال ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اس بیماری کی وجہ سے آپ کی موت نہیں ہوئی بلکہ چونکہ آپ کرامیہ اور دیگر کلامی فرقوں کے خلاف مناظرے کرتے تھے جس کی وجہ سے دشمنی میں انہوں نے آپ کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا جس سے آپ کی موت واقع ہو گئی تھی۔

آپ کے مقام تدفین کے سلسلہ میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ انہیں ہرات کے قریبی گاؤں مزداخان سے لگے ہوئے پہاڑی میں دفن کیا گیا تھا۔ جبکہ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ امام صاحب کو اندیشہ تھا کہ اگر آپ کو باہر کھلے میں دفن کیا گیا تو اپنے مخالفین آپ کی نعش کی بے حرمتی کریں گے، لہٰذا انہوں نے اپنے شاگردوں کو یہ وصیت کی تھی کہ انہیں ان کے گھر میں ہی دفن کر دیا جائے۔ لیکن بظاہر یہ دونوں رائیں درست نہیں معلوم ہوتیں، کیونکہ ہرات میں آج بھی امام رازی کا مقبرہ قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔

8.6 تفسیر مفاتیح الغیب

تعارف

اس تفسیر کا اصل نام "مفاتیح الغیب" ہے، لیکن زیادہ مشہور "تفسیر کبیر" کے نام سے ہے۔ یہ تفسیر 32 جلدوں کی ضخامت پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر جلد اوسطاً 258 صفحات پر محیط ہے۔

جب امام رازیؒ نے اپنی زندگی کے تقریباً پچاس سال مکمل کر لئے، اور انہیں احساس ہوا کہ انہیں ان علوم وفنون میں مہارت اور پختگی حاصل ہو گئی ہے جن کی بنیاد پر وہ قرآن کریم کی تفسیر لکھ سکتے ہیں تو انہوں نے اپنی یہ تفسیر لکھنا شروع کیا۔ سن ہجری کے مطابق یہ وقت تقریباً 595ھ کا تھا۔ امام رازی نے اپنی اس تفسیر کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ سائنس، کائنات، فطرت، علم کلام اور دیگر علوم کا ایک گراں قدر ذخیرہ بنا دیا ہے۔ قرآنی آیات کی تفسیر میں امام صاحب نے تقریباً ان تمام علوم کا احاطہ کر لیا ہے جو متعلقہ آیات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے ہیں، تاکہ ان آیات کو سمجھنے اور نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ انہی وسیع تر معلومات اور تحقیق کی بنیاد پر یہ تفسیر مفسرین اور اہل علم کے نزدیک

بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ امام صاحب کے پیش نظر اس تفسیر کو لکھنے کے اہم مقاصد میں یہ بات تھی کہ قرآن کریم میں جو تعلیمات اور احکام دیئے گئے ہیں ان کا دفاع کیا جائے اور اس وقت کے مروجہ علوم و معارف کی روشنی میں انہیں پیش کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی عقائد کے سلسلہ میں جو شکوک و شبہات ہیں ان کا عقلی بنیادوں پر دفاع کیا جائے اور قرآنی آیتوں اور سورتوں کے درمیان ربط و تعلق کو واضح کیا جائے۔

تفسیر مفاتیح الغیب کے تفسیر کبیر کے طور پر مشہور و معروف ہو جانے کی بنیادی طور پر دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ یہ تفسیر اپنی کمیت اور ضخامت کے اعتبار سے بہت مفصل اور طویل ہے، جیسا کہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ یہ تفسیر 32 جلدوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے کہ یہ تفسیر بہت مفصل ہے یہ تفسیر 'تفسیر کبیر' کے طور پر معروف ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں بڑے عظیم اور دقیق علوم و معارف کو زیر بحث لایا گیا ہے اور مختلف علوم و فنون سے متعلق بہت ہی مفید اور جامع باتیں درج کر دی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب جب وہ کسی آیت کی تفسیر بیان کرتے تو آیت سے متعلق مسائل اور متعلقات کو ترتیب وار تحریر کرتے چلے جاتے تھے، پھر چاہے ان علوم و فنون کا تعلق اس آیت کے ضمن میں لغت اور عربی قواعد سے ہو یا علوم بلاغت سے، حدیث اور فقہ سے ہو یا فلسفہ و علم کلام سے، سائنس سے ہو یا فطرت سے۔ ہر طرح کے علوم و فنون کو درج کر دیتے تھے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اگر کسی آیت کی تفسیر ایک صفحہ میں مکمل ہو سکتی ہے تو اِس انداز سے تفسیر کرنے کی صورت میں دو صفحات یا تین بلکہ اس سے بھی زیادہ صفحات کی ضرورت ہو گی۔ لہٰذا اسی بنیاد پر یہ علوم و معارف اور مسائل و مباحث کی انسائیکلوپیڈیا اور دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ اس تفسیر کی اس قدر تفصیل ہونے کی وجہ سے اس پر بعض لوگوں نے یہ بات بھی کہی ہے کہ "فيه كل شيء إلا التفسير" یعنی اس میں قرآنی آیات کی تفسیر کے علاوہ سب کچھ ہے۔ لیکن دراصل یہ صحیح بات نہیں ہے، بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس میں قرآنی آیات کی تفسیر کے ساتھ بہت کچھ ہے۔ تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ اس میں بکثرت ایسی چیزیں آ گئی ہیں جن کا بظاہر قرآنی آیات کی تفسیر سے کوئی نسبت نہیں۔ باوجود اس کے اس تفسیر کی طوالت کی خوبیاں بھی بہت ہیں، جو قاری کو بہت سی دوسری تفاسیر کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ چنانچہ مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے تھے کہ میں نے مشکلاتِ قرآن میں سے کوئی مشکل ایسی نہ پائی، مگر اس کا حل امام موصوف نے اس تفسیر میں فرما دیا ہے۔ امام موصوف حل مشکلات کے دریا میں غوطہ زنی کرتے ہیں۔

8.6.1 اہم خوبیاں

امام رازی کی یہ تفسیر اپنی ضخامت کی طرح ہی بہت سی خوبیوں کی حامل ہے۔ البتہ امام صاحب نے خود سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھتے وقت اس کا تعارف لکھا تھا، اس تعارف اور تفسیر کے مطالعہ کے بعد جو اہم خوبیاں اور خصوصیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں، ان میں سے چند کا تذکرہ ذیل میں کیا جا رہا ہے:

- امام رازی جب کسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو سابقہ اور بعد میں آنے والی آیات سے اس کے ربط و تعلق کو واضح کرتے ہیں۔ اسی طرح سورتوں کے درمیان بھی آپسی جوڑ اور ارتباط کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان دونوں سورتوں کے درمیان کیا مناسبت اور مطابقت ہے، بعض جگہوں پر اس طرح کا ربط و تعلق ایک دو بیان کرنے پر اکتفا کر لیتے ہیں لیکن اس کے برخلاف بعض دوسری جگہوں پر اس طرح کی مناسبتیں متعدد بیان کرتے ہیں۔ تاکہ کلام الٰہی کا مفہوم قاری کے سامنے مربوط اور مرتب انداز میں

آئے۔

- امام رازی سنی نظریات کے حامل شخص تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں معتزلہ اور دوسرے نظریات کے حاملین سے بکثرت مناظرے ومباحثے کئے تھے، جن میں اکثر انہوں نے مخالفین کو خاموش کر دیا تھا۔ امام صاحب اپنی اس تفسیر میں بھی ان کے نظریات پر خوب تنقید کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں اپنے نظریات پر بھرپور دلائل فراہم کرتے ہیں۔
- امام رازی فلسفہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی اس تفسیر میں فلاسفہ کے ان افکار اور نظریات کی بھی بھرپور تردید اور تنقید کی ہے جو اسلامی تعلیمات وہدایات اور نظریات کے مخالف ہیں، اور ان کو مسکت جواب دیا ہے۔
- قرآنی آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے بہت سے علوم ومعارف کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جن آیات سے کوئی فقہی حکم ثابت ہوتا ہو تو اسی کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان احکام کے سلسلہ میں فقہاء کے مذاہب ومسالک بھی بیان کرتے ہیں، خاص طور پر شوافع کے مسلک کو دلائل کے ساتھ پیش کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
- اسی طریقے سے آیات سے متعلق عربی قواعد (صرف ونحو اور علوم بلاغت) کی وضاحت کرتے ہیں۔ خاص طور پر آیات سے متعلق عربی بلاغت کو خوب نمایاں کرتے ہیں۔
- اس تفسیر کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ نہایت ہی جامعیت کی حامل ہے۔ اس میں امام صاحب جس مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہیں تو اس سے متعلق پہلے پیش آچکے تمام مباحث اور دیگر تمام امور کا ایک ہی جگہ احاطہ کر دیتے ہیں۔ دوسری تفسیروں میں بھی یہ چیز ملتی ہے لیکن وہ مختلف جگہوں پر منتشر اور بکھری ہوئی ہیں۔

8.6.2 سبب تالیف

اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ امام رازیؒ اکثر مختلف نظریات کے حاملین کے ساتھ مناظرے اور مباحثے کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے انہیں زیادہ وقت تک ایک جگہ پر قیام واستقرار حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس تفسیر کی تالیف کا جو بنیادی سبب ہوا اس کہ وجہ امام صاحب خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے خطبہ میں یہ بات کہہ دی کہ محض سورہ فاتحہ سے دس ہزار مسائل کا استنباط کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بات مخالفین اور حاسدین کو ہضم نہ ہوئی، چنانچہ انہوں نے اس بابت آپ پر بڑے اعتراضات کئے اور آپ کی مخالفت پر لوگوں کو اکٹھا کرنے لگ گئے۔ جس کی وجہ سے امام صاحب نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی اور محض سورہ فاتحہ کی تفسیر تقریباً 300 صفحات پر مکمل کی۔ اس میں آپ نے سورہ فاتحہ کی آیات کی تفسیر حدیث، فقہ، کلام، صرف، نحو، بلاغت، فلسفہ اور دیگر بہت سے علوم کے ذریعہ انجام دی، اور اس کے آغاز میں لکھا کہ محض تعوذ یعنی "أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيطَانِ الرَّجِيمِ" سے ہزاروں مسائل نکل سکتے ہیں۔ اس طور پر کہ اس میں اللہ کی پناہ جن منہیات اور ممنوعات سے مانگی گئی ہے ان میں بے شمار امور داخل ہیں، مثلاً اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت کے 73 فرقے ہوں گے جن میں سے 72 جہنمی ہوں گے۔ ظاہر ہے انسان کو اِن سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیے۔ پھر ان گمراہ فرقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے ماتحت فرقے ہیں، جن کے عقائد، عبادات اور نظریات ایک دوسرے سے مختلف اور بے شمار ہیں۔ چنانچہ اگر اس طور پر دیکھا جائے

تو محض ''أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيطَانِ الرَّجِيمِ'' سے ہزاروں مسائل کا استنباط اور استخراج ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ سورہ فاتحہ یا دوسری کسی قرآنی سورت سے ہزاروں مسائل نہیں نکل سکتے تو یہ دراصل غلط فہمی اور کم عقلی پر مبنی ہے۔

8.6.3 تفسیر کبیر کے مفسرین

تفسیر کبیر کے نام سے معروف یہ عظیم علمی شاہکار جو امام رازی کی طرف منسوب ہے، اس کے متعلق تقریباً سبھی محققین کا اتفاق ہے کہ امام صاحب اپنی یہ تفسیر مکمل نہیں کر سکے تھے، تکمیل سے پہلے ہی آپ کا وصال ہو گیا تھا۔ اب یہاں پر یہ سوال آتا ہے کہ امام صاحب نے اپنی یہ تفسیر کہاں تک لکھی تھی؟ اس کے متعلق کوئی قطعی جواب نہیں ملتا، اس بابت محققین کی رائیں مختلف ہیں۔ تاہم اکثر محققین نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ امام صاحب نے اپنی یہ تفسیر سورہ انبیاء تک لکھی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن مولانا عبد السلام ندوی یہ رائے کی تردید کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

> امام صاحب کی یہ عادت ہے کہ اکثر سورتوں کے خاتمے میں لکھ دیتے ہیں کہ اس سورہ کی تفسیر فلاں دن، فلاں مہینہ، فلاں سن میں ختم ہوئی اور اس قسم کی تصریحات سورہ انبیاء کے بعد بھی متعدد سورتوں میں ملتی ہیں، مثلاً سورہ مومن کی تفسیر کے خاتمے میں لکھتے ہیں کہ 'اس سورہ کی تفسیر سنیچر کے دن 2/ ذی الحجہ 603ھ میں شہر ہرات میں ختم ہوئی'۔ اسی مہینے اور اسی سنہ میں انہوں نے سورہ حم، سورہ شوریٰ، سورہ زخرف، سورہ جاثیہ، سورہ احقاف اور سورہ محمد کی تفسیر بھی لکھی ہے اور سب کے اخیر میں اس قسم کی تصریح کر دی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ محمد تک خود امام صاحب نے تفسیر لکھی ہے لیکن اس کے بعد اس قسم کی تصریحات نہیں ملتیں۔ بہر حال اس تفسیر کا بڑا حصہ خود امام صاحب کا لکھا ہوا ہے۔

اس ضمن میں دوسرا سوال یہ ہے کہ امام رازی کے بعد اس تفسیر کو کس نے مکمل کیا؟ اس کے متعلق بھی کوئی یقینی اور قطعی بات نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ اس بابت بھی محققین کی رائیں مختلف ہیں۔ اس سلسلہ میں دو افراد کے نام آتے ہیں، پہلے شخص نجم الدین مخزومی مصری (م: 727ھ) ہیں اور دوسرے شخص شہاب الدین بن خلیل دمشقی (م:639ھ) ہیں۔ ان دونوں پر تقریباً سبھی محققین کا اتفاق ہے کہ انہوں نے ہی امام رازی کی تفسیر کی تکمیل کی تھی۔ البتہ یہاں پر پھر سے داخلی طور پر کچھ اختلاف رائے ہے کہ ان دونوں اشخاص میں نے کس نے اسے مکمل کیا۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس تفسیر کو امام رازی کے بعد شیخ نجم الدین مخزومی نے مکمل کیا تھا۔ اس رائے کے حاملین میں سر فہرست حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ہیں۔ جبکہ حاجی خلیفہ کی رائے کے مطابق شیخ نجم الدین مخزومی نے اس کا تکملہ لکھنا شروع کیا تھا، لیکن وہ اسے مکمل نہیں کر سکے تھے، بعد میں اسے قاضی شہاب الدین خلیل دمشقی نے مکمل کیا۔ بعض لوگوں نے اس کے برعکس اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ پہلے قاضی شہاب الدین نے اس تفسیر کا کچھ حصہ مکمل کیا، پھر بعد میں شیخ نجم الدین نے اسے تکمیل تک پہنچایا۔ ایک عمومی رائے یہ بھی ظاہر کی جاتی ہے کہ شیخ نجم الدین اور قاضی شہاب الدین دونوں نے اس تفسیر کا تکملہ لکھا۔ یہ دونوں تکملے الگ الگ اور مستقل ہیں۔ حالانکہ یہ رائے بعید از قیاس ہے، کیونکہ تفسیر کے ساتھ ایک ہی تکملہ شائع ہوتا ہے اور دوسرے کی موجودگی کا عام طور پر محققین نے تذکرہ نہیں کیا ہے۔

بہر حال، اس کے باوجود کہ اس تفسیر کو ایک سے زیادہ لوگوں نے مرتب کیا ہے، اس کے اسلوب اور طرز تفسیر میں ذرا بھی کسی جگہ تبدیلی اور اختلاف نظر نہیں آتا۔ پوری کتاب یکسانیت اور یگانگت کا نادر نمونہ ہے۔ قاری کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اسے امام صاحب کے علاوہ بھی کسی نے لکھا ہے۔ یہ دراصل مفسرین کی علمی پختگی اور ٹھوس علمی مباحث کی دلیل ہے جو انہوں نے قرآنی آیات کی تفسیر کے دوران مختلف علوم وفنون کو پیش کر کے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محققین کے درمیان یہ بہت مختلف فیہ مسئلہ ہے کہ خود امام رازیؒ نے اپنی یہ تفسیر کہاں تک لکھی تھی، اور بعد کے لوگوں نے کہاں سے لکھا، اور کتنے اور کن کن لوگوں نے لکھا...!!!

8.6.4 منہج تفسیر

امام رازی کی 'تفسیر کبیر' تفسیر بالرائے کی اہم تفسیر مانی جاتی ہے۔ عموماً تفسیر بالرائے میں مفسرین کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی علمی مہارت کے پیش نظر کسی ایک فن کو بنیاد بنا کر اپنی تفسیر مرتب کر لیتے ہیں، اور اسی بنیاد پر ان کے مناہج کو طے کر لیا جاتا ہے۔ امام رازی کی یہ تفسیر اس اعتبار سے دوسری تفسیروں سے الگ ہے۔ امام رازی اگرچہ علم کلام اور فلسفہ میں مہارت رکھتے تھے، لیکن قرآنی آیات کی تفسیر بیان کرنے میں آپ نے ان کے ساتھ دیگر بہت سے علوم وفنون کو زیر بحث لایا ہے۔

امام رازی کی یہ تفسیر اگرچہ تفسیر بالرائے کی نمائندہ تفسیر ہے لیکن اس کے باوجود اس میں تفسیر بالماثور کے منہج کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ امام رازی تفسیر بیان کرنے میں ایک آیت کی تفسیر کسی دوسری آیت سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں، احادیث، آثار اور اسلاف کے اقوال بھی بڑی تعداد میں نقل کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ احادیث وآثار نقل کرتے ہوئے آپ اس کی صحت وسقم کا خیال نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی اسانید کا تذکرہ فرماتے ہیں، مثلاً "صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي "۔ امام رازیؒ نے اس حدیث کو تین جگہوں پر استعمال کیا ہے، (ج:1، ص:194۔ ج:1، ص:273۔ ج:22، ص:20) لیکن ان میں سے کسی بھی جگہ اس حدیث کی سند بیان نہیں کی ہے اور نہ ہی کسی حدیث کی کتاب کا حوالہ درج کیا ہے۔ "حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ" اس حدیث کو امام صاحب نے اپنی تفسیر میں چھ جگہ (ج:12، ص:71۔ ج:14، ص:99۔ ج:24، ص:157۔ ج:26، ص:205۔ ج:27، ص:207۔ ج:31، ص:41) لایا ہے، لیکن ان کی سند اور کتاب کا حوالہ دونوں مذکور نہیں ہیں۔ اسی طرح "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ " یہ حدیث تفسیر کبیر میں دو جگہ (ج:3، ص:161۔ ج:10، ص:99) آئی ہے، لیکن سند اور حوالے مذکور نہیں۔

امام صاحب اپنی تفسیر میں فقہی مباحث بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ چونکہ آپ شافعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، لہٰذا مختلف مسالک ومذاہب کو ان کے دلائل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد شافعی مسلک کو مستحکم دلائل کے ساتھ ترجیح دیتے ہیں۔

تفسیر کبیر میں اہل سنت والجماعت کے عقائد کے اثبات اور معتزلہ کے ابطال کے متعلق بہت اہم اور مفید بحثیں موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے امام رازی اہل سنت والجماعت کے زبردست داعی تھے، لہٰذا آیات کی تاویل وتوجیہ میں جمہور مفسرین اور اہل سنت کے اقوال کو ترجیح دیتے ہیں، اور ان کے عقائد ونظریات کو بہت ہی قطعیت اور پختگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جبکہ اس کے بالمقابل معتزلہ اور کرامیہ کے عقائد اور نظریات کی اسی شدت کے ساتھ تردید اور ابطال کرتے ہیں۔ امام صاحب کے معتزلہ اور کرامیہ وغیرہ کلامی فرقوں سے اکثر

مناظرے اور مباحثے ہوتے رہتے تھے، بسا اوقات امام صاحب کو ان کی وجہ سے مختلف شہروں سے نکالا بھی گیا، اِس تفسیر کی تالیف کا سبب بھی وہی تھے، لہٰذا امام صاحب ان کے شدید مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جن آیتوں سے استدلال کر کے انہوں نے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور تائید حاصل کی ہے، امام صاحب ان کی تردید اور ان کے استدلال کو غلط ثابت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ آپ عقلی بنیادوں پر بھی ان کے نظریات کا ابطال بھی ثابت کرتے ہیں۔

امام صاحب کے زمانہ میں منطق و فلسفہ کا بڑا زور تھا۔ ان کی وجہ سے عوام میں غلط فہمیاں پھیل رہی تھیں، اور اسلامی تعلیمات سے متعلق طرح طرح سے اعتراضات اور شکوک و شبہات پھیلائے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس دور میں عقلیت پسندی کا بڑا رجحان تھا۔ امام صاحب بھی ان علوم کے بلند پایہ عالم تھے۔ چنانچہ تفسیر کے دوران امام صاحب اسلامی تعلیمات سے متعلق اعتراضات اور شکوک و شبہات کا انہی علوم کے ذریعہ ازالہ کرتے ہوئے فلاسفہ یونان کے اسلام مخالف اقوال و نظریات کو صراحت سے بیان کر کے بھرپور طریقہ پر جواب دیا ہے۔ امام صاحب کا طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ جن آیتوں کی کوئی بات عقل سے ماوراء معلوم ہوتی ہیں ان کی تفسیر عام طریقے سے کرنے کے بعد ان سے متعلق فلسفیانہ تعبیر بھی پیش کرتے ہیں۔ بہت سے مقامات پر شرعی احکام کے اسرار اور ان کی حکمتیں بھی امام صاحب نے زیر بحث لائی ہیں۔

امام صاحب نحو، صرف، لغت اور بلاغت سے متعلق مباحث کا بھی تذکرہ کرتے ہیں، اور ان سے متعلق قرآنی اعجاز پر روشنی ڈالتے ہیں۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں مذکورہ نقلی علوم کے ساتھ ساتھ سائنس، علوم طبیعیات و ریاضیات اور دیگر علوم عقلیہ کی روشنی میں بھی قرآنی آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں، اور ان سے متعلق اہم مباحث اپنی تفسیر میں زیر بحث لاتے ہیں۔ چنانچہ افلاک و بروج، آسمان و زمین، حیوانات، نباتات، جمادات اور اجزائے انسانی سے متعلق مفید معلومات فراہم کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات و نظریات کی صداقت اور راہ نجات ثابت کرتے ہیں۔

8.6.5 تفسیر مفاتیح الغیب کے اردو تراجم

تفسیر کبیر کی اہمیت کے پیش نظر اردو زبان میں اس کے ترجمہ بھی کئے گئے ہیں۔ اس تفسیر کے چار اردو ترجموں کا پتا چلتا ہے۔ لیکن ان کے متعلق پوری تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔ تاہم جو کچھ معلوم ہو سکا یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

پہلا ترجمہ "فضل قدیر" کے نام سے ہے، جسے مفتی محمد خان قادری نے کیا ہے، یہ ترجمہ غالباً مکمل ہے اور مرکز تحقیقات اسلامیہ لاہور سے 2010ء میں اس کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔ دوسرا ترجمہ "سفر صغیر" کے نام سے ہے، جسے مولوی محمد اسحاق دہلوی نے انجام دیا ہے، اور اس کی اشاعت مصلح المطابع دہلی سے ہوئی۔ تیسرا ترجمہ مولانا خلیل احمد بن جناب سراج احمد کا کیا ہوا ہے اور "سراج منیر" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ مطبع شمس الاسلام پنجاب سے 1900ء میں طبع ہوا۔ چوتھا ترجمہ مرزا حیات کی سرپرستی میں انجام پایا لیکن اس کے مترجم کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ ترجمہ مطبع کرزن پریس دہلی سے شائع ہوا ہے۔

8.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- منہج کے اعتبار سے بنیادی طور پر تفسیر کی دو قسمیں ہیں، ایک تفسیر بالماثور اور دوسرا تفسیر بالرائے۔
- امام رازی کی پیدائش 543ھ /544ھ میں رے میں ہوئی۔ آپ علم کلام اور منطق وفلسفہ کے بڑے عالم تھے۔ معتزلہ اور کرامیہ سے اکثر مناظرے کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے آپ کو مختلف شہروں سے نکالا بھی گیا، اور پھر بالآخر اس تفسیر کی تالیف کا سبب بھی یہی کلامی فرقے ہوئے۔
- تفسیر طبری اولین تفسیر ہے جو مکمل قرآن کریم کی تفسیر پر محیط ہے۔ تفسیر طبری تفسیر بالماثور کی نمائندہ کتاب ہے؛ تاہم روایت کی صحت وضعف کا مصنف نے اہتمام نہیں کیا ہے اور ہر طرح کی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ تفسیر طبری میں تابعین کی تمام تفسیری علوم کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔
- امام رازی کی تفسیر کا اصل نام ''مفاتیح الغیب'' ہے لیکن زیادہ مشہور ''تفسیر کبیر'' کے نام سے ہوئی۔ یہ تفسیر 32 جلدوں میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن امام صاحب اپنی تفسیر مکمل نہیں کر سکے تھے۔ بعد میں اسے نجم الدین مخزومی اور شہاب الدین دمشقی نے مکمل کیا۔ تفسیر کبیر، تفسیر بالرائے کی نمائندہ تفسیر ہے۔ امام صاحب نے اس تفسیر کو علم کلام، منطق وفلسفہ، عربی قواعد، سائنس اور علوم عقلیہ کی مدد سے انجام دیا ہے۔

8.8 نمونہ امتحانی سوالات

8.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. تفسیری مناہج کی بنیادی طور پر کتنی قسمیں ہیں:

(a). دو (b). پانچ (c). چار (d). چھ

2. امام رازی کے مناظرے اکثر کن کے ساتھ ہوا کرتے تھے؟

(a). جبریہ وقدریہ (b). اشاعرہ (c). معتزلہ وکرامیہ (d). جہمیہ

3. ''فيه كل شيء إلا التفسير'' کس تفسیر کے بارے میں کہا گیا ہے؟

(a). تفسیر قرطبی (b). تفسیر بیضاوی (c). تفسیر کبیر (d). تفسیر الکشاف

4. امام رازی نے محض سورہ فاتحہ سے کتنے مسائل کے استنباط کی بات کہی تھی؟

(a). بارہ ہزار (b). دس ہزار (c). دس سو (d). نو ہزار

5. امام رازی کی تفسیر کس نے مکمل کی؟

(a). مجد الدین جیلی (b). محمد الخطیب شر بینی (c). نظام الدین نیشاپوری (d). سب غلط

6. درج ذیل میں سے کون تفسیر الفتح الکبیر کا اردو ترجمہ نہیں ہے؟

(a). فضل قدیر (b). سفر صغیر (c). سراج منیر (d). فتح القدیر

7. امام طبری کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

(a). 444ھ (b). 223ھ (c). 545ھ (d). 224ھ

8. تفسیر طبری تفسیر کی کس قسم میں داخل ہے؟

(a). تفسیر بالرائے (b). تفسیر بالماثور (c). صوفی تفسیر (d). تفسیر بالاحکام

9. تفسیر طبری کس عہد کی یادگار ہے؟

(a). اموی (b). مملوک (c). عباسی (d). عثمانی

10. "تفسیر طبری جیسی کتاب کسی نے نہیں لکھی" یہ کس کا قول ہے؟

(a). علامہ سبکی (b). علامہ بیضاوی (c). خطیب بغدادی (d). ابن خلکان

8.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. تفسیری مناہج اور اس کی قسموں پر ایک مضمون لکھیے۔
2. امام رازی کے ابتدائی حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔
3. تفسیر کبیر کے مفسرین کون کون ہیں؟ نوٹ تحریر کیجیے۔
4. تفسیر طبری کی خصوصیات پر گفتگو کیجیے
5. جریر طبری کے تصنیفی احوال پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

8.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. تفسیر کے اہم مناہج کا تعارف کروائیے۔
2. تفسیر مفاتیح الغیب کا تعارف کراتے ہوئے اس کی اہم خوبیوں کا جائزہ لیجیے۔
3. تفسیر طبری کا تعارف کراتے ہوئے اس کے منہج پر گفتگو کیجیے۔

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تفسیر مفاتیح الغیب : امام فخر الدین رازی
2. امام رازی : مولانا عبد السلام ندوی
3. بحث حول تفسیر الفخر الرازی : محقق عبد الرحمٰن بن یحییٰ المعلمی
4. علوم القرآن : ڈاکٹر عبد الرؤف ظفر
5. تاریخ تفسیر و مفسرین : پروفیسر غلام احمد حریری
6. ظفر المحصلین فی احوال المصنفین : حنیف گنگوہی
7. الطبقات الشافعیہ : علامہ تاج الدین سبکی
8. وفیات الاعیان : ابن خلکان
9. مقدمہ تفسیر طبری : ابو جعفر طبری
10. مناہج المفسرین : منیع بن عبد الحلیم محمود

معروضی سوالات کے جوابات

1. A	2.C	3. C	4. B	5. D
6. D	7. D	8.B	9.C	10. C

اکائی 9: مشہور اردو تفسیریں

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 مولانا اشرف علی تھانوی

9.3 بیان القران

9.3.1 انداز تحریر

9.4 مولانا ابو الکلام آزاد

9.5 تعارف ترجمان القرآن

9.5.1 تعارف ترجمان القرآن بزبان مولانا ابو الکلام آزاد

9.5.2 مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت

9.6 مولانا آزاد کا تدبر قرآن

9.6.1 سورہ فاتحہ کے ذریعہ دین کے مقاصد کی وضاحت

9.6.2 ترجمان القرآن کی دیگر خصوصیات

9.7 اکتسابی نتائج

9.8 نمونہ امتحانی سوالات

9.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

9.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

9.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

9.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

اردو زبان کو بولنے اور سمجھنے والے کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بر صغیر میں اس زبان کو تقریبا سبھی لوگ بولتے ہیں اور ایک طبقہ اس کو بآسانی سمجھتا بھی ہے۔ اس وجہ سے علماء و مفسرین نے قرآن و حدیث کے مطالب و مفاہیم کو سمجھنے اور سمجھانے کی غرض سے اس زبان میں بہت ساری تصانیف لکھیں۔ ہندوستان میں دوسری زبانوں کے علاوہ جن ادبی سرمایوں کو اردو میں منتقل کیا گیا ان میں ایک بڑی تعداد قرآن کریم کے ترجموں کی ہے۔ مفسرین قرآن نے حالات، علمی رجحانات، تقاضوں اور عصر حاضر کی فکری ضرورتوں کے تحت پورے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ تفسیریں لکھی اور انہیں سود مند بنانے کی کوشش کی۔ قرآن کے بے شمار تراجم منظر عام پر آئے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی "بیان القرآن" اور "ترجمان القرآن" بھی ہے۔ مصنفین کی یہ خواہش تھی کہ عام وخواص لوگ قرآن واس کی تعلیمات سے قریب تر ہوں۔ اس لیے نہایت سہل وآسان زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ لکھ کر عوام کے لیے آسانی بہم پہنچائی اور یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ عربی زبان کے بعد سب سے زیادہ تفسیر اردو زبان میں لکھی گئیں۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ

- مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر "بیان القرآن" اور مولانا ابوالکلام آزاد کی "ترجمان القرآن" سے متعارف کرانا ہے۔
- آپ کو ان تفاسیر کی خصوصیات وخوبیوں کا علم ہو جائے اور ان کے طرز تفسیر سے آگہی ہو جائے۔

9.2 مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا اشرف علی تھانوی 19/ستمبر 1863ء کو قصبہ تھانہ بھون میں پیدا ہوئے جو ضلع مظفر نگر کی تحصیل کیرانہ میں واقع ہے۔ آپ کا شجرہ نسب فاروقی خاندان سے ملتا ہے اور نانہال کی طرف سے آپ علوی ہیں۔ والد محترم کا نام منشی عبد الحق تھا جو علمی لحاظ سے بڑا مقام رکھتے تھے۔ فارسی کے بہترین عالم، اچھے انشاء پرداز اور ذہین شخصیت کے مالک تھے۔ دادھیالی نام آپ کا عبد الغنی تھا لیکن نہیال والوں نے اشرف علی رکھا اور اسی نام سے شہرت ملی۔ آپ کے آباؤ اجداد کا شمار تھانہ بھون کے اہل ثروت حضرات میں ہوتا تھا۔ پانچ سال کے تھے کہ والدہ محترمہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور مولانا کے والد محترم نے دونوں بیٹوں کی ذمہ داری اپنے سر لی اور بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ ذہنی رجحانات کو مد نظر رکھتے ہوئے دونوں بیٹوں کی تعلیم وتربیت کا معقول بندوبست کیا۔ اشرف علی بچپن سے ہی دین داری کی طرف راغب تھے عہد طفولت سے صوم وصلاۃ کی پابندی کرتے تھے۔ بچپن میں کوئی مسجد خالی نظر آتی تو اس میں داخل ہو جاتے اور منبر پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دیتے تھے گویا پورا مجمع ان کو سن رہا ہو۔ مولانا اشرف علی کی طبعیت میں انتہائی ترتیب اور سلجھاؤ فطرۃ تھا اگر کوئی شخص بے ربط و مبہم گفتگو کرتا تو طبیعت میں بے چینی پیدا ہو جاتی۔

دینی تعلیم سے اشرف علی نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کیا۔ قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد فارسی کی ابتدائی تعلیم آپ نے

میر ٹھ سے حاصل کی اور فارسی کے نظم ونثر کی تحریر وبیان پر مکمل عبور حاصل کیا۔ اس کے بعد 1878ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا جہاں پانچ سال میں آپ نے دینی علوم کے تمام درجات مکمل کیے۔ دیوبند میں پڑھائی کے دوران اپنی ذہانت وفطانت، لگن وجستجو، چھوٹوں سے محبت بڑوں کا ادب اور ذوق مطالعہ کی عادت نے آپ کو اساتذہ کا نور نظر بنا دیا۔ دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مکہ معظمہ میں قاری محمد عبداللہ مہاجر مکی سے قرأت کی مشق کی جو عرب ممالک میں بھی ماہر فن قاری تصور کیے جاتے تھے۔ فتوی نویسی اور مناظرہ بازی طالب علمی کے زمانے میں شروع کر چکے تھے۔ ایک مرتبہ کسی سائل کو طویل جواب میں فتوی دیا تو مولانا یعقوب نے تنبیہاً کہا کہ معلوم ہوتا ہے وقت زیادہ ہے اگر بہت سارے خطوط سامنے ہوں تو کیسے جواب دوگے۔ استاد کی اس نصیحت کا اتنا اثر لیا کہ پھر مختصر جواب دینے لگے۔ مزاج میں سادگی انتہائی درجہ کی تھی، حصول علم کے ساتھ اپنے اساتذہ سے طرز تمدن ومعاشرت بھی نقل کرتے تھے وضع قطع اور بودوباش غرض ہر باب میں سادگی نمایاں تھی۔

فراغت کے بعد مدرسہ فیض عام کانپور سے 1883ء میں درس وتدریس کا سلسلہ باقاعدہ شروع کیا۔ اس دوران مواعظ اور تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ فتویٰ نویسی کا کام بھی اپنے ذمہ لیا۔ کانپور میں آپ کی تدریس وخطابت سے آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا لیکن کچھ وقت ہی فیض عام میں گزارا تھا کہ چندہ کے معاملے میں منتظمین مدرسہ سے اختلاف ہو گیا اور آپ وہاں سے سبکدوش ہو گیے۔ آپ مدرسہ جامع العلوم سے وابستہ ہو گیے اور یہاں پر چودہ برس تک درس وتدریس کی خدمات انجام دی۔ یہاں پر آپ نے سینکڑوں طلبہ کو اپنے علم کے دریا سے فیض یاب کیا جن لوگوں نے علم وفن کو وقار بخشا اور درس وتدریس کو زینت عطا کی۔ اس کے بعد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مشورہ پر ملازمت ختم کر کے تھانہ بھون چلے آئے اور خانقاہ امدادیہ میں قیام فرمایا۔ اس خانقاہ میں آپ نے عظیم علمی، فکری، دعوتی، اصلاحی اور روحانی خدمات انجام دیں۔ کانپور کی زندگی میں آپ کے پاس ملازمت تھی جب کہ تھانہ بھون کی زندگی بے سروسامانی کی تھی لیکن تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود آپ کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، بالآخر آپ کو درویشی میں شہنشاہی نصیب ہوئی اور علم ومعرفت کے اتنے سازوسامان کر گیے کہ ایک طویل عرصے کے لیے علماء کو بہت ساری کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔ دینی علوم کے تقریباً ہر موضوع پر آپ نے طبع آزمائی کی اور بے شمار کتابیں لکھیں۔ آپ کی چند تصنیفات درج ذیل ہیں:

بہشتی زیور، امداد الفتاویٰ، امداد الاحکام، اعلاء السنن، احکام القرآن، الحیلۃ الناجزہ، بیان القرآن، مسائل السلوک، وغیرہ۔ اس کے علاوہ مولانا نے بہت سارے رسائل لکھے جو قرآن کی تفسیر بالخصوص تفسیر بالرائے کرنے والوں کی اصلاحات کے لیے لکھے گیے ہیں۔ مثلا اصلاح تفسیر سرسید، اصلاح ترجمہ دہلویہ (ڈپٹی نذیر احمد دہلوی) اصلاح ترجمہ حیرت (مرزا حیرت دہلوی) توحید الحق، رسالہ ملاحۃ البیان فی فصاحۃ القرآن، التقصیر فی التفسیر وغیرہ۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی آپ کو تصوف، روحانیت، منطق اور علم معقولات سے لگاؤ تھا۔ آپ کو ان مضامین پر قدرت حاصل تھی کہ درس وتدریس کرتے وقت اپنے شاگردوں کے سامنے مشکل سے مشکل بحث کو اس انداز سے سمجھاتے کہ وہ طلبہ کو ذہن نشین ہو جاتی۔ علم منطق سے گہری مناسبت کی وجہ سے مناظرے کی خاص قوت اور حاضر جوابی کا ملکہ حاصل تھا۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اسلام کے ہر شعبے اخلاق، عادات ومعاملات، معاشرت وسیاست اور عقائد واعمال غرض تمام میدانوں میں تجدید واصلاح کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ کی سینکڑوں کتابیں، رسائل، مواعظ، مختلف دینی عنوانات پر مشتمل مسلمانوں کے پاس موجود ہے جس سے خواص وعام فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان تصانیف میں قرآن وسنت کی روشنی میں امت محمدیہ کی رہنمائی کا سامان دستیاب ہے۔ اسی بنیاد پر آپ کو حکیم الامت اور مجدد ملت کے خطاب سے نوازا گیا۔ 9ء جولائی 1943 کی شب آپ نے اس دار فانی کو الوداع کہہ دیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی ایک عظیم مصنف اور بہترین مفسر شمار کیے جاتے ہیں وہ اپنی وسیع علمی تصنیف وتحقیق کے باوجود وسعت نظر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے کیے ہوئے علمی کام کو حرف آخر کا درجہ نہیں دیتے بلکہ دوسروں کے لیے موقع اور گنجائش کو بہتر سمجھتے ہیں۔

9.3 بیان القرآن

بیسویں صدی میں اردو زبان کی مشہور ومعروف تفسیر میں "بیان القرآن" کا شمار ہوتا ہے۔ یہ تفسیر بارہ جلدوں میں پہلی مرتبہ 1916ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ دوسرے ایڈیشن میں نظر ثانی واضافہ کے ساتھ تھانہ بھون سے 1935ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے اس تفسیر کے کئی ایڈیشن اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ آپ نے قرآن کا سادہ اور آسان فہم ترجمہ کیا۔ آپ نے کتابی زبان استعمال کی لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ فصاحت وبلاغت کے ساتھ روانی بھی رہے۔ بیان القرآن میں تفسیری اجزاء کو مختلف عناوین کے تحت الگ الگ حاشیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کا انداز یہ ہے کہ قرآن کی آیت کے نیچے اردو ترجمہ ہے باقی صفحہ پر تفسیری اور توضیحی عبارت درج ہے۔ ترجمہ میں اردو کے محاورات کا استعمال نہیں کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر جگہ کے محاورات الگ الگ ہوتے ہیں اس لیے کتابی زبان استعمال کی ہے تاکہ برصغیر کے گوشے کے لوگ اس کو بآسانی سمجھ سکیں۔ ترجمہ میں بین القوسین جو عبارت بڑھاتے ہیں اس سے بہت سارے اعتراضات اور شبہات دور ہو جاتے ہیں۔

مولانا کی تفسیر کی ورق گردانی کرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ مولانا کا طرز تحریر کافی سلجھا ہوا ہے۔ مولانا تھانوی اس بات کو جانتے تھے کہ ان سے پہلے علماء تفسیر نے بہت تفصیل ووضاحت کے ساتھ قرآن کا ترجمہ وتفسیر کا کام انجام دے چکے ہیں اس لیے مولانا نے جس مضمون کو ضروری سمجھا یا اس میں کسی طرح کا شک وشبہ دیکھا اس کی وضاحت اور تفصیل پیش کی ہے ورنہ مختصراً ترجمہ وتفسیر کیا ہے۔ خود ان کی تفسیر کا مطالعہ کرتے وقت کئی مقامات پر دیکھنے کو ملتا ہے کہ جہاں تفسیر میں تاریخی واقعات کا ذکر ہے ان کے لیے مولانا نے وہیں پر رقم کر دیا ہے کہ جو حضرات تفصیل وتشریح کے خواہش مند ہوں وہ مولانا عبد الحق کی تفسیر حقانی کا مطالعہ کریں کیونکہ مولانا نے تاریخی واقعات میں مولانا عبد الحق کا حوالہ دے کر نقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔

خصوصیات بیان القرآن

تفسیر بیان القرآن میں صحیح روایات اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے یعنی پہلے وہ تفسیر الآیات بالآیات، پھر اس سے جڑے ہوئے حدیث نبوی کا احاطہ کرتے ہیں، اس کے بعد آپ ﷺ کے اصحاب کے اقوال کو فضیلت دیتے ہیں۔ فقہی وکلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے، لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق کے ساتھ شکوک وشبہات کا بھی ازالہ کیا گیا ہے صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی بیان

کیے گیے ہیں۔ تفسیر کرتے وقت مولانا نے فقہی مباحث کو بھی جگہ دی ہے اس معاملے میں مولانا فقہ حنفی سے جابجا استنباط کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اجتہاد کو جگہ نہیں دی ہے بلکہ حنفی مسلک کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں دوسرے فقہی مسالک کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

مولانا تھانوی نے1320ھ /1902ء ربیع الاول کے مہینے کے آخر میں اس ترجمہ لکھنے کی شروعات کی لیکن پہلے پارے کے چوتھائی حصہ کا ترجمہ و تفسیر لکھ ہی سکے تھے کہ یہ سلسلہ کسی ناگزیر وجہوں سے موقوف ہو گیا۔ 1323ھ /1905ء میں دوبارہ اس کام کی شروعات کی اور پایہ تکمیل تک پہونچایا۔ 1326ھ /1908ء میں پہلی مرتبہ اس کو شائع کیا گیا تو ''بیان القرآن'' کے نام سے اسے شہرت ملی اور علماء وعوام میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ پہلی مرتبہ اشاعت کے بعد جب مولانا نے اس کا دوبارہ مطالعہ کیا تو کچھ جگہوں پر قابل قدر اضافہ و ترمیم کیا۔ بقول مولانا اشرف علی تھانوی بیان القرآن کے شائع ہوتے وقت حواشی وغیرہ کی طرز تحریر میں بعض مقامات پر میری تجویز کے خلاف ترمیم کر دی گئی تھی جو مجھ کو ناپسند تھی بناءً علیہ جی چاہتا تھا کہ یہ تفسیر مع ترمیم واضافہ کے اسی طرز پر جس پر میں نے اصل مسودہ لکھا تھا طبع ہو جائے۔ مولوی شبیر علی نے اس کی طباعت کا دوبارہ قصد کیا تو ترمیم واضافہ کا کام شروع ہوا۔ مولوی عبد الکریم تفسیر کے ان جگہوں کا جو اہل علم نے مفید مشوروں سے نواز تھا اس کا مطالعہ کر کے اشتباہ نوٹ کر لیتے اور ان مقامات کو مولانا کے سامنے پیش کرتے۔

مولانا نے اس میں غور وفکر کر کے جابجا مناسب ترمیم کر دی۔ اور دو رسالے (مسائل السلوک، وجوہ المثانی) جو قرآن کریم سے متعلق تھے مع ترجیح الراجح کے بعض حصوں کو شامل کر دیا۔ بعض اہل علم نے کچھ مقامات پر عبارتیں بطور حاشیہ لکھ کر دیں تھیں ان کو حاشیہ میں داخل کر دیا گیا ان عبارتوں کو مولانا تھانوی کے حاشیوں سے الگ کرنے کے لیے محشی لفظ لکھ کر اضافہ کر دیا گیا۔ ان اضافوں کے بعد مولانا نے ''بیان القرآن'' سے ''مکمل بیان القرآن'' نام تجویز کیا۔ 1353ھ میں مطبع تھانہ بھون سے بڑے اہتمام کے ساتھ دوبارہ بارہ جلدوں میں شائع کیا گیا اور اپنی اس شکل میں آج بھی موجود ہے۔ اب تک ہر جلد میں ڈھائی پارہ کے اختتام کی ترتیب رکھی جاتی تھی لیکن 2012ء میں مکتبہ دیوبند سے نئی طباعت جو منظر عام پر آئی ہے اس میں ڈھائی پارے کی ترتیب کا خیال نہ رکھتے ہوئے بلکہ پوری تفسیر کو تین جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے پہلی جلد 611 صفحات پر مشتمل ہے جس میں سورہ فاتحہ سے لے کر سورہ انعام تک کا حصہ ہے۔ دوسری جلد میں سورہ اعراف تا سورہ نور 608 صفحات پر پھیلی ہے تیسری اور آخری جلد میں سورہ فرقان تا سورہ الناس جو کہ 744 صفحات پر مشتمل ہے۔

9.3.1 انداز تحریر

بیان القرآن کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے ترجمے میں عام وخواص دونوں کی سمجھ کی رعایت رکھی ہے۔ مشکل اور دقت طلب الفاظ کا استعمال اپنی تفسیر میں نہیں کیا ہے تاکہ درمیانی درجے کا قاری بھی اسے آسانی سے سمجھ سکے۔ نہ ہی اتنا آسان اور سہل کہ ایک عام کتاب اور قرآن کے ترجمے کا فرق ہی نہ رہے۔ البتہ جہاں گہری اور مشکل علمی بحثیں ہیں جو علم کلام، نحو، صرف وقرأت جیسے مسائل سے متعلق ہیں ان کی وضاحت کے لیے قدیم مفسرین کے حوالے دیے ہیں۔ مولانا نے حاشیے کی زبان عربی رکھی

ہے تا کہ عربی داں شخص ہی اس کو سمجھ سکے کیونکہ عوام کے لیے ایسے مسائل نہ تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ:

”حاشیے کی زبان عربی اس لیے تجویز کی ہے کہ عوام اس کو دیکھنے کی ہوس ہی نہ کریں، ورنہ جب زبان سمجھتے اور مضامین نہ سمجھتے تو بہت پریشان ہوتے“۔

مولانا نے اپنے کیے ہوتے ترجمے میں جن بات کا خاص خیال رکھا ہے اس کو اپنے مقدمے میں درج کیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

1- قرآن مجید کا آسان ترجمہ کیا ہے جس میں قابل فہم ہونے کے ساتھ تحت لفظی کی بھی رعایت کی ہے۔

2- ترجمے میں خالص محاوراتی استعمال نہیں کیے گیے دووجہ سے اول تو میں قصباتی ہوں، محاورات پر عبور نہیں۔ دوسرے یہ کہ محاورات ہر مقام کے جدا جدا ہوتے ہیں اگر دہلی کے محاورات لیے جاتے تو اہل لکھنؤ نہ سمجھتے یہاں کے محاورات وہاں نہ سمجھتے ان دونوں کے محاورے حیدرآباد اور مدراس والے نہ سمجھتے غرض ایسے محاورات عام فہم نہیں ہوتے اور اردو ترجمہ کم از کم ایسا تو ہو کہ قریب قریب ہندوستان کے سب حصے تو اس کو سمجھ جاویں اس لیے کتابی زبان لی ہے کہ فصاحت کے ساتھ اس میں سلاست بھی ہے۔

3- نفس ترجمہ کے علاوہ جس مضمون کو بہت ضروری دیکھا کہ اس پر توضیح ترجمہ کی موقوف ہے یا کوئی شبہ خود قرآن کے مضمون سے ظاہراً پیدا ہوتا تھا اس کا جواب یا مضمون قرآنی کسی مشہور تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتا تھا اس کی تحقیق یا اسی قسم کی کوئی ضروری بات ہوئی اس کو ”ف“ بناکر بڑھا دیا باقی لطائف ونکات یا طویل عریض حکایات یا فضائل یا بہت سے مسائل وغیرہا سے تفسیر کو طویل نہیں کیا گیا۔ غرض یہ کہ مضامین کا جمع کرنا مقصود نہیں بلکہ محض حل قرآن ورفع ضرورت لیکن باوجود اتنی رعایت کے بھی غیر علماء وطلبا کے لیے بہت سے مقامات میں علماء سے استغناء نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مناسب بلکہ واجب یہ ہے کہ ایسے حضرات صرف اپنے مطالعہ وفہم پر اعتماد نہ فرماویں بلکہ حسب ضرورت علماء یا منتہی طلبہ سے اس کو سبقاً سبقاً سمجھ کر پڑھ لیں۔ ورنہ اقل درجہ اتنا تو ضرور ہے کہ مطالعہ کے وقت جہاں ذرہ برابر بھی اشتباہ رہے وہاں خود غور کرکے نہ نکالیں بلکہ پنسل سے نشان کرکے علماء سے وہ عبارت دکھلا کر حل کرلیں اور بدون اس کے احتمال بلکہ یقین غلط فہمی کا ہے۔

4- جس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال مفسرین کے ہیں ان میں سے جس کو ترجیح معلوم ہوئی صرف اس کو لے لیا بقیہ سے تعرض نہیں کیا۔

5- مطلب قرآنی کی تقریر کہیں تو اس طرح کی ہے کہ مضمون کا ارتباط خود ظاہر ہو جاوے اور کہیں ایک سرخی ربط کی لکھ کر اس کی تقریر کردی گئی ہے۔

6- اختلافیات کی تفسیر میں صرف مذہب حنفی لیا گیا ہے اور دوسرے مذاہب بشرط ضرورت حاشیہ میں لکھ دیے گیے۔

7- چونکہ نفع عوام کے ساتھ افادہ خواص کا بھی خیال آگیا اس لیے ان کے فائدہ کے واسطے ایک حاشیہ بڑھایا ہے جس میں مکّیت ومدنیت سورو آیات وغیر مشہور لغات وضروری وجوہ بلاغت ومغلق ترکیب وخفی الاستنباط فقہیات وکلامیات واسباب نزول

وروایات واختلاف قرأت مغیرہ ترکیب یا حکم وتوجیہہ ترجمہ وتفسیر ایجاز کے ساتھ مذکور ہیں جس کو متوسط درجہ کا طالب علم بے تکلف سمجھ سکتا ہے۔ یہ حاشیہ درس وتدریس کے وقت بہت کام آسکتا ہے۔

مولانا نے اپنے ترجمے وتفسیر میں جن کتابوں سے مدد لی ہے اس کی فہرست آپ نے پیش کی ہے۔ یہ درج ذیل ہیں:

1- تفسیر بیضاوی 2-تفسیر جلالین 3-تفسیر رحمانی 4-اتقان فی علوم القرآن 5-معالم التنزیل

6-روح المعانی 7-مدارک 8-خازن 9-تفسیر فتح المنان 10-تفسیر ابن کثیر

11-لباب النقول 12-در منثور 13-تفسیر کشاف 14-قاموس

ایسی تفاسیر بہت کم نظر آتی ہے جو بیک وقت حدیث، فقہ اور تصوف کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہو مولانا کو یہ کمال حاصل ہے کہ انہوں نے تمام علوم کو اپنی تفسیر میں یکجا کر دیا اس لیے مولانا کی تفسیر کو ان علوم کا جامع کہا جاتا ہے جس کی مثال اردو زبان میں شاذونادر ہی ملتی ہے اس لیے اس تفسیر کو عدیم النظر نہ کہا جائے تو کم از کم قلیل النظر کہا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ اردو کی دیگر تفسیروں میں یہ خوبیاں ایک ساتھ نہیں دیکھنے کو ملتی۔ تفسیر بیان القرآن اردو میں ایک جامع، مختصر ومدلل تفسیر ہے اس میں مختلف زاویہ نگاہ سے خواہ وہ لغوی، نحوی، فقہی اور کلامی ہو مناسب انداز سے بحث کر کے مطمئن کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بیان القرآن میں حدیث نبوی اور آثار صحابہ کی پوری رعایت رکھی گئی ہے اس لیے اس تفسیر کو محققانہ کہنا بے جانہ ہو گا۔ تفسیر ''بیان القرآن'' مولانا کے کارناموں کا شاہکار ہے۔

اس تفسیر کی حقیقت اور صداقت کا احساس خود مولانا کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

> یہ تفسیر میں نے کامل شرح صدر کے ساتھ لکھی ہے۔ اس کی قدر تو ان لوگوں کو ہو گی جنہوں نے کم سے کم بیس معتبر تفسیروں کا مطالعہ کیا ہو۔ وہ دیکھیں گے وہ مقامات جہاں سخت اشکالات واختلافات واقع ہوئے ہیں ان کا حل کسی سہولت کے ساتھ قوسین کے اندر صرف چند الفاظ بڑھا دینے سے ہو گیا۔ اللہ کا محض فضل ہے۔

9.4 مولانا ابو الکلام آزاد

ہندوستان کی تاریخ جب صدی کے اعتبار سے مرتب کی جاتی ہے تو بیسویں صدی اس طور پر نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے کہ ایک غلام اور مظلوم ملک کو مولانا ابو الکلام آزاد جیسی شخصیت ملی ہے جو اپنے وقت کے بے باک صحافی، میدان سیاست میں امام، تحریک آزادی ہند کے عظیم قائد، فقیہ الامۃ، صاحب بصیرت، شعلہ بیاں مقرر ایک بہترین مفسر قرآن عالم دین تھے۔ قوم وملت کی فکر کے ساتھ ساتھ ملک کی ترقی کی فکر ہمیشہ ان کے خون میں دوڑتی رہتی تھی قیامت تک ہندوستان میں پیدا ہونے والا ایک ایک شخص خواہ وہ کسی بھی مذہب وملت کا ہو ان کا مرہون منت ہے اس لیے کہ مولانا کو ہندوستان کی آزادی کے بعد جب سب سے پہلے وزیر تعلیم مقرر کیا گیا تو مولانا نے اس وقت کے تمام علوم وفنون کو ہندوستان کے مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں میں فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی اور

پچھڑی قوموں کی سربلندی کے لیے مختلف سہولیات اور قوانین بنائے یہ سب کچھ محض اس لیے کیا کہ ملک کو ترقی پذیر بنایا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے وہ ادیب، انشاپرداز، ماہر سیاسیات، مفکر تعلیم، شاعر، عالم دین اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کے آباؤ واجداد مغل بادشاہ بابر (و:1530ء) کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان منتقل ہوئے۔ پہلے آگرہ اور بعد میں دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کی ولادت جس گھر میں ہوئی وہ علم و عمل کا گہوارہ تھا۔ یہ خاندان علم حدیث اور دعوت و تبلیغ میں ہمیشہ متحرک رہا۔ 11 نومبر 1888ء مکہ معظمہ میں آپ کی پیدائش ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بعد میں حرم شریف میں آپ کو درس لینے کا موقع ملا۔ والد محترم مولانا خیر الدین بسبب علاج کلکتہ آگیے کچھ دن ہی گذرے تھے کہ والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد والد محترم کو بچوں کی تعلیم کی حصولیابی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ آپ بذات خود عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ ابتدائی دنوں میں آپ نے تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیے لیکن جب مولانا خیر الدین کی مصروفیات میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو آپ نے دلی کے ایک بزرگ محمد یعقوب کو عربی اور منطق پڑھانے پر فائز کیا اور فارسی و فقہ کی تعلیم خود ہی دیتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد والد کی طبیعت علیل رہنے لگی تو آپ نے بچوں کی تعلیمی ذمہ داری مکمل طور پر مولوی نذیر الحسن انبیٹھوی کو سونپ دی۔ مولانا کو اس بات کا زندگی بھر ملال رہا کہ آپ نے باقاعدہ کسی بڑے مدرسہ سے استفادہ نہ کیا۔ مطالعے کا شوق آپ کو بچپن سے تھا، غیر درسی کتابوں کا مطالعہ درسی کتابوں کی کتب بینی سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوا۔ مولانا آزاد کا مذہبی شعور بڑا پختہ تھا، اس مذہبی شعور میں خاندانی پس منظر کے ساتھ ان کی محنت و ریاضت کا بھی عمل دخل ہے۔

مولانا نے جب سرسید کو پڑھنا شروع کیا تو سرسید کے خیالات وافکار نے مولانا کے ذہن و دماغ میں ہلچل پیدا کر دی، آپ نے سرسید کی تمام تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا۔ سرسید کی تصنیف نے مولانا کو علوم جدید کے نئے سرچشمے سے آشنا کرایا۔ جس سے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ جدید تعلیم میں سائنس، فلسفہ اور ادب کی تعلیم حاصل کیے بنا کوئی مکمل عالم نہیں ہو سکتا، تو انہوں نے سرسید کے سارے لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ مولانا کو اللہ نے بے پناہ صلاحیت و غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی۔ آپ نے اپنے طور پر انگریزی، فرانسیسی و ترکی زبانوں کو سیکھا۔ مولانا کا علمی خزانے کی فہرست طویل ہے، ذیل میں چند مشہور تصانیف کا ذکر ہے:

ترجمان القرآن، تذکرہ، غبار خاطر، الدین القیم، خصائص مسلم، البرہان وغیرہ۔

تفسیر ترجمان القرآن کو مولانا آزاد کے علمی کارناموں میں بڑی اہمیت حاصل ہے جو سادگی سلاست، اور اسلوب کے اعتبار سے ان کی متوازن طرز تحریر کا آئینہ ہے۔ 22 فروری 1958ء کو علم وادب اور اپنے نادرونایاب کارناموں سے تہلکہ مچادینے والی شخصیت ابوالکلام آزاد کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

9.5 تعارف ترجمان القرآن

مولاا ابوالکلام آزاد نے 1916ء میں البلاغ کے مجلے میں ترجمان القرآن اور تفسیر البیان لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن یہ کام گوناگوں مصیبت و مشکلات کی وجہ سے 15 سال تک ملتوی ہوتا رہا کیونکہ اعلان کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ حکومت بنگال نے صوبے سے

باہر نکل جانے کا حکم دے دیا تو مولانا رانچی چلے گیے۔ مولانا نے جب ترجمہ لکھنے کا اعلان کیا تھا تو اس وقت پانچ پارے کا ترجمہ مکمل ہو چکا تھا اور سورہ آل عمران تک کی تفسیر ہو چکی تھی۔ مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلم بند تھا۔ کام میں برق رفتاری لانے کے لیے مولانا نے تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ مولانا نے اپنے شب وروز کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ ہفتے میں تین روز البلاغ کی ترتیب، دوروز ترجمہ قرآن اور دوروز تفسیر کے لیے صرف کرتے تھے۔ ترجمان القرآن لکھتے وقت آپ کے پیش نظر تین چیزیں تھیں۔ ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ تفسیر عام تعلیم کے ترجمہ، مطالعے کے لیے تفسیر اور اہل علم و نظر کے لیے مقدمہ۔ سن 1916ء میں حکومت ہند نے نظر بندی کا حکم دے دیا تو اس وقت مولانا کے قیام گاہ کی تلاشی لی گئی اور جس قدر کاغذات، کتابیں ملیں وہ سب لے گیے جس میں ترجمہ و تفسیر کا مسودہ بھی تھا۔ اس وقت تک آٹھ پارے کا ترجمہ اور سورہ نساء کی تفسیر مکمل ہو چکی تھی جس کا ایک صفحہ بھی مولانا کو بعد میں نہ مل سکا، اگر ملا بھی تو کارآمد نہ تھا۔ مولانا نے پھر سے ان آٹھ پاروں کا ترجمہ لکھا اور 1918ء میں قرآن پاک کا ترجمہ مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد پھر مولانا کی قید و بند کی زندگی اور پھر سے مسودے کی بربادی نے مولانا کو نڈھال کر دیا تھا لیکن مولانا نے ہمت نہ ہاری اور ترجمان القرآن کو دوبارہ لکھنے کی کوشش کی جو 1930ء میں آخری سورت کے ترجمے و ترتیب سے فارغ ہو سکے۔ جس کی پہلی جلد 1931ء میں جید برقی پریس سے شائع ہو کر پہلا ایڈیشن منظر عام پر آیا۔ جو سورہ فاتحہ سے سورہ انعام تک ہے۔ جب کہ دوسری جلد سورہ اعراف سے المومنون پر مشتمل ہے جو کہ 1936ء میں مدینہ برقی پریس بجنور سے شائع ہوئی۔

ترجمان القرآن مولانا آزاد کی زندگی میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری جلد اٹھارہویں پارے کی سورہ المومنون پر ختم ہوئی تھی جس کو بعد میں چار جلدوں میں ساہتیہ اکادمی دہلی نے شائع کیا۔ جس کی پہلی جلد 554 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس میں سورہ فاتحہ کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ دوسری جلد سورہ بقرہ تا سورہ انعام 884 صفحات پر مشتمل ہے، تیسری جلد 902 صفحات سمیٹے ہوئے سورہ اعراف تا سورہ یوسف تک ہے اور چوتھی جلد سورہ الرعد تا سورہ نور 1062 صفحات پر مشتمل ہے۔ ترجمان القرآن کا نامکمل رہ جانا اس کے چاہنے والوں پر بہت شاق گزرا تھا اس لیے مولانا غلام رسول مہر نے اس کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا۔ چنانچہ انہوں نے الہلال والبلاغ اور مولانا کی دوسری تحریروں کی مدد سے باقی سورتوں کا ترجمہ، تفسیر اور تشریح کو "باقیات ترجمان القرآن" کے نام سے 1962ء میں شائع کیا۔ ان تمام کوششوں کے باوجود ترجمان القرآن سے عام لوگوں کے استفادہ کرنے میں کئی دشواریاں تھیں۔ پہلے ساہتیہ اکادمی نے چار جلدوں میں شائع کیا پھر باقیات ترجمان القرآن کے نام سے ایک علیحدہ جلد منظر عام پر آگئی اس کے بعد بھی تشنگی باقی رہ گئی۔ مولانا مسعود اظہر ندوی نے "تلخیص ترجمان القرآن" لکھ کر ان تمام دشواریوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مولانا ندوی کی اس تلخیص کو مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے 2006ء میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا جو 984 صفحات پر مشتمل ہے۔

9.5.1 تعارف ترجمان القرآن بزبان مولانا ابوالکلام آزاد

دیباچہ ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں:

> ترجمان القرآن کی ترتیب سے مقصود یہ تھا کہ قرآن کے عام مطالعہ و تعلیم کے لیے ایک درمیانی ضخامت میں زیادہ مطول تفاسیر سے مقدار میں کم، چنانچہ اس غرض سے یہ اسلوب اختیار کیا گیا کہ پہلے

ترجمہ میں زیادہ سے زیادہ وضاحت کی کوشش کی جائے، پھر جابجا نوٹ بڑھا دیے جائیں، اس سے زیادہ بحث و تفصل کو دخل نہ دیا جائے، باقی رہا اصول اور تفسیری مباحث کا معاملہ تو اس کے لیے دو الگ الگ کتابیں مقدمہ اور البیان زیر ترتیب ہیں۔

9.5.2 مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت

تفسیر ترجمان القرآن فہم قرآن کے حوالے سے ذہن و فکر کے نئے نئے دروازے کھولتی ہے۔ قرآن کریم مولانا کے غور و خوض کا ماخذ تھا اور آپ کو قرآن حکیم سے ایک طویل رفاقت تھی۔ آپ کی خواہش تھی کہ قرآن کی تعلیمات کو عوام و خواص میں رائج کیا جائے۔ ترجمان القرآن وہ روشن آئینہ ہے جس میں مولانا کی دینی و مذہبی سرگرمیاں پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

> کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ہر ایک سورہ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں۔ اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں، تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے، اور علوم قرآنی کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔۔۔اس تمام عرصے کی گئی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا سمجھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

> قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا۔ تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا۔ فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل و معنی میں جیسا کہ واقع ہوا تھا، ٹھیک ٹھیک ویسا ہی اس کے دلوں میں اتر گیا اور اسے قرآن کے فہم و معرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ صحابہ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورہ سنتے تھے اور سنتے ہی اس کی حقیقت کو پا لیتے تھے۔

مولانا آزاد کی ذہنی، فکری، علمی اور اجتہادی صلاحیتوں کا ایک مختصر خاکہ درج بالا سطور میں ہم نے اس لیے پیش کیا تاکہ قارئین کو مولانا کی قرآنی بصیرت کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ مولانا آزاد نے جو بھی کام کیا اس میں قوم و ملت کو وحدت امت کا سبق یاد دلانا مقصود تھا، تحریک آزادی ہند میں جتنی چیزیں مفید ہو سکتی تھیں وہ سب کچھ مولانا کے عزائم اور اس کی تکمیل کا جزء لاینفک ہوتی تھیں۔ الہلال اور البلاغ نکالنے کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کے اندر غلامی کی زنجیر سے جکڑے رہنے کے بجائے حریت پسندی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا جائے۔ مولانا کے علم کی گہرائی و گیرائی سے لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ جب آپ کی تفسیر شائع ہونے لگی تو لوگوں کو بڑی بے صبری سے انتظار رہنے لگا۔ لوگوں کی چاہت اور خواہش دیکھ کر برطانوی سامراج

نے مولانا کے اوپر بڑے مظالم ڈھائے۔ نظر بند کیا اور ترجمان القرآن کے اوراق و مسودات کو ضبط کرلیا جس کی واپسی کے لیے کوئی اطمینان بخش جواب نہ دیا بالآخر مولانا نے ترجمان القرآن پر دوبارہ کام کرنا شروع کیا لیکن افسوس کہ اب تک ہمارے ہاتھوں میں نامکمل موجود ہے۔

9.6 مولانا آزاد کا تدبر قرآن

مولانا جس قدر صاحب نظر انسان تھے وہ اپنی مثال آپ تھے اور یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ مولانا نے جو تیئس سال تک قرآن پاک کو اپنا موضوع فکر بنایا اس کے نتیجہ میں ان کے اندر گہرائی و گیرائی مزید پیدا ہو گئی اور ایک عہد ساز شخصیت کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

شورش کاشمیری کہا کرتے تھے:

> اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کے بارے میں انہیں خاص ملکہ عطا کیا ہے وہ زمانہ کے فکری تحریک کو بخوبی سمجھتے اور قرآن کو ہر زمانے کی پیچیدگیوں کا حل قرار دے کر انسانی معاشرے کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں، وہ قرآن کی ابدی دعوت پر نظام کائنات کی اس رکھتے ہیں، ان پر بفضل ایزدی علم القرآن کے اس طرح کھلے ہیں کہ ان کے لیے کوئی بھی راہ مسدود و منقطع نہیں، ان کی آواز قرآن کی آواز ہے۔

9.6.1 سورہ فاتحہ کے ذریعہ دین کے مقاصد کی وضاحت

مولانا آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن سورہ فاتحہ سے شروع کی اور اس کی تشریح و توضیح میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ دین حق کے مقاصد پورے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ مولانا خود رقمطراز ہیں:

> اس سورہ کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصے میں اجمال اور تفصیل کا سا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔۔۔ اگر ایک شخص قرآن میں سے اور کچھ نہ پڑھ سکے صرف اسی سورہ کے مطالب ذہن نشین کرلے جب بھی وہ دین حق اور خدا پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کرلے گا اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ماحصل ہے۔

سورہ فاتحہ کی اہمیت پر لکھنے کے بعد مولانا نے دین حق کے ماحصل کو 4 حصوں میں انتہائی جامعیت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔

1. خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھاک تصور: اس لیے کہ انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں۔
2. قانونِ مجازات کا اعتقاد: یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہ اور قدرتی تاثیر ہے اسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص اور نتائج ہیں، نیک عمل کا نتیجہ اچھا ہے اور برے کا برائی۔

3. معاد کا یقین: انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد بھی زندگی ہے اور جزا کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

4. فلاح وسعادت کی راہ اور اس کی پہچان۔

رب العالمین کی تفسیر کے اہم نکات: رب العالمین کی تفسیر کرتے وقت مولانا نے عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ بہترین انداز سے اللہ کی وحدانیت کے ثبوت پیش کیے ہیں اور پھر نظام کائنات نظام پرورش، نظام وحی و رسالت اور نظام وجود معاد سے متعلق شاندار گفتگو کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مختلف اعتراضات کے جوابات بھی دیے ہیں جو ترجمان القرآن کی اہم خصوصیات میں سے ہے۔

تکمیل ختم نبوت کا تقاضا

مولانا آزاد نے تکمیل دین اور ختم نبوت کے متعلق لکھا ہے کہ دین حق کی تکمیل اور نعمت کا اتمام چاہتا ہے کہ اپنی سیرت میں سر تا سر حق وصداقت کا پیکر بن جاؤ، تمہیں " قوامون للله "اور "شهداء بالقسط "ہونا چاہیے یعنی مضبوطی کے ساتھ حق کے لیے کھڑے ہونے والے اور حق وانصاف کے لیے شہادت دینے والے، اپنا ہو یا پرایا، موافق ہو یا مخالف، دوست ہو یا دشمن، جس کے ساتھ معاملہ کرو انصاف کے ساتھ کرو اور جس کے حق میں کوئی بات کہو انصاف کی کہو۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد سیرت النبی کا مطالعہ قرآن فہمی کے لیے لازم قرار دیتے ہیں اور ان الفاظ میں زور دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اسی عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے صاحب قرآن ﷺ کی سیرت وحیات مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض قلوب وعلل ارواح کا کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی حجۃ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن ﷺ کی سیرت ہے اور دراصل قرآن اور حیات نبوی حقیقتاً ایک ہی ہیں۔ قرآن معنی ہے اور سیرت اس کی شرح، قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل، قرآن مصاحف کے صفحات اور اہل علم کے سینوں میں ہے اور صاحب قرآن مجسم وممثل قرآن تھا جو یثرب کی زمین پر چلتا تھا۔

حق یہ ہے کہ قرآن اور صاحب سنت ﷺ کی باہمی یگانگت واتحاد کے باب میں جو کچھ بھی اور جس قدر بھی کہا جائے اس سے بہت کم ہے جس قدر کہنا چاہیے۔

ترجمان القرآن کے ذریعہ امن وامان اور احترام انسانیت کی دعوت اسلام سراپا امن وامان، صلح وآشتی اور احترام انسانیت کا مذہب ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات میں مختلف اعتبار سے اس پر زور دیا گیا ہے۔

"وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ "(انفال: 61) کی تفسیر میں مولانا لکھتے ہیں:

> آیت 61 سے 62 نے کیسے قطعی لفظوں میں قرآن کی دعوت امن کا اعلان کر دیا ہے یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ جنگ بدر کے فیصلے نے مسلمانوں کی فتح مندی آشکارا کر دی تھی اور تمام جزیرہ عرب ان کی طاقت سے متاثر ہونے لگا تھا، تاہم حکم ہوا کہ جب کبھی دشمن صلح وامن کی طرف جھکے، چاہیے کہ

بلا تامل تم بھی جھک جاؤ۔ اگر اس کی نیت میں فتور ہو گا تو ہوا کرے اس کی وجہ سے صلح وامن کے قیام میں ایک لمحہ کے لیے بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔

سورہ انعام آیت 108 جس میں معبودان باطلہ کو برا بھلا کہنے سے روکا گیا ہے اس کی متعلق لکھتے ہیں کہ:"جو لوگ شرک وبت پرستی میں مبتلا ہیں تم انہیں دعوت حق دو مگر برا بھلا نہ کہو۔ اگر تم ان بتوں کو برا بھلا کہو گے تو وہ بھی خدا کو برا بھلا کہیں گے، نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم انہیں گالیاں دو گے وہ تمہیں دیں گے، طلب حق کی بات نہیں رہے گی۔ آپس میں گالی گلوچ کرنا ہو گا"۔

زوجین کے باہمی حقوق اور حقوق نسواں

مولانا آزاد نے حقوق نسواں کے متعلق مختلف آیات کی بڑی جامع تفسیر کی ہے جو اختصار کے باوجود اسلام میں حقوق نسواں کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں۔

سورہ نساء کی آیت 19: "وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا "۔کی تشریح میں لکھتے ہیں: عورتوں کے ساتھ تمہاری معاشرت نیکی وانصاف پر مبنی ہونا چاہیے، ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ محض ہوائے نفس کے ہاتھ اپنی باگ دے دو اور اگر کسی وجہ سے بیوی پسند نہ آئے تو فوراً اسے چھوڑ کر دوسری کرلو، اس طرح کے بے ضبط اور بے قابو طبیعتیں کبھی معاشرتی سعادت حاصل نہیں کر سکتیں، اگر کسی وجہ سے تمہیں بیوی پسند نہیں تو صبر وبرداشت سے کام لو، بہت ممکن ہے کہ ایک بات تمہیں اچھی نہ لگے اور اسی میں تمہارے لیے بہتری وسعادت ہو۔

حقوق نسواں میں طلاق سے متعلق سورہ بقرہ کی آیت نمبر 231 کے ترجمہ وتشریح "ترجمان القرآن" کو ممتاز اور نمایاں کرتا ہے۔ "وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ "(بقرہ: 231)۔ اور دیکھو ایسا نہ کرو کہ اللہ کے حکموں کو ہنسی کھیل بنالو (کہ آج نکاح کیا کل بلاوجہ طلاق دے دی) اللہ کا اپنے اوپر احسان یاد کرو۔ اس نے کتاب وحکمت میں سے جو کچھ نازل کیا ہے اس کے ذریعہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، اسے نہ بھولو اور اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ اس کے علم سے کوئی بات باہر نہیں۔

ازدواجی زندگی کا معاملہ نہایت اہم اور نازک ہے اور مرد کی خود غرضیوں اور نفس پرستیوں سے ہمیشہ عورتوں کی حق تلفی ہوئی ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی کہ اللہ نے انہیں نیک ترین امت ہونے کا مرتبہ عطا فرمایا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم نے ہدایت وموعظت کے تمام پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔۔۔ ضمناً اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس جماعت کے افراد کی ازدواجی زندگی درست نہیں ہے وہ کبھی ایک فلاح یافتہ جماعت نہیں ہو سکتی۔

9.6.2 ترجمان القرآن کی دیگر خصوصیات

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں ترجمہ سے متعلق بہت احتیاط کیا ہے، مولانا زبان وبیان کے بادشاہ تھے لیکن ترجمان القرآن کے ترجمہ میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ زبان سہل اور آسان ہو، اردو پڑھنے لکھنے کا ذوق رکھنے والا ادنی سا طالب علم پورا

ترجمان القرآن بآسانی سمجھ سکے۔ اس کے باوجود بھی تحریر میں ایسی سلاست اور روانی موجود ہے جو ہر دور کے نثری ادب میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ یہ تفسیر پیرایہ بیان کی شگفتگی اور اسلوب کی دلکشی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس وقت تک اردو میں ایسا کوئی ترجمہ نہ تھا جو مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھائیوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں ''مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن نے ایک حد تک یہ کمی پوری کردی ہے۔ ترجمان القرآن کو یہ غیر معمولی مقبولیت خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے میں دو وجہوں سے حاصل ہوئی۔ ایک تو مولانا کی زبان اور ان کے بیان میں وہ غضب کی دلکشی ہے جس نے ان کے ترجمے اور تفسیری اشارات میں اردو ادب کے ایک شاہکار کی شان پیدا کردی ہے۔ دوسرے وہ روح عصر کے محرم ہیں اور کلام الٰہی کے مطالب کو اس حکیمانہ انداز میں سمجھاتے ہیں جس سے نئے زمانے کے تنقیدی ذہن کی بھی تسکین ہو جاتی ہے''۔

اس تفسیر کے مقصد کے بارے میں مولانا آزاد خود لکھتے ہیں:

> مطالب قرآن کے فہم و تدبر کے لیے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے جس میں کتب تفسیر کی سی تفصیلات تو نہ ہوں لیکن وہ سب کچھ ہو جو قرآن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے، اس غرض سے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے امید ہے کہ اہل نظر اس کی موزونیت بہ یک نظر محسوس کرلیں گے، پہلے کوشش کی ہے کہ قرآن کا ترجمہ اردو میں اس طرح مرتب ہو جائے کہ اپنی وضاحت میں کسی چیز کا محتاج نہ رہے، اپنی تشریحات خود اپنے ساتھ رکھتا ہو۔

متعدد جگہوں پر مولانا نے قرآن کریم کی ادبی بلاغت اور قرآنی اعجاز کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور مولانا کیوں نہ کرتے جب کہ اللہ تعالیٰ پوری دنیا کو چیلنج پیش کیا ہے کہ قرآن کی کسی ایک سورت یا ایک آیت کے مثل پیش کرو اگر استطاعت ہو نتیجہ یہ نکلا کہ از ابتدا تا دم تحریر فصاحت و بلاغت کے ائمہ وقت کوشش کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔

مولانا نے ترجمہ و تفاسیر میں مفردات القرآن کی بھی جابجا تشریح کی ہے اور اردو و فارسی کے اشعار کے ذریعہ بھی مطالب کے مقصود کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تفسیر میں ایک داعیانہ سوز پایا جاتا ہے پوری کتاب کا اسلوب ایسا رکھا کہ کہ قاری کا جذبہ عمل بیدار ہو اور اسے قرآن پر عمل کرنا آسان لگے۔

الغرض کہ بے شمار لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ترجمان القرآن فکری اعتدال کے ساتھ ایک شاندار علمی، ادبی اور منہج تفسیر ہے۔

9.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- بیان القرآن کے مصنف اشرف علی تھانوی ہیں آپ اسلام کے ہر شعبے اخلاق، عادات و معاملات، معاشرت و سیاست اور عقائد و اعمال غرض تمام میدانوں میں تجدید و اصلاح کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اسی وجہ سے آپ کو حکیم الامت اور مجدد ملت کے خطاب

سے نوازا گیا۔

- بیان القرآن پہلے بارہ جلد میں شائع ہوئی لیکن جدید طباعت میں اڑھائی پارہ جلد کے اختتام کی ترتیب نہیں ہے بلکہ پوری تفسیر کو تین جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے جس کو 2012ء مکتبہ تھانوی دیوبند نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔
- ہندوستان کی تاریخ جب صدی کے اعتبار سے مرتب کی جاتی ہے تو بیسویں صدی اس طور پر نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے کہ ایک غلام اور مظلوم ملک کو مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت ملی ہے جو اپنے وقت کے بے باک صحافی، میدان سیاست میں امام، تحریک آزادی ہند کے عظیم قائد، فقیہ الامۃ، صاحب بصیرت، شعلہ بیاں مقرر ایک بہترین مفسر قرآن عالم دین تھے۔
- ترجمان القرآن کے مصنف مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، باقیات ترجمان القرآن کی تکمیل مولانا غلام رسول مہر نے کی اور تلخیص ترجمان القرآن مولانا مسعود اظہر ندوی نے لکھی۔
- مولانا آزاد کی تفسیر اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث بے حد ممتاز اور منفرد نظر آتی ہے۔ مولانا کا اسلوب بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے۔

9.8 نمونہ امتحانی سوالات

9.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. اشرف علی تھانوی کی تفسیر کا نام بتائیں۔

(a). بیان القرآن (b). تفہیم القرآن (c). ترجمان القرآن (d). تمام غلط

2. اشرف علی تھانوی کہاں پیدا ہوئے؟

(a). شاملی (b). تھانہ بھون (c). کیرانہ (d). بریلی

3. بیان القرآن پہلی بار کب شائع ہوئی۔

(a). 1916 (b). 1898 (c). 1935 (d). 1947

4. بیان القرآن کتنی جلدوں میں مولانا نے لکھی؟

(a). دس جلد (b). بارہ جلد (c). چھ جلد (d). تین جلد

5. ترجمان القرآن کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a). غلام رسول مہر (b). ابوالکلام آزاد (c). امین احسن اصلاحی (d). محمود حسن

6. تلخیص ترجمان القرآن کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a). غلام رسول مہر (b). مسعود اظہر ندوی (c). سید مودودی (d). شفیع عثمانی

7. مولانا آزاد کہاں پیدا ہوئے؟

(a).مکہ معظمہ (b).مدینہ منورہ (c).دمشق (d).دہلی

8. باقیات ترجمان القرآن کس سن میں شائع ہوئی۔

(a). 1935 (b).2006 (c). 1962 (d).1980

9. ترجمان القرآن کو ساہتیہ اکادمی نے کتنی جلد میں شائع کیا؟

(a).چھ جلد (b).آٹھ جلد (c).چار جلد (d).ایک جلد

10. اشرف علی تھانوی کی وفات کب ہوئی؟

(a).1947 (b).1943 (c).1952 (d).1920

9.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. ترجمان القرآن کا مختصر تعارف کرایے۔
2. مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت پر اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔
3. اشرف علی تھانوی کی زندگی کا مختصر تعارف کرایے۔
4. بیان القرآن میں لکھنے کے انداز پر روشنی ڈالیے۔
5. ترجمان القرآن کی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

9.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. تفسیر بیان القرآن پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
2. ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات پر مفصل مضمون لکھیے۔
3. مولانا آزاد کے تدبر قرآن پر مضمون لکھیے۔

9.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. بیان القرآن : مولانا اشرف علی تھانوی
2. ترجمان القرآن : مولانا ابوالکلام آزاد
3. تلخیص ترجمان القرآن : مولانا مسعود اظہر ندوی

معروضی سوالات کے جوابات

5. B	4. B	3.A	2.B	1. A
10. B	9.C	8.C	7. A	6. B

اکائی 10:   حدیث کا تعارف

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 حدیث کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

10.3 حدیث کی اہمیت

10.4 حدیث کی ضرورت

10.5 حدیث کی حجیت

10.6 حدیث کی حفاظت اور اشاعت

10.6.1 حدیث کی تدوین

10.7 حدیث کی اہم اصطلاحات

10.8 اصول حدیث: تعریف اور تاریخ

10.8.1 اصول حدیث

10.8.2 اصول حدیث کی تعریف

10.8.3 اصول حدیث کی تاریخ

10.9 فرہنگ

10.10 اکتسابی نتائج

10.11 نمونہ امتحانی سوالات

10.11.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

10.11.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

10.11.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت ہی بڑا اور سب سے عظیم احسان ہے کہ اس نے ان کی ہدایت ورہنمائی کے لیے ایک لازوال کتاب قرآن مجید کو نازل فرمایا اور اس کے ساتھ ہی اس کتاب کے بیان اور تشریح کے لیے امام الانبیاء وخاتم المرسلین حضور نبی پاک ﷺ کو مبعوث فرمایا، جن کے ذریعہ قرآن مجید ہمیں ملا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ تو لیا ہی، اس نے ایسے انتظامات بھی کردیے اور رسول ﷺ کو ایسے ساتھی اور رفیق عطا کیے جنھوں نے اس کے محبوب رسول اکرم ﷺ کی کتاب زندگی کے ایک ایک لمحہ کو نہ صرف محفوظ رکھنے کی کوشش کی بلکہ اپنے قول وعمل میں بھی اسی نمونہ کو ڈھال لیا۔ قرآن مجید اور صاحب قرآن مجید کی باتوں کو محفوظ کرنے کا جیسا انتظام واہتمام مسلمانوں نے کیا، نہ ان سے پہلے کسی نے کیا نہ ہی بعد میں ایسی کوئی نظیر ملتی ہے۔ اور مسلمانوں کا یہ وہ کارنامہ ہے جس پر وہ جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ آج بھی اللہ کے رسول ﷺ کی ذات، ہدایات، ان کے معمولات اور ان کے گردوپیش کو کوئی جاننا چاہے تو حدیث کی کوئی کتاب کھول کر بیٹھ جائے، حضور نبی پاک ﷺ کا نہ صرف معاشرہ اس کے سامنے ہوگا بلکہ وہ اس سے ہم کلام بھی نظر آئیں گے۔ اسے ایسا محسوس ہوگا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی باتوں کا مخاطب اصلی وہی ہے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ اس کے مطالعہ سے آپ:

- حدیث کے معنی ومفہوم کے ساتھ اہمیت حدیث، حجیت حدیث اور علم حدیث کا مختصر مگر جامع تعارف حاصل کرسکیں۔
- حدیث رسول ﷺ کی تاریخ سے واقفیت حاصل ہو۔
- حدیث کی تدوین کس طرح عمل میں آئی اور اس کے مختلف ادوار کون سے ہیں۔
- اصول حدیث اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پر گفتگو کرسکیں۔

10.2 حدیث کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

عربی زبان میں حدیث کا لفظ قدیم کی ضد ہے یعنی نئی چیز یا بات؛ اسی طرح لغت میں حدیث کے معنی گفتگو اور بات چیت کے بھی ہیں اور اس لفظ نے اتنی وسعت اختیار کرلی ہے کہ اس میں کسی کا قول، مدعا، خبر اور واقعہ تمام چیزیں شامل ہوجاتی ہیں۔

اسلامی شریعت کی اصطلاح میں ہر وہ بات جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی جائے حدیث کہلاتی ہے۔ امام سخاوی کے

نزدیک حدیث نام ہے اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال، افعال، اقرار کردہ اعمال، آپ کی صفات یہاں تک کہ سوتے اور جاگتے آپ کی حرکات اور سکنات کا۔ یعنی آپ ﷺ نے کوئی بات کہی، کوئی کام کیا یا آپ ﷺ کے سامنے کسی نے کوئی کام کیا یا کوئی بات کہی اور آپؐ نے اسے اس پر ٹوکا یا منع نہیں کیا، یہ تمام چیزیں حدیث میں شامل ہیں۔ بعض ائمہ حدیث اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال اور افعال کو بھی حدیث میں شامل کرتے ہیں جب کہ بعض دوسرے ائمہ حدیث اس میں فرق کرتے ہیں۔ شیعہ علماء کا کہنا ہے کہ حدیث کا اطلاق رسول اللہ ﷺ اور دیگر ائمہ معصومین کے فرامین یا ان کی روش، سیرت اور ان کے تائید کردہ اعمال پر ہوتا ہے۔

حدیث کی مختلف اقسام بیان ہوئی ہیں جن کا ذکر ان شاء اللہ اصطلاحات حدیث کے ضمن میں آئے گا۔

10.3 حدیث کی اہمیت

حدیث کی اہمیت یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعد دین اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کو جاننے کا سب سے اہم اور مستند ذریعہ یہی ہے۔ بلکہ قرآن مجید کی منشا کو جاننے اور سمجھنے کا ذریعہ بھی حدیث ہے، کیونکہ خود قرآن مجید میں منصب نبوت کا بیان اس طرح ہے۔ "اے نبی! ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے اس تعلیم کو واضح کردو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے" (نحل:44)۔ اسی طرح قرآن مجید میں نبی ﷺ کے بارے میں یہ بھی فرمایا گیا ہے: "وہ (نبی ﷺ) اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، بلکہ وحی ہوتی ہے جو چیز اس کی طرف بھیجی جاتی ہے" (نجم:4-5)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نبی پاک ﷺ جہاں ایک طرف اس مقصد کے لیے بھیجے گئے تھے کہ وہ لوگوں کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سنائیں اور ان تک پہنچائیں وہیں ان کی بعثت کا مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کو اللہ کی کتاب اور اس میں بیان کردہ احکام اور قوانین کی تعلیم دیں، لوگوں کو حکمت اور دانائی کی باتیں بتائیں تاکہ لوگوں کی ذہنی سطح اس حد تک بلند ہو جائے اور لوگ اس قابل ہو جائیں کہ قرآن مجید میں بیان کی ہوئی حقیقتوں کو سمجھ سکیں اور فکر و عمل کے میدان میں صحیح طریقہ اور رویہ اختیار کر سکیں۔ اسی طرح لوگوں کی ایسی تربیت کریں کہ ان کے اندر انسانیت کے بہترین جوہر پیدا ہو جائیں اور ان کی زندگیوں سے ہر قسم کی برائیاں دور ہو سکیں۔ ان مقاصد کا ذکر سورہ آل عمران کی اس آیت میں ہے: "اللہ نے اہل ایمان پر احسان فرمایا، جب ان کے اندر خود ان ہی میں سے ایک رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس سے پہلے تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" (آل عمران:164)۔

یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں اور بعد کے زمانوں میں بھی آج تک اللہ کے رسول ﷺ کے قول، فعل اور تقریر پر مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اسی طرح عمل کیا ہے جس طرح کہ قرآن مجید کے احکام و ہدایات پر۔ مسلم علماء اور فقہاء نے اطاعت اور فرماں برداری رسول ﷺ کو اسی طرح ضروری قرار دیا ہے جس طرح کہ قرآن مجید کی اطاعت کو۔

10.4 حدیث کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کر کے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ رہتی دنیا تک ان کے لیے ہدایت و رہنمائی کا سامان بھی کیا۔ دنیا میں جب جب گمراہی اور ضلالت کا بول بالا ہوا اور چراغ ہدایت کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی لو کو بڑھانے اور اسے مزید روشن کرنے کے

لیے اپنے نبی اور رسول بھیجے۔ اور سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اوران کے ذریعہ رہتی دنیا تک ہدایت ورہنمائی کا انتظام کر دیا۔ اللہ تعالی نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے صرف اپنی کتابیں ہی نہیں بھیجیں بلکہ ان میں مذکور ہدایات کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے ساتھ میں رسول بھی بھیجے، تاکہ لوگوں کے اندر ان ہی میں کا ایک شخص ان پر عمل کر کے نہ صرف ان کے لیے نمونہ فراہم کرے بلکہ یہ بھی ثابت کر دے کہ ان ہدایات پر سارے لوگ بآسانی عمل کر سکتے ہیں۔ اب جب کہ آخری نبی ورسول حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی اور نبی ورسول دنیا میں آنے والا نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک ایسے اسوہ اور نمونہ کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ روزروشن کی طرح تابناک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت ہی واضح الفاظ میں مسلمانوں کو ہدایت فرمادی ہے: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' (احزاب: 21)۔ یعنی اللہ کے رسول کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے، اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا: ''وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا'' (حشر: 7)۔ یعنی اللہ کے رسول جو کچھ تمہیں دیں اسے لے لو اور جن چیزوں سے روک دیں ان سے رک جاؤ۔ نبی ﷺ کی زندگی کیا تھی؟ قرآن مجید کا چلتا پھرتا نمونہ۔ حضرت عائشہ کے الفاظ ہیں: ''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ'' (مسند احمد)۔ یعنی آپ کے اخلاق قرآن کا نمونہ تھے۔ اس طرح یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ قرآن اگر کتاب ہدایت ہے تو نبی ﷺ کی زندگی اور آپ ﷺ کی باتیں اس ہدایت کی عملی تشریح و تعبیر۔ قرآن مجید کو نبی ﷺ کے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا، کیونکہ نبی ﷺ کا کام ہی دنیا کے سامنے قرآن مجید کی عملی تفسیر پیش کرنا تھا۔ دین کی بہت ساری باتیں ہیں جن تک حدیث کے بغیر رسائی ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کی آیتوں کا شان نزول ہمیں حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے بہت سے احکامات مجمل ہیں، ان کی تفصیل احادیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔

قرآن مجید کے بہت سے احکامات ہیں جن پر ہم حدیث کے بغیر عمل کر ہی نہیں سکتے۔ مثال کے طور پر عبادات کو ہی لے لیجیے نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کے بارے میں قرآن مجید کے بیانات مجمل ہیں۔ اگر احادیث نہ ہوں تو ان عبادات کو صحیح ڈھنگ سے ادا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح قرآن مجید میں صرف شراب (خمر) کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ شراب کے حرام ہونے کا سبب اس کا نشہ آور ہونا ہے۔ یہ بات نبی ﷺ نے بتائی کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی نبی ﷺ نے ہی بتائی کہ نشہ آور چیز خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ حرام ہے۔ یہ سوال بے معنیٰ ہے کہ نشہ آور چیز تھوڑی مقدار میں استعمال کرنے سے نشہ ہوتا ہے یا نہیں۔ آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حدیث کی ضرورت ویسی ہی ہے جیسی کہ قرآن مجید کی۔

10.5 حدیث کی حجیت

حدیث کی اہمیت اور ضرورت معلوم ہو جانے کے بعد اب ہم اس مسئلے پر آتے ہیں کہ دینی امور میں اللہ کے رسول کی حدیثیں حجت ہیں یا نہیں۔ کیوں کہ ماضی قریب میں بہت سے لوگوں نے علم ودانش کے نام پر (اور ان کی ایک تعداد آج بھی موجود ہے) احادیث کی اہمیت وضرورت اور ان کی حجیت سے یا تو انکار کیا یا ان کو اپنے خود ساختہ فہم قرآن سے بھی کم گردانا اور دعویٰ یہ کیا کہ مسلمانوں کی ہدایت

ور ہنمائی کے لیے قرآن مجید کافی ہے۔ جب کہ خود قرآن اور صاحب قرآن ان کے اس دعوے کی تردید کرتے ہیں۔ ذیل میں قرآن مجید کی بعض وہ آیات درج کی جاتی ہیں جن سے حدیث کے حجت ہونے کا واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے:

- ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى. إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى''(نجم:4-3)۔(اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں، وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے)۔
- ''وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا''(حشر:7)۔(اور رسول جو کچھ تمہیں دیں اسے لے لو، اور جس سے تمہیں روک دیں اس سے باز رہو)۔
- ''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا''(نساء:65)۔(پس کچھ بھی نہیں، تیرے رب کی قسم ہے وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک تجھے [اے پیغمبر] ان تمام باتوں میں حَکَم اور فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں جو ان کے باہمی جھگڑوں میں پیدا ہوئی ہیں، پھر اپنے اندر کسی قسم کی تنگی اس فیصلے کے متعلق نہ پائیں جو تم نے کر دیا ہو، اور کلیتہً اس فیصلے کے آگے جھک جائیں)۔
- ''وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ''(نساء:64)۔(نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو مگر اسی لیے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے اللہ کے حکم سے)۔
- ''فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ''(نور:63)۔(پس چاہیے کہ جو پیغمبر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ ڈریں اس بات سے کہ کسی آزمائش اور فتنہ میں نہ مبتلا ہو جائیں یا ان کو دکھ بھرا عذاب پکڑے)۔
- ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا''(احزاب:21)۔ (تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہت اچھا نمونہ ہے، جو اللہ کی اور پچھلے دن کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔)
- ''قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ''(آل عمران:31)۔([اے نبی لوگوں سے] کہو: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا)۔

جس طرح قرآن مجید کی یہ آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث دین کے معاملات میں حجت کا درجہ رکھتی ہیں اسی طرح خود اللہ کے رسول کے فرمودات بھی اس پر شاہد ہیں۔ صرف ایک حدیث یہاں بیان کی جاتی ہے:

- ''مَنْ أَطَاعَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ، وَمَنْ عَصَى مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ عَصَى اللَّهَ، وَمُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ''(بخاری)۔(جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی بے شک اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور محمد ﷺ لوگوں کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں)۔

اسی طرح سلف صالحین کے دور سے لے کر آج تک جمہور امت کا مسلسل اور متواتر یہ عقیدہ رہا ہے کہ معتبر اور صحیح احادیث حجت ہیں اور

ان کی تشریعی حیثیت مسلم ہے۔ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی قطعی حجت مانتے تھے۔ مسند دارمی کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے سامنے جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو پہلے کتاب اللہ میں دیکھتے تھے، اگر اس میں پاتے تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ ہوتا اور رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں کوئی سنت ہوتی، تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اگر اس سے بھی حل نہ ہوتا تو مسلمانوں سے پوچھتے۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کا رویہ بھی یہی تھا وہ قاضیوں کو مقرر کرتے وقت یہ تاکید فرماتے کہ جو مسئلہ پیش آئے اس میں پہلے کتاب اللہ کو دیکھو، جو اس سے تمہارے لیے ظاہر ہو اور کسی سے نہ پوچھو اور جب کتاب اللہ سے ظاہر نہ ہو تو اس میں سنت رسول کا اتباع کرو اور جو سنت رسول سے بھی ظاہر نہ ہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو۔ غرض یہ سلسلہ خلفاء راشدین سے ہوتا ہوا آج تک جاری ہے اور امت ہمیشہ حجیت حدیث کی نہ صرف معتقد رہی ہے بلکہ اس پر عامل بھی رہی ہے۔

شیعہ علماء صرف ان احادیث کو قبول کرتے ہیں جو متواتر ہو یا ان کی سند معتبر ہو اور ان پر عمل کرنے کے لیے ان کی سند اور دلالت دونوں کی چھان بین کرتے ہیں۔

دور جدید کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بھی ہے کہ بعض لوگ اس طرح کا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ خبر واحد سے صرف ظن غالب ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا ہے اس لیے خبر واحد کو دین و مذہب کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ واضح رہے کہ خبر واحد وہ حدیث کہلاتی ہے جو متواتر کے درجے میں نہ ہو اور متواتر وہ حدیث ہوتی ہے جس کے ہر دور میں اتنے زیادہ راوی ہوں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا عادتاً ممکن نہ ہو۔ احادیث زیادہ تر خبر واحد ہیں۔ یہ ایک ایسا فتنہ ہے جو دین کے ساتھ صریح زیادتی ہے۔ مولانا محمد فاروق خان کے الفاظ میں:

> خود ہماری زندگی کے اکثر و بیشتر فیصلوں کا انحصار ظن غالب پر ہی ہوتا ہے۔ قرآن نے بھی ظنی شہادتوں کو غیر معتبر نہیں قرار دیا، بلکہ ان کا اعتبار کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بنیاد پر ایک مسلمان کا خون تک مباح ہو سکتا ہے۔ زنا، قذف اور سرقہ کے سلسلے میں فیصلوں کی بنیاد دو چار شہادتوں پر ہی رکھی گئی ہے جن سے ایک مسلمان کو کوڑوں کی سزا بھی دی جاسکتی ہے اور اس کا ہاتھ بھی کاٹا جاسکتا ہے۔ جب قرآن غیر متواتر شہادتوں پر نظام عدل کی بنیاد رکھتا ہے پھر کسی مسلمان شخص کے لیے یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ حدیث رسول ﷺ کے لیے ہر دور میں دو چار راویوں کا ہونا کافی نہیں ہے۔ البتہ راویوں کے لیے عادل اور قابل اعتماد ہونا ضروری ہے۔ اس کی تحقیق ہی کے لیے اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: ''يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ'' (حجرات:6) یعنی اے ایمان والو! جب کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بے تحقیق کسی قوم پر جا پڑو اور بعد میں تمہیں اپنے کیے پر نادم اور شرمندہ ہونا پڑے۔

اس آیت میں قرآن خبر واحد کو رد کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ خبر اگر فاسق کی دی ہوئی ہے تو اس کی تحقیق کی ہدایت کرتا ہے۔ اس

آیت سے یہ بات اپنے آپ نکلتی ہے کہ اگر خبر کسی ایسے شخص کی دی ہوئی ہے جو فاسق نہیں۔ بلکہ اس کی عدالت اور اس کی سچائی پر اعتماد ہے تو مزید تحقیق کے بغیر بھی دی ہوئی خبر کی بنیاد پر کاروائی کی جاسکتی ہے۔ خود قرآن کریم کے کتاب الٰہی ہونے کا یقین بھی ہمیں ایک معتبر اور قابل اعتماد ہستی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت سے حاصل ہوا ہے۔ خدا کی جانب سے کثیر اشخاص اور ملائکہ نے آکر ہمیں اس کے کلام الٰہی ہونے کی خبر نہیں دی ہے۔

قرآن کے علاوہ حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ خبر واحد ہمارے لیے حجت ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت یزید بن شیبان کا بیان ہے کہ ہم عرفات میں تھے۔ اتفاق سے ہماری جائے قیام حضور ﷺ کی قیام گاہ سے دور تھی۔ ہمارے پاس آپ ﷺ کا قاصد یہ پیام لے کر آیا کہ ہم جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اسی جگہ رہیں، وہاں سے منتقل ہونے کی ضرورت نہیں، عرفات میں جہاں بھی قیام ہو جائے فریضہ وقوف ادا ہو جاتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ثقہ آدمی کی دی ہوئی خبر دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔ ورنہ آپ ﷺ اپنی طرف سے ایک ہی شخص کو نہ بھیجتے۔

10.6 حدیث کی حفاظت اور اشاعت

حدیث کی اہمیت، ضرورت اور حجیت کے پیش نظر اللہ، اس کے رسول، آل بیت اور صحابہ کرام نے حفاظت واشاعت حدیث کا ایسا اہتمام کیا کہ اس کی نظیر انسانی تاریخ میں کہیں اور ملنی مشکل ہے۔ اللہ تعالی نے نبی ﷺ کی رفاقت اور صحبت کے لیے ایک ایسے انسانی گروہ کا انتخاب کیا جو انسانیت کا جوہر و کریم کہا جاسکتا ہے۔ خود اللہ کے رسول ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور اشاعت کے لیے متعدد اقدامات کیے اور آپ کے بعد آپ ﷺ کے صحابہ و تابعین نے احادیث کی حفاظت اور اشاعت کے لیے جس احتیاط واہتمام سے کام لیا وہ اپنے آپ میں بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ابتدا میں رسول اللہ ﷺ نے احادیث کو لکھنے سے منع کر دیا تھا، لیکن ہجرت مدینہ کے کچھ عرصہ بعد یہ ممانعت ختم ہو گئی اور احادیث لکھنے کی عام اجازت ہو گئی۔ حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا: "میں آپ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں مگر یاد نہیں رکھ پاتا"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اپنے ہاتھ سے مدد لو" اور پھر اپنے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ لکھ لیا کرو (ترمذی)۔ اسی طرح کئی صحابہ کرام کو آپ ﷺ نے بہت ساری چیزیں لکھوا کر دی تھیں۔ خود آپ اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ جب کوئی بات کہتے تو اس کو تین بار دہراتے تاکہ وہ بات اچھی طرح لوگوں کی سمجھ میں آجائے (بخاری)۔

سب سے اول جن لوگوں نے حدیث کی حفاظت کی ذمہ داری لی وہ حضرت علیؓ اور رسول اللہ ﷺ کے قریبی ساتھی (صحابہ) تھے۔ چونکہ حضرت علی کی تربیت بالخصوص اور دیگر مقربین بالعموم براہ راست خود رسول اللہ ﷺ نے کی تھی، اس لیے وہ اس ذمہ داری کو بخوبی سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہ حضرات جہاں ایک طرف اس بات کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ اللہ کے رسول کی حدیثوں کو زیادہ سے زیادہ یاد اور محفوظ رکھیں وہیں وہ اس بات کا بھی بہت زیادہ خیال رکھتے تھے کہ رسول اللہ کی جانب کوئی غلط بات نہ منسوب ہونے پائے، کیونکہ نبی ﷺ کی یہ تنبیہ ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی تھی: "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" (صحیح)۔ (جو

شخص مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تیار کرلے)۔ مشہور صحابی رسول ﷺ حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کوئی بھی حدیث بیان کرنے سے پہلے یہ کہتے کہ "رسول اللہ صادق ومصدوق ابو القاسم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے قصداً مجھ پر جھوٹ باندھا اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کرلے"۔ بہت سارے صحابہ کا معمول تھا کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت نبی ﷺ کی صحبت میں گزارنے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ روزانہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتے تھے تو انہوں نے اور ان کے ایک پڑوسی انصاری صحابی نے معمول بنا رکھا تھا کہ ایک دن حضرت عمرؓ اللہ کے رسول کی خدمت میں حاضر رہتے اور ایک دن انصاری صحابی اور دونوں جس دن کہ وہ اللہ کے رسول کی خدمت میں نہیں ہوتے تھے دوسرے کو اس دن کی باتوں کے بارے میں بتاتے تھے۔ یہی نہیں کہ حضرات صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں سننے کا ہی اہتمام کرتے ہوں بلکہ وہ ایک دوسرے سے بھی حدیثیں سنتے اور یاد کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے جو صحابہ حدیثیں معلوم کیا کرتے تھے ان میں حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنھم کے نام بھی شامل ہیں۔ احادیث کو جاننے اور انہیں صحیح ڈھنگ سے یاد رکھنے کا صحابہ کرام کو اس قدر شوق تھا کہ وہ ایک ایک حدیث کا علم حاصل کرنے کے لیے لمبے سے لمبے سفر کی تکلیف برداشت کرلیا کرتے تھے۔ تابعین کرام کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا وہ بھی حدیثیں سننے اور انہیں یاد کرنے کے لیے ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ حضرت ابو العالیہ کا بیان ہے کہ ہم رسول ﷺ اللہ کے صحابہ کے حوالے سے ایک روایت سنتے لیکن ہم اس پر راضی نہ ہوتے جب تک کہ ہم خود پہنچ کر ان صحابی کی زبانی براہ راست اس روایت کو نہ سن لیتے۔ اس طرح حضرات صحابہ کرام اور تابعین عظام نے حفاظت حدیث کا بے مثل کارنامہ انجام دیا۔

جس طرح آل بیت اور مقربین صحابہ نے حدیث کی حفاظت کا بہت زیادہ اہتمام کیا اسی طرح حدیث کی اشاعت پر بھی انہوں نے کافی توجہ صرف کی۔ نبی ﷺ کے زمانے میں ہی وہ ایک دوسرے کو حدیثیں سنایا کرتے تھے۔ آپ کے وصال کے بعد صحابہ کرام جہاں بھی گئے اور جس جگہ بھی رہے انہوں نے ان مقامات پر تعلیم قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثیں بیان کرنے کا سلسلہ بھی قائم کیا۔ مکہ اور مدینہ کے علاوہ یمن، یمامہ، دمشق، بحرین، بصرہ، کوفہ اور مصر وہ مقامات ہیں جہاں پر حضرات صحابہ کرام نے بڑی تعداد میں قرآن مجید اور حدیث رسول کی روایت کے حلقے قائم کیے۔ سب سے زیادہ نمایاں خدمات صحابہ میں حضرت ابو ہریرہؓ اور صحابیات میں حضرت عائشہؓ کی ہیں جن کے حلقہ درس مدینہ میں قائم تھے۔ صحابہ کرام کے بعد ان کے تابعین شاگردوں نے اشاعت حدیث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس طرح یہ سلسلہ روز بروز آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک زمانے تک علم سے مراد ہی علم حدیث لیا جاتا تھا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا اشاعت حدیث کی ترغیب خود نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کو دلائی تھی۔ ایک موقع پر آپ نے نماز روزہ وغیرہ کے احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا: "احْفَظُوهُ وَأَخْبِرُوهُ مَنْ وَرَاءَكُمْ" (بخاری)۔ (ان کو خوب محفوظ رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے رہ گئے ہیں انہیں ان سے واقف کراؤ)۔

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر مجمع سے خطاب کرکے آپ نے فرمایا: "نَضَّرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا، فَحَفِظَهُ حَتَّى يُبَلِّغَهُ، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَيْسَ بِفَقِيهٍ" (ابوداؤد)۔ (تروتازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر اسے یاد رکھا، اور اسے [دوسروں تک] پہنچایا، کتنے ہی حامل فقہ پہنچاتے ہیں اس تک جو زیادہ فقہ والا ہوتا ہے، اور کتنے ہی حامل فقہ غیر

فقیہ ہوتے ہیں)۔ آپ ﷺ نے اپنا خطبہ ان الفاظ پر ختم فرمایا: "فَلْيُبْلِغِ الشَّاهِدُ الغَائِبَ" (بخاری)۔([چاہیے کہ] جو حاضر ہے وہ اسے غائب تک پہنچادے)۔ اگر مسلمانوں کو حدیث کی ضرورت نہ ہوتی تو آپ ﷺ اس کی حفاظت اور اشاعت کا اتنا زیادہ اہتمام نہ کرتے اور نہ ہی آپ کے اس طرح کے ارشادات سامنے آتے۔

احادیث کی حفاظت و اشاعت کا کام صرف زبانی روایت کے ذریعے ہی نہیں ہوا بلکہ اللہ کے رسول کے زمانے سے ہی حدیثوں کو لکھنے کا رواج تھا۔ خود نبی کریم ﷺ نے مختلف مواقع پر مختلف تحریریں (احکام و ہدایات سے متعلق) لکھوا کر لوگوں کو عنایت فرمائیں۔ مقربین صحابہ بھی اپنی یادداشت پر بھروسے کے ساتھ ساتھ حدیثیں لکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی ایک تعداد نے حدیثوں کے صحیفے تیار کیے البتہ انہیں تائیدی شہادت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور ان کا مقصد حافظہ کو تازہ کرنا ہوتا تھا۔ مولانا محمد فاروق خاں لکھتے ہیں:

> یہ ایک حقیقت ہے کہ اول درجے کی صحیح احادیث ان کے اولین راویوں ہی کے ہاتھوں (ضبط) تحریر میں آچکی تھیں۔ اور وہ مسلسل تحریری شکل میں منتقل ہوتی رہیں اور آج تک تحریری شکل میں موجود و محفوظ ہیں۔ ایسا نہیں ہوا ہے کہ کسی دور میں تحریری سرمایہ ضائع ہو گیا ہو اور محض زبانی روایات پر ان کا دار و مدار رہ گیا ہو۔

10.6.1 حدیث کی تدوین

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی سب سے زیادہ اور اولین توجہ قرآن مجید کی حفاظت و کتابت پر مرکوز تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ کے وصال کے وقت تک قرآن مجید سینوں اور سفینوں دونوں میں اچھی طرح محفوظ ہو چکا تھا اور اب اسے ایک مصحف کی شکل دینے کا کام باقی رہ گیا تھا۔ حدیث کا معاملہ اس سے مختلف تھا، اس کی باضابطہ تدوین اس طریقے سے نہیں کی گئی جس طرح کہ قرآن مجید کی ہوئی۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں مثلاً:

(1) حدیث کا ذخیرہ قرآن مجید کی طرح مختصر نہیں تھا۔

(2) حدیث کو سننے اور جاننے والے افراد ہزارہا کی تعداد میں تھے بیک وقت سب تک رسائی آسان نہ تھی۔

(3) کاتبین اور سامان کتابت کی قلت تھی وغیرہ۔

عہد نبوی ﷺ اور عہد صحابہ میں اگر قرآن مجید کی طرح حدیث کی باضابطہ تدوین نہیں ہوئی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس مبارک زمانے میں حدیثیں لکھی ہی نہیں گئیں یا ان کی حفاظت و کتابت کا اہتمام نہیں تھا۔ بلکہ نبی ﷺ کے زمانے میں بھی اور آپ ﷺ کے بعد بھی مقربین صحابہ نے حفاظت کا اہتمام کیا۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ عہد نبوی میں حدیث کی تدوین اس طریقے پر نہیں ہوئی جس طریقے پر کہ قرآن مجید کی ہوئی۔ حدیثیں آل بیت اور مقربین صحابہ کے سینوں میں محفوظ تھیں اور انہوں نے زبانی روایت کے ذریعہ تابعین عظام کی طرف منتقل کیا۔ یہ مغالطہ بہرحال نہیں ہونا چاہیے کہ عدم تدوین سے مراد عدم کتابت ہے، جیسا کہ بعض مستخففین

حدیث و سنت کرتے ہیں، کیونکہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں کتابت حدیث کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ حضرت علیؓ کے مجموعہ حدیث کا نام "الصحیفة" یا "الجامعة" تھا، کئی دیگر صحابہ نے بھی حدیث سے متعلق اپنی یادداشتیں تحریر کر رکھی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے تو باقاعدہ تدوین حدیث کا ارادہ کیا تھا مگر بعد میں اسے ترک کر دیا۔ بیہقی نے "مدخل" میں عروہ بن زبیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا تھا کہ احادیث کو جمع کر کے قلم بند کرائیں۔ آپؓ نے صحابہ کرام سے مشورہ لیا تو انہوں نے بھی اس کی تائید کی، لیکن حضرت عمرؓ اس کے باوجود پس و پیش میں رہے اور ایک ماہ تک اللہ سے استخارہ کرتے رہے حتی کہ ایک دن صبح اٹھے تو اللہ نے ان کے دل کو ایک فیصلے پر جما دیا۔ آپ نے فرمایا: میرا ارادہ تھا کہ سنن کی کتابت کراؤں لیکن مجھے ان قوموں کا خیال آیا جنہوں نے تم سے پہلے کتابیں لکھیں اور کتاب اللہ کو چھوڑ کر ان ہی میں منہمک ہو گئے۔ خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی دوسری چیز کو خلط ملط نہیں کروں گا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب فتنوں کا دور شروع ہوا اور حدیثوں میں جھوٹ کی ملاوٹ کی جانے لگی تو اس وقت وضع حدیث کے فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے تابعین عظام نے جتنا ممکن ہوا احادیث کو جمع کر دیا۔ یہ کریڈٹ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو جاتا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے حکومتی سطح پر حدیث کی جمع و تدوین کے لیے کوششیں کیں اور مختلف لوگوں کو اس کام پر مامور کیا، ان میں نمایاں نام مدینہ کے اس وقت کے گورنر ابو بکر ابن حزم (متوفی:120ھ)، عمرہ بنت عبد الرحمٰن انصاریہ (متوفی:98ھ)، قاسم ابن محمد بن ابی بکر (متوفی120ھ) اور محمد بن مسلم ابن شہاب زہری (متوفی:124ھ) کے ہیں۔ ان میں بھی ابن شہاب زہری وہ جلیل المرتبت شخصیت ہیں جنہوں نے تدوین حدیث کے کام کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے مختلف ابواب کے تحت الگ الگ حدیث کی کتابیں مرتب کی تھیں۔ ابن شہاب زہری کے بارے میں حضرت عمر بن عبد العزیز اپنے ہم نشینوں سے فرمایا کرتے تھے کہ 'ان کے ہاں جایا کرو کیونکہ روئے زمین پر ان سے بڑھ کر سنت کا عالم موجود نہیں ہے'۔ امام زہری کے بعد تدوین حدیث کا کام بڑے پیمانے پر ہوا، البتہ دوسری صدی ہجری کے دوران تک حدیث رسول، آثار صحابہ اور اقوال تابعین کو ایک ہی مجموعے میں جمع کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد تیسری صدی ہجری کے دوران حدیث کی زیادہ منظم، عظیم الشان اور زندہ جاوید کتابیں لکھی گئیں جو آج تک باقی ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام (148ھ–80ھ) کو بھی حدیث میں بڑا مقام حاصل ہے۔ حدیث کے ائمہ نے اکثر کتبِ سنت میں امام جعفر سے روایت کی ہے، اور اکثر محدثین نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ آپ سے احادیث کو روایت کرنے والے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ محققین کے مطابق ان کے رواۃ کی تعداد 4000 سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ امام جعفر صادق سے بے شمار احادیث رسول اللہ ﷺ روایت ہیں، جن کو کتاب صحیح مسلم، سنن الترمذی، سنن النسائی الکبری، سنن اَبی داوٗد، سنن ابن ماجہ، مسند امام احمد بن حنبل، موٗطا امام مالک بن انس وغیرہ اور شیعہ حضرات کے چار معتبر کتب حدیث (الکافی، من لا یحضره الفقیه ، تهذیب الأحکام اور الاستبصار) میں سنداً روایت کیا گیا ہے۔

10.7 حدیث کی اہم اصطلاحات

حدیث: حدیث کے لغوی معنی جدید یا نئی چیز کے ہیں۔ اس کے ایک معنی بات کرنے کے بھی ہیں۔ اصطلاح میں حدیث ہر اس قول، فعل، تقریر اور صفت کو کہتے ہیں جس کی نسبت حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاتی ہے۔

- **خبر:** خبر کے لفظی معنی عام خبر کے ہیں اور اس کی جمع اخبار ہے۔ اصطلاح کے طور پر خبر کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

1. خبر حدیث کا ہم معنی لفظ ہے یعنی خبر اور حدیث دونوں ہم معنی اور مترادف ہیں۔
2. خبر کا لفظ حدیث کا بالکل برعکس معنی رکھتا ہے۔ یعنی حدیث وہ کلام ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اور خبر وہ کلام ہے جو آپ ﷺ کے سوا کسی اور سے منقول ہو۔
3. خبر حدیث سے زیادہ عام لفظ ہے۔ یعنی حدیث اس کلام کو کہتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اور خبر وہ کلام ہے جو حضور ﷺ یا آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور سے منقول ہو۔

- **اثر:** اثر کا لفظی معنی کسی چیز کا باقی نشان کے ہے۔ اصطلاح میں یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

1. اثر کا لفظ حدیث کا ہم معنی ہے یعنی اثر اور حدیث دونوں ہم معنی اور باہم مترادف لفظ ہیں۔
2. اثر کا معنی حدیث کے برعکس ہے یعنی اثر وہ قول یا فعل ہے جس کی نسبت صحابہ یا تابعین کی طرف کی گئی ہو۔

- **صحابی:** صحابی اس خوش نصیب انسان کو کہتے ہیں جسے ایمان کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ہو اور ایمان کی حالت میں ہی اس کا انتقال ہوا ہو۔
- **تابعی:** تابعی اس خوش نصیب انسان کو کہتے ہیں جسے ایمان کی حالت میں کسی صحابی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہو اور ایمان کی حالت میں ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوا ہو۔
- **سند:** لغت میں سند کے معنی سہارے کے ہیں۔ اصطلاح میں سند روایت کرنے والوں کے اس سلسلے کو کہتے ہیں جو حدیث کے متن تک پہنچا دے۔
- **متن:** حدیث کی اصل عبارت یا الفاظ کو متن کہتے ہیں۔
- **راوی:** جو سند کے ساتھ حدیث کو بیان کرتا ہو، اسے راوی کہتے ہیں۔
- **مروی:** جو حدیث یا قول بیان کیا گیا ہو، اسے مروی کہتے ہیں۔
- **شاذ:** اصول حدیث کی اصطلاح میں شاذ وہ حدیث ہے جسے مقبول راوی نے روایت کیا ہو لیکن یہ روایت اس سے بہتر روایت کے خلاف ہو۔ یعنی شاذ وہ حدیث ہے جس میں ثقہ راوی اپنے سے قوی تر راوی کی مخالفت کرتا ہو۔
- **محفوظ:** اصول حدیث کی اصطلاح میں محفوظ وہ حدیث ہے جس میں زیادہ ثقہ راوی اپنے سے کم تر ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو یعنی

محفوظ حدیث شاذ حدیث کے برعکس ہے۔

- **مجہول:** اصول حدیث کی اصطلاح میں مجہول حدیث کے اس راوی کو کہتے ہیں جس کے حالات محدثین کے یہاں معروف نہ ہوں۔ یعنی اس کے مشاغل خصوصاً حدیث کے ساتھ اس کا تعلق بالکل اندھیرے میں ہوں۔
- **متفق علیہ:** محدثین کے نزدیک اس سے مراد امام بخاری و امام مسلم کا کسی حدیث پر متفق ہونا ہے۔ اس سے مراد پوری امت کا اتفاق نہیں ہے تاہم ان دونوں ائمہ کا اتفاق پوری امت کے اتفاق کے مترادف ہے کیونکہ تمام امت نے ان دونوں محدثین کی احادیث کو قبول کرنے پر اتفاق کیا ہے۔
- **شاہد:** اصول حدیث کی اصطلاح میں اس حدیث کو کہتے ہیں جو کسی دوسری حدیث کے الفاظ و معانی کے لحاظ سے یا صرف معنی کے اعتبار سے مشابہ ہو۔ یعنی ایک صحابی کی روایت کی تائید کسی دوسرے صحابی کی روایت اگر کرے تو وہ شاہد کہلائے گی۔
- **ثلاثیات:** ان احادیث کو کہتے ہیں جن میں راوی اور حضور ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے پائے جاتے ہوں۔

10.8 اصول حدیث: تعریف اور تاریخ

10.8.1 اصول حدیث

حدیث اور اصول حدیث دو ایسے علم ہیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور وابستہ ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری اور ناگزیر ہیں۔ اصول حدیث کی حیثیت علم حدیث کے لیے مقدمہ کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے اصول حدیث یعنی علم حدیث کی بنیاد اور جڑ کا نام دیا گیا ہے۔ اصول حدیث کو علوم الحدیث اور مصطلح الحدیث کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

10.8.2 اصول حدیث کی تعریف

وہ علم ہے جس کے ذریعہ حدیث کی سند اور متن کے احوال کی معرفت حاصل کی جاتی ہے تاکہ حدیث کو قبول کرنے یا قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا جاسکے۔ اس علم کا موضوع احادیث کی سند اور متن ہے، اور اس علم کا مقصد یا غایت یہ ہے کہ صحیح اور سقیم احادیث کے درمیان خط امتیاز کھینچا جاسکے۔

10.8.3 اصول حدیث کی تاریخ

علم حدیث کا ہر طالب علم یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ روایت (حدیث بیان کرنا) اور نقل اخبار سے متعلق بنیادی باتیں اور اصولی چیزیں اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں موجود ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا" (حجرات:6)۔ (اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو)۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد پاک ہے: "اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے ہم سے کوئی بات سنی اور اسے جوں کا توں دوسروں تک پہنچا دیا بسا اوقات بات جسے پہنچائی جاتی ہے وہ پہنچانے والے سے بڑھ کر محفوظ کر لیتا ہے" (ابو داؤد)۔

مذکورہ بالا آیت اور حدیث سے یہ بات پورے طور پر کھل کر سامنے آتی ہے کہ خبروں کو قبول کرنے سے متعلق حقیقت کی جستجو کرنے، پوری ہوش مندی سے انہیں ذہن نشین کر کے محفوظ کر لینے اور دوسروں تک پہنچانے میں باریک بینی سے کام لینے کی اساس اور بنیاد قرآن و سنت میں موجود ہے۔

صحابہ کرام اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے احادیث کو قبول کرنے اور پھر دوسروں تک انہیں پہنچانے کے سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ بیان کرنے والے کی راست گوئی کے بارے میں کسی طرح کا شبہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف بیان کرنے والے پر اعتماد نہیں کرتے تھے بلکہ اس نے جس سے سنا ہوتا اس کے بارے میں بھی پوچھتے۔ اس طرح احادیث کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کے لیے ایک نئے موضوع کی بنیاد پڑی جسے اسناد یعنی خبر کو نقل کرنے والے ذرائع کا بیان کہتے ہیں۔ اصول حدیث میں اسناد کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ حدیث کی مشہور کتاب صحیح مسلم کے مقدمہ میں محدث ابن سیرین کا قول نقل کیا گیا ہے۔

> "لوگ اسناد کے متعلق استفسار نہیں کرتے تھے لیکن جب فتنوں کا دور آ گیا تو لوگ حدیث کی روایت کرنے والے سے کہتے کہ جن واسطوں سے تم یہ حدیث بیان کر رہے ہو پہلے ان کے نام بتاؤ، پھر دیکھا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے اہل سنت ہیں تو ان سے حدیث قبول کر لی جاتی اور اگر واسطوں کا تعلق اہل بدعت سے ہوتا تو حدیث قبول نہ کی جاتی"۔

اس طرح مسلمانوں کے اندر سند کی معرفت کے بغیر حدیث کو قبول نہ کرنے کی روایت وجود میں آئی، اور پھر اس کی بنیاد پر جرح و تعدیل (یعنی راویوں کے بارے میں چھان بین) سند متصل اور سند منقطع کی معرفت اور روایت کے چھپے ہوئے فنی نقائص کی پہچان کا علم وجود میں آیا، اور حدیث بیان کرنے والے بہت سے لوگوں پر تنقید بھی کی گئی۔ البتہ دور اول میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی ایسے راویوں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جن پر تنقید کی گئی ہو۔

بعد میں حدیث کے عالموں اور ماہرین نے اس دائرے کو اور بڑھا دیا جس کے نتیجے میں حدیث کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے علوم اور ان کے متعلقات پر بحث کا آغاز ہوا۔ مثال کے طور پر حدیث کے الفاظ کو صحیح طور پر یاد کرنا، محفوظ طریقے سے دوسروں تک پہنچانے کی کیفیت، ناسخ و منسوخ اور غریب (نامانوس) حدیث کی پہچان وغیرہ کرنے والے علوم۔ البتہ اس دوران بھی احادیث کے بارے میں بحث و تمحیص کا یہ سارا عمل صرف اہل علم کے درمیان اور زبانی طور پر جاری رہا۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دوران کچھ ایسی کتابیں وجود میں آئیں جن میں حدیث سے متعلق علوم کو تحریری شکل میں پیش کیا گیا۔ البتہ اس وقت بھی یہ علوم (اصول حدیث) دوسرے علوم کی کتابوں میں درج ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر امام شافعی کی کتابوں 'الرسالہ' اور 'کتاب الام' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں جب مسلمانوں کے اندر مختلف علوم وفنون کو خوب ترقی حاصل ہوگئی اور جب یہ علوم وفنون پختگی کے اس مرحلے میں داخل ہوگئے جہاں مختلف علوم وفنون کی الگ شناخت قائم ہو سکتی تھی، اس وقت کہیں جا کر اصول حدیث پر باضابطہ کتابیں لکھی

جانی شروع ہوئیں اور اسے باضابطہ ایک علم کی شکل دی گئی۔ اس موضوع پر شاید سب سے پہلی کتاب "المحدث الفاصل بين الراوي والواعي" ہے جسے قاضی ابو محمد حسن بن عبد الرحمان بن خلاد رامہرمزی (متوفی: 360ھ) نے لکھا ہے۔ اس کے بعد ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری (متوفی: 405ھ) کی "معرفة علوم الحديث"، ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصفہانی (متوفی: 430ھ) کی کتاب "المستخرج على معرفة علوم الحديث"، خطیب بغدادی (متوفی: 463ھ) کی "الكفاية في علم الرواية"، ابن صلاح (متوفی: 643ھ) کی "علوم الحديث" اور النووی (متوفی: 676ھ) کی "التقريب" جیسی اصول حدیث کی اہم کتابیں لکھی گئیں۔

10.9 فرہنگ

مجمل	:	جو تفصیل کا محتاج ہو، جو مفصل بیان کیے بغیر واضح نہ ہو
مترادف	:	ایسے الفاظ جن کے معنی ایک ہوں، ہم معنی
شہادت ظنی	:	وہ شہادت جسے تسلیم کر لیا جائے
استفسار	:	دریافت، پوچھ گچھ، پوچھنا، سوال کرنا

10.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- عربی زبان میں حدیث کے معنیٰ نئ چیز، گفتگو، بات چیت ہوتے ہیں۔ لیکن اسلامی شریعت کی اصطلاح میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور اقرار کردہ اعمال کو حدیث کہا جاتا ہے۔
- اسلامی شریعت میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو جاننے کا سب سے اہم اور مستند ذریعہ حدیث ہے۔ اس کے بعد ہم نہ تو قرآن کے صحیح مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس پر صحیح طور پر عمل کر سکتے ہیں۔
- حدیث کی ضرورت ہمیں اس لیے ہے کہ قرآن میں جو تعلیمات دی گئی ہیں ان پر عمل کرنا آسان ہو۔ حدیث دراصل ہمیں عملی نمونہ فراہم کرتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہمارے لیے ایسا اسوہ اور نمونہ ہے جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ روشن اور تابناک ہے۔
- قرآن کریم کے بعد دینی امور میں حدیثیں حجت ہیں۔
- حدیث کی حفاظت واشاعت اور تدوین کا آغاز عہد نبوی ہی سے شروع ہو گیا تھا۔
- اصول حدیث کے ذریعہ حدیث کی سند اور اس کی متن کی معرفت حاصل ہوتی ہے، تاکہ اس پر عمل کرنے کا پیمانہ طے کیا جا سکے۔
- چوتھی صدی ہجری میں جب مسلمانوں کے اندر مختلف علوم وفنون کو خوب ترقی حاصل ہو گئی اور جب یہ علوم وفنون پختگی کے اس

مرحلے میں داخل ہوگئے جہاں مختلف علوم وفنون کی الگ شناخت قائم ہو سکتی تھی، اس وقت کہیں جاکر اصول حدیث پر باضابطہ کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں اور اسے باضابطہ ایک علم کی شکل دی گئی۔

10.11 نمونہ امتحانی سوالات

10.11.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. اس علم کا مقصد یا غایت یہ ہے کہ صحیح اور سقیم آثار کے درمیان خط امتیاز کھینچا جاسکے:

(a). علوم الحدیث (b). مصطلح الحدیث (c). اصول الحدیث (d). تمام صحیح

2. درج ذیل میں سے کیا حدیث کے لغوی معنیٰ نہیں ہے؟

(a). واقعہ (b). گفتگو (c). نئ چیز (d). اقوال

3. جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس کوئی مقدمہ آتا تو وہ قرآن کریم کے بعد کس کی طرف متوجہ ہوتے تھے؟

(a). حدیث (b). صحابہ کرام کی رائے (c). عرف وعادت کی طرف (d). سب غلط

4. حدیث کے میدان میں سب سے نمایاں خدمات صحابیات میں سے کس کی ہیں؟

(a). حضرت ام سلمہؓ (b). حضرت عائشہؓ (c). حضرت خدیجہؓ (d). حضرت زینبؓ

5. حضرت علیؓ کے مجموعہ حدیث کا کیا نام تھا؟

(a). مصدقہ (b). جامعہ (c). نافعہ (d). صادقہ

6. حکومتی سطح پر سب سے پہلے حدیثوں کی جمع وتدوین کی کوششیں کس نے کیں؟

(a). عبد الملک بن مروان (b). المنصور (c). عمر بن عبد العزیز (d). ہارون رشید

7. عمر بن عبد العزیز کا یہ قول 'ان کے ہاں جایا کرو، روئے زمین پر ان سے بڑا سنت کا کوئی عالم موجود نہیں' کس کے متعلق ہے؟

(a). شہاب زہری (b). ابن حزم (c). قاسم بن محمد (d). سب غلط

8. ایسی حدیث جسے بخاری ومسلم دونوں نے روایت کی ہو، کیا کہلاتی ہے؟

(a). متفق علیہ (b). صحیح (c). شاہد (d). محفوظ

9. ایسی حدیث جن میں راوی اور حضور ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے ہوں کیا کہلاتی ہے؟

(a). منقطع (b). مدلس (c). ثلاثیات (d). موضوع

10. اصول حدیث کی کتاب "التقریب" کس کی لکھی ہوئی ہے؟

(a). امام نووی (b). ابن صلاح (c). حاکم نیشاپوری (d). خطیب بغدادی

10.11.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. حدیث کے لغوی واصطلاحی معانی پر روشنی ڈالیے۔
2. حدیث کی ضرورت پر روشنی ڈالیے۔
3. حدیث کی اصطلاحات پر ایک تعارفی نوٹ لکھیے۔
4. حدیث کی تدوین پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔
5. حدیث کی اہمیت کو بیان کیجیے۔

10.11.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. حدیث کی حجیت قرآنی آیات اور حدیث رسول ﷺ سے ثابت کیجیے۔
2. حفاظت واشاعت حدیث پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجیے۔
3. اصول حدیث کی تعریف و تاریخ بیان کیجیے۔

10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تدوین حدیث : مولانا مناظر احسن گیلانی
2. تذکرۃ المحدثین : غلام رسول سعیدی
3. معجم اصطلاحات الحدیث : ضیاء الرحمن الاعظمی / سہیل حسن بن غفار حسن
4. کلام نبوت (جلد اول) : محمد فاروق خاں

1. C	2. C	3. A	4. B	5. D
6. C	7. A	8. A	9. C	10. A

اکائی 11: اقسام حدیث: متواتر، مشہور، آحاد، صحیح، ضعیف

اکائی کے اجزا:

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 حدیث کی قسمیں

11.3 ہم تک پہنچنے کے لحاظ سے حدیث کی قسمیں

11.3.1 متواتر

11.3.2 آحاد

11.3.3 صحیح

11.3.4 حسن

11.3.5 مردود حدیث (ضعیف)

11.3.6 نسبت کے لحاظ سے حدیث کی قسمیں

11.3.7 راویوں کے لحاظ سے حدیث کی قسمیں

11.3.8 راوی پر تنقید (طعن) کے اعتبار سے حدیث کی قسمیں

11.4 اکتسابی نتائج

11.5 نمونہ امتحانی سوالات

11.5.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

11.5.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

11.5.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

11.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت، اقوال، افعال، اور تقریر کی جمع و تدوین اور حفاظت جس طریقے سے کی اور ان کی اس کوشش کے نتیجے میں احادیث رسول ﷺ سے متعلق جو اصول اور علوم وجود میں آئے آج وہ اسلامی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے رسول ﷺ کی باتوں کو سنا اور ان پر خود عمل پیرا ہوئے بلکہ رسول مقبول ﷺ کے ارشاد وہدایت کے مطابق ان کی تعلیمات کو اپنے بعد والوں تک پہنچایا بھی اور اس طرح پہنچایا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج رسول مقبول ﷺ کی حدیثیں نہ صرف یہ کہ اپنے الفاظ کے ساتھ محفوظ ہیں بلکہ ان اصولوں اور اصطلاحات وغیرہ کے ساتھ محفوظ ہیں جن کے ذریعے نہ صرف یہ کہ ان کی صحت کو جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے بلکہ ان کو سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے میں بھی ان سے مدد ملتی ہے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ

- علوم حدیث کا ایک طالب علم حدیث کے معنی ومفہوم اور مقام ومرتبہ کو جان لینے کے بعد علم حدیث کے ان بنیادی قسموں اور مقدمات کو بھی جان لے۔
- ان کو جانے بغیر حدیث کا مطالعہ اور اس سے اخذ واستفادہ ممکن نہیں۔
- حدیث کی قسمیں تفصیل سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کتب حدیث کی قسموں کا بھی جامع تعارف پیش کر دیا جائے۔

11.2 حدیث کی قسمیں

حدیث کی دو بنیادی قسمیں ہیں:

1. صریحی:

وہ حدیث جس میں صاف طور پر یہ ذکر ہو کہ وہ حضور ﷺ کا قول، فعل یا تقریر ہے۔

2. حکمی:

وہ حدیث جس میں قول، فعل یا تقریر کی نسبت اللہ کے رسول ﷺ کی طرف نہ ہو لیکن اس میں جن امور کو راوی نے نقل کیا ہو وہ ایسے ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی انہیں بتا نہیں سکتا۔ جیسے قیامت کی علامتیں، نبیوں کے حالات وغیرہ۔

11.3 ہم تک پہنچنے کے لحاظ سے حدیث کی قسمیں

ہم تک پہنچنے کے لحاظ سے حدیث کی دو قسمیں ہیں: 1. متواتر 2. آحاد

11.3.1 متواتر

اصطلاح میں اس حدیث کو متواتر کہتے ہیں جسے ہر دور میں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد نے روایت / بیان کیا ہو جس کا جھوٹ پر متفق ہونا ناممکن ہو۔

متواتر احادیث کی بہت بڑی تعداد حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ البتہ آحاد کے مقابلے میں ان کی تعداد کم ہے۔

11.3.2 آحاد

آحاد، احد کی جمع ہے جو واحد یا ایک کے معنی میں ہے۔ اصطلاح میں خبر واحد (حدیث آحاد) وہ حدیث ہے جس میں روایت کرنے والے تعداد کے لحاظ سے درجہ تواتر کو نہ پہنچتے ہوں یا جو حدیث متواتر کی شرطوں پر پوری نہ اترتی ہو۔ احادیث کا بیشتر ذخیرہ آحاد پر ہی مشتمل ہے۔

خبر واحد کی قسمیں:

محدثین نے اخبار آحاد کی تین قسمیں کی ہیں:

1. مشہور:

مشہور اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے بیان کرنے والے کسی بھی دور میں تین یا تین سے زیادہ ہوں، یعنی جس حدیث کے سلسلہ سند میں راویوں کی تعداد کسی بھی طبقے میں تین سے کم نہ ہو۔

2. عزیز:

عزیز اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے بیان کرنے والے کسی بھی دور میں دو سے کم نہ ہوں یعنی سلسلہ روایت / سند میں راویوں کی تعداد کسی بھی دور میں دو سے کم نہ ہو۔

3. غریب:

اصطلاح میں غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا بیان کرنے والا کسی دور میں ایک ہی راوی ہو یعنی سلسلہ سند کے کسی دور میں ایک ہی راوی ہو۔ غریب کو مفرد بھی کہتے ہیں۔

قوت وضعف کے لحاظ سے خبر واحد کی قسمیں

قوت وضعف کے لحاظ سے آحاد (خبر واحد) کی دو قسمیں ہیں: 1. مقبول 2. مردود

1. مقبول: مقبول وہ حدیث ہے جو اپنے مضمون (یعنی متن) اور سند کی صحت کے سبب ائمہ حدیث کے نزدیک قابل حجت ہو۔ اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔
2. مردود: مردود وہ حدیث ہے جو اپنے مضمون (یعنی متن) اور سند کے صحیح نہ ہونے کے سبب ائمہ حدیث کے نزدیک قابل حجت نہ ہو۔ اس پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔

(الف) مقبول حدیث:

مقبول حدیث کی دو قسمیں ہیں: 1. صحیح 2. حسن

11.3.3 صحیح

صحیح حدیث وہ ہے جس میں درج ذیل باتیں موجود ہوں:

(i) اس حدیث کی سند متصل ہو۔

(ii) حدیث کے راوی عادل اور سیرت و کردار کے لحاظ سے قابل اعتماد ہوں۔

(iii) حدیث کے راویوں کا حافظہ درست ہو اور صاحب فراست ہوں۔

(iv) حدیث شاذ نہ ہو (یعنی اس حدیث میں کسی زیادہ ثقہ راوی کی مخالفت نہ ہو)۔

(v) حدیث معلل نہ ہو (یعنی اس میں کوئی علت [مخفی نقص] نہ پائی جاتی ہو)۔

علمائے حدیث نے صحیح حدیث کی دو قسمیں کی ہیں: a. صحیح لذاتہ b. صحیح لغیرہ

a. صحیح لذاتہ: اگر کسی صحیح حدیث میں مذکورہ تمام شرائط پائیں جائیں تو وہ صحیح لذاتہ ہے۔ یعنی اس سے مراد وہ حدیث یا روایت ہے جس کی سند اپنے قائل تک متصل ہو۔ اس کے تمام راوی عادل اور ضابط ہوں وہ اپنے جیسے راویوں سے نقل کریں اور یہ کیفیت سند کے شروع سے آخر تک قائم رہے۔ نیز اس میں کوئی شذوذ (انفرادیت) یا کوئی مخفی علت نہ پائی جائے۔

b. صحیح لغیرہ: اس حدیث کو کہتے ہیں جو حقیقت میں حسن لذاتہ (اس کا ذکر آگے آئے گا) ہو مگر مزید اس جیسی یا اس سے قوی سندوں کے ذریعے بھی منقول ہو۔ اس طرح کی حدیث کو صحیح لغیرہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسے صحیح کا درجہ اپنی سند کی وجہ سے نہیں حاصل ہوا بلکہ اس کی سند کے ساتھ کسی اور سند کے مل جانے کی وجہ سے وہ صحیح کے درجہ تک پہنچی ہے۔ اس کا درجہ حسن لذاتہ سے بلند اور صحیح لذاتہ سے کم ہے۔

11.3.4 حسن

وہ حدیث جس میں صحیح حدیث کی تمام شرطیں پوری ہوتی ہوں۔ حدیث کے راوی کا صرف تھوڑا حافظہ کمزور ہو تو اس حدیث کو حسن کہیں گے۔

علمائے حدیث نے حسن حدیث کی بھی دو قسمیں کی ہیں: a. حسن لذاتہ b. حسن لغیرہ

a. حسن لذاتہ: خبر واحد جس کے راوی عادل اور ضابط ہوں، سند متصل ہو، حدیث معلل اور شاذ نہ ہو تو وہ حدیث صحیح کہلاتی ہے۔ لیکن اگر راوی کا ضبط ضعیف (تھوڑا حافظہ کمزور) ہو تو اس صورت میں اسے حسن لذاتہ کہیں گے۔

b. حسن لغیرہ: وہ ضعیف روایت جو کئی سندوں سے ثابت ہو، مگر ضعف کا باعث راوی کا فسق یا کذب نہ ہو تو اصول حدیث کی اصطلاح میں حسن لغیرہ قرار پائے گی۔ یعنی کوئی بھی ضعیف حدیث ذیل کی دو شرطوں کے ساتھ حسن لغیرہ کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔

(i) وہ حدیث مزید ایک یا دو سندوں سے ثابت ہو اور یہ دوسری سند بھی اسی جیسی یا اس سے قوی تر ہو۔

(ii) اس روایت کے ضعف کا سبب اس کے راوی کے حافظہ کی کمزوری، سند کا انقطاع یا راویوں کا مجہول ہونا نہ ہو۔

حسن لذاتہ کے مقابلے حسن لغیرہ کا درجہ کم ہے۔

مقبول حدیث کی ایک اور تقسیم:

خبر مقبول کی بعض دوسری اقسام یہ ہیں: 1. محکم 2. مختلف الحدیث

3. ناسخ و منسوخ 4. متوقف فیہ

1. محکم:

اصول حدیث کی اصطلاح میں محکم سے مراد وہ مقبول حدیث ہے جو اپنی جیسی دوسری احادیث سے متعارض نہ ہو۔ زیادہ تر حدیثیں اسی قسم کی ہیں اور وہ حدیثیں جو ایک دوسرے سے متعارض ہوں بہت ہی کم ہیں۔

2. مختلف الحدیث:

اصول حدیث کی اصطلاح میں مختلف الحدیث وہ مقبول حدیث ہے جو اپنی جیسی حدیث کے بظاہر معارض ہو لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان جمع و تطبیق کا امکان موجود ہو۔

یعنی مختلف الحدیث ایسی صحیح یا حسن حدیث ہے جس کے مقابلے میں اسی قوت و مرتبہ کی ایک دوسری حدیث بھی موجود ہو جو ظاہری معنی کے لحاظ سے اس کی مخالف ہو۔ لیکن اس کے باوجود اہل علم و فہم کے لئے ممکن ہو کہ ان دونوں حدیثوں کو قابل قبول شکل میں تطبیق دے دیں۔

3. ناسخ و منسوخ:

اصول حدیث کی اصطلاح میں ناسخ و منسوخ کا حکم یہ ہے کہ شارع نے پہلے کوئی حکم دیا پھر بعد میں دوسرا حکم دے کر اس پہلے حکم کو ختم یا زائل کر دیا۔ یعنی اگر مقبول حدیث کے مقابلے میں کوئی دوسری مقبول حدیث آجائے اور دونوں میں مطابقت ممکن نہ ہو تو جو حدیث مقدم (پہلے) ہو گی وہ منسوخ قرار پائے گی۔ اور جو مؤخر (بعد میں) ہو گی اسے ناسخ قرار دیں گے۔ شرط یہ ہے کہ دونوں کے راوی ایک ہی درجے کے ہوں۔

4. متوقف فیہ:

جب دو حدیثوں میں تعارض ہو اور دونوں میں تطابق (مطابقت پیدا کرنا) ناممکن ہو اور شان نزول کے لحاظ سے ان میں سے کسی کو ناسخ و منسوخ قرار دینا بھی ممکن نہ ہو (اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے) تو ایسی صورت میں ان دونوں پر عمل کرنے میں توقف کیا جائے گا۔

11.3.5 مردود حدیث (ضعیف)

حدیث کے علماء نے مردود حدیث کی بہت سی قسمیں کی ہیں اور ان کے الگ الگ نام بھی لکھے ہیں، لیکن عام طور پر ان سب کے

لیے ضعیف کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

ضعیف:

اصول حدیث کی اصطلاح میں ضعیف ہر اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں حسن حدیث کی ضروری شرطوں میں سے کوئی ایک شرط موجود نہ ہو۔ راویوں کے ضعف کے لحاظ سے ضعیف حدیث کی متعدد قسمیں ہیں، ان میں بعض ضعیف، بعض بہت زیادہ ضعیف، بعض واہی (بے کار) اور بعض منکر (جس کا انکار کیا جائے) ہوتی ہیں۔ ان میں بدترین قسم موضوع حدیث کی ہے۔

11.3.6 نسبت کے لحاظ سے حدیث کی قسمیں

حدیث کی جس کی طرف نسبت کی جائے اس لحاظ سے اس کی چار قسمیں ہیں:

1. حدیث قدسی
2. حدیث مرفوع
3. حدیث موقوف
4. حدیث مقطوع

1. حدیث قدسی:

اس سے مراد وہ حدیث جو ذات اقدس یعنی اللہ تعالی کی طرف منسوب ہو۔

اصول حدیث کی اصطلاح میں حدیث قدسی وہ حدیث ہے جو حضور ﷺ سے روایت ہو کر ہم تک اس طرح پہنچے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی نسبت اللہ عزوجل کی طرف کی ہو۔ مطلب یہ کہ حدیث قدسی وہ ہے جس کی روایت نبی ﷺ اللہ کی طرف منسوب کر کے فرمائیں۔

2. حدیث مرفوع:

اصول حدیث کی اصطلاح میں جس قول، فعل، تقریر اور صفت کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کی جائے وہ حدیث مرفوع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ قول، فعل، تقریر اور صفت جو نبیؐ کی طرف منسوب ہو وہ مرفوع حدیث ہے۔ خواہ اسے آپ کی طرف کسی صحابی نے منسوب کیا ہو یا کسی تابعی نے یا نچلے درجے کے راویوں میں سے کسی دوسرے راوی شخص نے، خواہ اس کی سند متصل ہو یا نہ ہو۔ اگر حدیث کی سند متصل نہیں ہے تو وہ حدیث ضعیف قرار پائے گی اور اگر سند متصل ہو تو پھر راویوں کے درجے کے اعتبار سے اس حدیث کو صحیح یا حسن کہا جائے گا۔

جیسا کہ اس کی تعریف سے ہی ظاہر ہے، مرفوع حدیث کی چار قسمیں ہیں:

(i) مرفوع قولی (ii) مرفوع فعلی

(iii) مرفوع تقریری (iv) مرفوع وصفی

(i) مرفوع قولی: اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں حضور ﷺ کا قول نقل کیا گیا ہو۔ مثال کے طور پر صحابی یا تابعی وغیرہ یہ کہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا" قال رسول الله ...".

(ii) مرفوع فعلی: اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں حدیث بیان کرنے والا یہ کہتا ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا یا کسی دوسرے نے مجھے بتایا کہ آپ ﷺ اس طرح کام کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر صحابی یا تابعی وغیرہ کہیں کہ "اللہ کے رسول ﷺ نے ایسا کیا"...

(iii) مرفوع تقریری: اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں حدیث بیان کرنے والا یہ کہتا ہے کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں میں نے یا کسی دوسرے شخص نے ایسا کیا اور آپ ﷺ نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ مثال کے طور پر صحابی یا تابعی وغیرہ یہ کہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے یہ کام کیا گیا۔

(iv) مرفوع وصفی: اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں حدیث بیان کرنے والا حضور ﷺ کی کسی صفت یا خوبی کو بیان کرے۔ مثال کے طور پر صحابی یا تابعی وغیرہ یہ کہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ لوگوں میں سب سے بہتر اخلاق والے تھے۔

3. حدیث موقوف:

اصول حدیث کی اصطلاح میں ایسے قول، فعل یا تقریر کو حدیث موقوف کہا جاتا ہے جس کی نسبت کسی ایک صحابی یا صحابہ کرام کی جماعت کی طرف کی جائے۔ یہ نسبت متصل سند کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے اور منقطع سند کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

(i) موقوف قولی

(ii) موقوف فعلی

(iii) موقوف تقریری

4. حدیث مقطوع:

اصول حدیث کی اصطلاح میں مقطوع اس قول کو کہیں گے جس کی نسبت تابعی یا اس سے نیچے کے راویوں کی طرف کی گئی ہو۔

اس کی دو قسمیں ہیں: (i) مقطوع قولی (ii) مقطوع فعلی

بعض لوگ موقوف اور مقطوع کو اثر کہتے ہیں یعنی یہ لوگ صحابی اور تابعی کے قول و عمل کو بالترتیب موقوف اور مقطوع کہتے ہیں۔ محدثین کے نزدیک مقطوع (حدیثوں) سے شریعت کے احکام میں استدلال نہیں کیا جا سکتا، اور موقوف کے بارے میں بعض اہل علم کی یہی رائے ہے۔

11.3.7 راویوں کے لحاظ سے حدیث کی قسمیں

راویوں کے لحاظ سے حدیث کی چھ قسمیں ہیں: 1. مسند 2. متصل 3. مُعلّق

4. مرسل 5. مُعضل 6. مُنقطع

1. مسند:

اصول حدیث کی اصطلاح میں مسند وہ روایت ہے جس کی سند اتصال کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع (پہنچتی) ہو۔

2. متصل:

اصول حدیث کی اصطلاح میں متصل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند کا سلسلہ شروع سے آخر تک متصل ہو یعنی پوری سند میں کہیں سے بھی کوئی راوی ساقط (غیر موجود) نہ ہو۔ خواہ وہ حدیث مرفوع ہو یا موقوف۔

3. مُعلّق:

اصول حدیث کی اصطلاح میں معلق اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند کی ابتدا سے ایک یا ایک سے زائد راوی لگاتار چھوڑ دیے گئے ہوں، یا پوری سند ہی کو حذف کر دیا گیا ہو۔ (اصطلاح حدیث میں ایسا کرنے کو تعلیق کہتے ہیں۔)

4. مرسل:

اصول حدیث کی اصطلاح میں مرسل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند کے سلسلے میں تابعی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صحابی کا ذکر نہ ہو یعنی تابعی سے اوپر کا راوی ساقط ہو۔

5. مُعضل:

اصول حدیث کی اصطلاح میں معضل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند کے سلسلے سے لگاتار دو راوی چھوڑ دیے گئے ہوں۔

6. مُنقطع:

اصول حدیث کی اصطلاح میں منقطع اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند متصل نہ ہو یا درمیان میں کوئی مبہم راوی آگیا ہو یعنی سند کے سلسلے سے کہیں پر ایک یا اس سے زیادہ راوی ساقط ہو گئے ہوں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ منقطع کا اطلاق اسی حدیث پر ہو گا جو معلق، مرسل اور معضل کی تعریف میں نہ آتی ہو۔

حدیث کی درج بالا قسموں میں سند کا سقوط ظاہر ہوتا ہے۔ حدیث کی بعض اقسام وہ ہیں جن میں سند کا سقوط ظاہر نہیں ہوتا بلکہ مخفی ہوتا ہے مثلاً: 1. مُدَلّس 2. مرسل خَفی۔

1. مُدَلّس:

اصول حدیث کی اصطلاح میں مدلس اس روایت کو کہتے ہیں جس میں تدلیس واقع ہوئی ہو۔ ذیل میں ہم تدلیس کی تعریف اور اس کی قسمیں بیان کرتے ہیں۔

تدلیس: عربی زبان میں تدلیس عیب چھپانے کو کہتے ہیں خاص طور پر جب کسی چیز کو بیچنے والا اس کے خریدار سے اس چیز کا عیب چھپائے۔ مدلّس حدیث میں اس کے طالب سے اس حدیث کا عیب چھپالیا جاتا ہے۔ تدلیس کرنے والے کو مدلّس (ل کے زیر کے ساتھ) کہتے ہیں۔

اصول حدیث کی اصطلاح میں سند کے عیب کو چھپانے اور اس کی ظاہری شکل کو حسین بنا دینے کو تدلیس کہتے ہیں۔ یعنی راوی جس

سے روایت کرے اس سے اس کی ملاقات ہو مگر روایت اس نے اس سے براہ راست نہ سنی ہو البتہ الفاظ ایسے استعمال کرے جس سے یہ گمان گزرے کہ اس نے اس سے براہ راست سنی ہے۔

تدلیس کی دو اہم قسمیں ہیں: (i) تدلیس الاسناد (ii) تدلیس الشیوخ۔

(i) تدلیس اسناد:

اصول حدیث کی اصطلاح میں تدلیس اسناد کی تعریف یہ ہے کہ راوی اپنے کسی ہم عصر سے جس سے اسے سماعت حاصل ہو، کوئی ایسی روایت بیان کرے جو در حقیقت اس سے نہ سنی ہو، مگر اس کی جانب نسبت کرتے ہوئے سننے کی صراحت بھی نہ کرے۔

مطلب یہ ہوا کہ ایک راوی نے کسی شیخ سے کچھ روایات سنی ہوتی ہیں اور کچھ کسی دوسرے سے۔ بعض اوقات راوی کوئی حدیث اپنے معروف شیخ کی طرف نسبت کر کے بیان کر دیتا ہے، حالانکہ وہ روایت اس نے مذکورہ شیخ سے نہیں سنی ہوتی ہے۔ اور اصل شیخ جس سے سنی ہے اس کا نام وہ کسی وجہ سے حذف کر دیتا ہے، اور اس موقع پر قال (اس نے کہا)، عن (فلاں سے) جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن میں سماع کا شبہ اور احتمال تو ہے مگر صراحت نہیں۔

(ii) تدلیس شیوخ:

راوی اپنے کسی شیخ سے کوئی حدیث روایت کرے، مگر سند بیان کرتے ہوئے اس کے معروف نام کی جگہ اس کی کنیت، نسب یا وصف کا ذکر کرے جو معروف نہ ہو۔ اس عمل سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شیخ کی پہچان نہ ہو سکے۔

2. مرسل خفی:

اصول حدیث کی اصطلاح میں مرسل خفی اس روایت کو کہتے ہیں جس کو راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس سے اس نے ملاقات کی ہو یا اس کا ہم زمانہ ہو، مگر اس سے روایت نہ سنی ہو اور پھر ایسے لفظ سے روایت کرے جس سے سماع کا احتمال ہوتا ہو، مثلاً یوں کہے: "قال" (شیخ نے کہا)۔

- تدلیس اور ارسال خفی کے درمیان فرق:

تدلیس اور ارسال خفی کے درمیان فرق یہ ہے کہ ارسال راوی کی اس شخص سے روایت ہے جس سے اس نے نہ سنا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدلّس اور مرسل میں سے ہر ایک اپنے شیخ (استاذ) سے وہ روایت کرتا ہے جو اس نے اس سے نہیں سنا اور وہ بھی ایسے لفظ سے جس میں سماع کا احتمال ہے، لیکن مدلّس نے بسا اوقات اس شیخ سے ان احادیث کے علاوہ جن میں اس نے تدلیس کی ہے دوسری حدیثیں بھی سنی ہوئی ہیں۔ مگر مرسل (مرسل خفی کا راوی) جب ارسال خفی کرتا ہے تو اس نے اس شیخ سے کبھی کچھ سنا ہی نہیں ہوتا۔ البتہ وہ اس کا ہم زمانہ ہوتا ہے یا اس سے ملاقات کی ہوتی ہے۔

- معنعن (مُعَنْعَن):

معنعن اس روایت کو کہتے ہیں جس میں ایک راوی اپنے سے پہلے والے راوی سے عن کے لفظ کے ساتھ روایت کرتا ہے، مثلاً وہ

کہے: عن عروة عن عائشة (یعنی یہ روایت مجھ تک عروہ سے اور عروہ تک حضرت عائشہ سے پہنچی) اس سے یہ بات صاف اور واضح نہیں ہوتی کہ اس نے یہ حدیث خود سنی ہے یا درمیان میں کوئی اور بھی ہے جس کو اس نے حذف کر دیا ہے۔ اسی لیے معنعن حدیث میں تدلیس یا ارسال کا شبہ ہوتا ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عن یا قال جیسے الفاظ کا استعمال اکثر اہل فن کے نزدیک سماعت کے لیے ہوتا ہے اور اس سے مراد مطلق اجازت اور اتصال کے لیے ہوتا رہا ہے۔ البتہ سماع کے مقابلے میں اس کا مرتبہ بہر حال کم تر ہے۔

- مؤنن (مُؤَنَّن):

اصول حدیث کی اصطلاح میں مؤنن وہ حدیث ہوتی ہے جس میں راوی "حدثنا فلان أنّ فلاناً قال: ..." (ہم سے فلاں نے بیان کیا کہ اس سے فلاں نے کہا) کے الفاظ استعمال کرے۔ جمہور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ اَنّ بھی بالکل عن کی طرح ہے اور اس کی مطلق صورت کو عن کی شرائط کے ساتھ سماع پر محمول کیا جائے گا۔

11.3.8 راوی پر تنقید (طعن) کے اعتبار سے حدیث کی قسمیں

دس چیزیں ایسی ہیں جن کو راوی میں طعن کا درجہ دیا گیا ہے اور جن کی وجہ سے حدیث مردود ہو جاتی ہے۔ ان میں سے پانچ کا تعلق عدالت وثقاہت سے ہے اور پانچ کا تعلق ضبط وحفظ سے ہے۔

(الف) وہ پانچ باتیں جو راوی کی عدالت وثقاہت کو مجروح کرتی ہیں، درج ذیل ہیں:

1. کذب یعنی جھوٹ
2. جھوٹ کی تہمت
3. فسق (تقوی کا فقدان)
4. بدعت
5. جہالت

(ب) وہ پانچ چیزیں جو ضبط وحفظ کو مجروح کر دیتی ہیں۔

1. فاش غلطی
2. حافظہ کی خرابی
3. غفلت اور لاپرواہی
4. کثرت اوہام
5. ثقہ راویوں کی مخالفت

اس طرح کی مردود روایتوں کی تفصیل اس طرح ہے:

1. موضوع:

راوی پر تنقید کا سبب اگر کوئی جھوٹی بات ہو جس کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی گئی ہو تو اس حدیث کو موضوع کہا جائے گا۔

اصول حدیث کی اصطلاح میں موضوع اس جھوٹ کو کہتے ہیں جسے اپنی طرف سے گھڑ لیا جائے اور پھر اس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دی جائے۔(نعوذ باللہ) علماء کے نزدیک یہ بدترین روایت ہے اور جانتے ہوئے ایسی روایت کا بیان کرنا ناجائز ہے۔

2. متروک:

اگر راوی پر کذب (جھوٹ) کی تہمت لگائی گئی ہو تو اس کی بیان کردہ حدیث متروک کہلائے گی۔ اصول حدیث کی اصطلاح میں متروک وہ حدیث ہے جس کی سند میں کوئی راوی متہم بالکذب (جس پر جھوٹ کی تہمت لگ چکی ہو) ہو۔ متروک حدیث بھی موضوع کے قریب قریب ہے۔

3. منکر:

اگر راوی کے اندر فاش غلطیاں، بہت زیادہ غفلت اور لاپرواہی یا فسق پایا جائے تو اس کی بیان کی ہوئی حدیث منکر کہلائے گی۔ اصول حدیث کی اصطلاح میں منکر وہ حدیث ہے جس کی سند میں کوئی راوی فاش غلطی، بہت زیادہ غفلت اور نمایاں طور پر فسق میں مبتلا ہو۔ ساتھ ہی وہ راوی ضعیف ہو اور اپنے سے ثقہ اور قوی راوی کی مخالفت کرتا ہو۔ اس کا درجہ متروک کے بعد آتا ہے۔ اس کے برعکس وہ حدیث جس کا راوی قوی ہو اور اس کی مخالفت کسی ضعیف راوی نے بھی نہ کی ہو، معروف کہلاتی ہے اور یہ مقبول کی ایک قسم ہے۔

4. معلل:

اگر راوی پر تنقید اس وجہ سے کی گئی ہو کہ وہ بہت زیادہ وہم کا شکار ہے تو اس کی روایت کی ہوئی حدیث معلل کہلائے گی۔ اصول حدیث کی اصطلاح میں معلل وہ حدیث ہے جس کی کوئی ایسی کمزوری معلوم ہو جائے جو اس کی صحت کو مجروح کر دے۔ اگرچہ حدیث اس سے پاک نظر آتی ہو۔ یعنی معلل سے مراد وہ حدیث ہے جس میں کوئی ایسی مخفی علت پائی جائے جو اس کے صحیح ہونے پر اثر انداز ہوتی ہو جب کہ ظاہری طور پر وہ بے عیب معلوم ہوتی ہو۔

5. مدرج:

اصول حدیث کی اصطلاح میں مدرج اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے سلسلہ سند کو بدل دیا گیا ہو یا حدیث کے متن میں باہر سے ایسے الفاظ شامل کر دیے گئے ہوں جن کے بارے میں متن حدیث ہونے کا شبہ ہو، یعنی کوئی خط امتیاز نہ ہو۔

مدرج کی دو قسمیں ہیں: (i) مدرج الاسناد (ii) مدرج المتن

(i) مدرج الاسناد:

مدرج الاسناد اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے سلسلہ سند میں تغیر اور تبدیلی کر دی گئی ہو۔

(ii) مدرج المتن:

مدرج المتن اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے متن (اصل عبارت) میں ایسے الفاظ شامل کر دئے جائیں جو متن کا حصہ نہ ہوں لیکن حدیث کے متن سے ان کی علیحدگی ظاہر کرنے کے لیے کوئی علامت باقی نہ رہنے دی گئی ہو۔

6. مقلوب:

اصول حدیث کی اصطلاح میں وہ حدیث مقلوب کہلاتی ہے جس کی سند میں راویوں کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو یا متن حدیث کے الفاظ مقدم ومؤخر ہو گئے ہوں، یعنی سند یا متن میں الٹ پھیر ہوا ہو۔

مقلوب کی بھی دو قسمیں ہیں: (i) مقلوب الاسناد (ii) مقلوب المتن

(i) مقلوب الاسناد:

مقلوب الاسناد وہ حدیث ہے جس کی سند کے الفاظ میں تبدیلی کر دی گئی ہو خواہ یہ ناموں کا الٹ پھیر ہو یا ایک نام کی جگہ کوئی دوسرا نام لیا گیا ہو۔

(ii) مقلوب المتن:

مقلوب المتن وہ حدیث ہے جس کے متن کے الفاظ میں راوی نے تقدیم و تاخیر کر دی ہو، اس کی دو صورتیں ہیں۔ الفاظ آگے پیچھے ہو گئے ہوں یا ایک حدیث کی سند میں دوسری کا متن جوڑ دیا گیا ہو۔

7. المزید فی متصل الاسانید:

اصول حدیث کی اصطلاح میں مزید فی متصل الاسانید اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند میں جو متصل ہو کسی جگہ ایک راوی کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ اس اضافے کو ہی فی الواقع مزید فی متصل الاسانید کہا جاتا ہے۔

8. مضطرب:

اصول حدیث کی اصطلاح میں مضطرب وہ حدیث ہے جو مختلف طرق (طریقوں) سے مروی ہو اور سب طرق قوت میں مساوی ہوں۔ یعنی مضطرب وہ حدیث ہے جو مختلف اور متعارض شکلوں پر مروی ہو جن کو باہم جمع کرنا ممکن نہ ہو۔ نیز یہ تمام روایتیں ایسے طرق سے مروی ہوں جو ہر لحاظ سے یکساں درجے کے ہوں جس کی وجہ سے کسی ایک طریق یعنی سلسلہ روایت کو دوسرے طرق پر کسی صورت میں ترجیح دینا ممکن نہ ہو۔

9. مُصَحَّف:

اصول حدیث کی اصطلاح میں اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے ان کلمات کو جو ثقہ راویوں نے بیان کیے ہوں لفظی و معنوی طور پر بدل دیا گیا ہو۔ یہ تبدیلی سند میں بھی ہو سکتی ہے اور معنی میں بھی۔

11.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- حدیث کی دو بنیادی قسمیں ہیں: صریحی اور حکمی۔

- ہم تک پہنچنے کے لحاظ سے حدیث کی دو قسمیں ہیں: متواتر اور آحاد۔ پھر آحاد کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں: مشہور، عزیز اور غریب۔
- آحاد کی ایک اور تقسیم قوت و ضعف کے اعتبار سے ہے، یہ دو قسمیں ہیں: مقبول اور مردود۔
- نسبت کے لحاظ سے حدیث کی چار قسمیں ہیں: حدیث قدسی، حدیث مرفوع، حدیث موقوف اور حدیث مقطوع۔
- راویوں کے لحاظ سے حدیث کی چھ قسمیں ہیں: مسند، متصل، معلق، مرسل، معضل، منقطع۔
- راویوں پر تنقید کے اعتبار سے حدیث کی مختلف قسمیں ہیں، جن میں اہم یہ ہیں: موضوع، متروک، منکر، معلل، مدرج، مقلوب، المزید فی متصل الاسانید، مضطرب، مصحف۔

11.5 نمونہ امتحانی سوالات

11.5.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. جس حدیث کی روایت کرنے والے لوگوں کی تعداد اتنی بڑی ہو کہ عادتاً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا ناممکن ہو وہ کیا کہلاتی ہے؟

(a). متواتر　(b). آحاد　(c). مشہور　(d). مقبول

2. محدثین نے اخبار آحاد کی کتنی قسمیں بیان کی ہیں؟

(a). دو　(b). چار　(c). پانچ　(d). تین

3. جس حدیث کو روایت کرنے والا راوی کسی دور میں ایک ہی ہو اسے اصطلاح حدیث میں کیا کہا جاتا ہے؟

(a). ضعیف　(b). غریب　(c). موقوف　(d). مقطوع

4. صحیح اور حسن، حدیث کی کس قسم سے تعلق رکھتے ہیں؟

(a). معنعن　(b). مسند　(c). مرسل　(d). مقبول

5. جس حدیث کا راوی عادل اور ضبط ضعیف ہو، سند متصل ہو، حدیث معلل اور شاذ نہ ہو وہ کیا کہلاتی ہے؟

(a). صحیح لذاتہ　(b). صحیح لغیرہ　(c). حسن لذاتہ　(d). حسن لغیرہ

6. "محکم، مختلف الحدیث، ناسخ و منسوخ اور متوقف فیہ" کس قسم کی حدیثوں کے ذیل میں آتے ہیں؟

(a). معنعن　(b). مسند　(c). مرسل　(d). مقبول

7. جس حدیث کی نسبت آنحضور ﷺ کی طرف کی گئی ہو اسے کیا کہتے ہیں؟

(a). حدیث قدسی　(b). حدیث مرفوع　(c). حدیث موقوف　(d). حدیث مقطوع

8. جس راوی پر جھوٹے ہونے کی تہمت لگائی گئی ہو اس کی روایت کردہ حدیث کیا کہلاتی ہے؟

(a). متروک　(b). منکر　(c). معلل　(d). مدرج

9. اصول حدیث کی اصطلاح میں وہ حدیثکو کیا کہتے ہیں جس میں راوی "حدثنا فلان أن ٓ فلاناً قال:..." کے الفاظ استعمال کرے؟

(a). مونن (b). موضوع (c). متروک (d). مدرج

10. راویوں کے لحاظ سے حدیث کی کتنی قسمیں ہیں؟

(a). دو (b). چار (c). پانچ (d). چھ

11.5.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. مقبول حدیث کی کتنی قسمیں ہیں؟ بیان کیجیے۔
2. حدیث مرفوع اور حدیث موقوف کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے ان کی قسموں پر روشنی ڈالیے۔
3. تدلیس کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کی قسموں کی تفصیلی نوٹ لکھیں، نیز تدلیس اور ارسال کے درمیان فرق واضح کیجیے۔
4. حدیث کی اصطلاحات مضطرب، معنعن، متفق علیہ، شاذ، محفوظ، مجہول، شاہد اور ثلاثیات کا تعارف پیش کیجیے۔
5. حسن حدیث کی تعریف کرتے ہوئے اس کی قسموں کو بیان کیجیے۔

11.5.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. راویوں کے لحاظ سے حدیث کی قسموں پر ایک مضمون تحریر کیجیے۔
2. راوی پر تنقید کے اعتبار سے حدیث کی کیا قسمیں ہیں؟ مفصل قلمبند کیجیے۔
3. حدیث کی قسموں پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔

11.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. معجم اصطلاحات الحدیث : ضیاء الرحمن الاعظمی / سہیل حسن
2. علوم الحدیث : صبحی صالح / غلام احمد حریری
3. اصطلاحات حدیث: تعریف اور تشریح : محمود الطحان / مظفر حسین ندوی
4. علم حدیث ایک تعارف : محمد فاروق خاں
5. معروضی سوالات کے جوابات

1. A	2. A	3. B	4. D	5. C
6. D	7. B	8. B	9. A	10. D

اکائی 12: کتابت حدیث

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 کتابت و تدوین حدیث کا مفہوم

12.2.1 تدوین حدیث کے مراحل

12.2.2 حفاظت حدیث کے تین طریقے

12.2.3 مکہ کے اہل قلم

12.2.4 مدینہ کے اہل قلم

12.2.5 کتابت عہد رسالت میں

12.2.6 سفر ہجرت میں بھی لکھنے کا اہتمام

12.2.7 تاریخ کا پہلا تحریری دستوری مملکت

12.2.8 مردم شماری کی پہلی تحریر

12.2.9 دربار نبوی کے کاتب

12.2.10 خواتین کے لکھنے کی تعلیم

12.2.11 کتابت حدیث کی ممانعت اور اس کے جواز کی حدیث

12.2.12 کتابت حدیث کی اجازت

12.2.13 تدوین حدیث حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں

12.3 عہد رسول اللہ کی سرکاری دستاویز

12.4 تدوین حدیث صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں

12.5 فرہنگ

12.6 اکتسابی نتائج

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

12.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

12.7.1 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

12.7.2 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

12.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

لفظ حدیث کا لغوی معنی عربی زبان میں گفتگو، نئی بات، کسی اہم اور قابل ذکر واقعہ کے ہیں، لیکن اصطلاحی طور پر لفظ حدیث سے مراد وہ تمام چیزیں جس کا تعلق آنحضرت محمد ﷺ سے ہے، یعنی آپ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال (تقریر) ہیں۔ علامہ بدر الدین عینی کے مطابق علم حدیث وہ علم ہے جس کے ذریعہ رسول اکرم ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال (تقریر) معلوم کئے جائیں۔ دوسرے الفاظ میں ہر چیز جو محمد ﷺ کی ذات گرامی سے نسبت رکھتی ہے وہ حدیث ہے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں ماخذ قانون شریعت ہیں اور اس حیثیت سے دونوں میں گہرا باہمی تعلق ہے۔ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم ہیں۔ قرآن مجید بنیاد ہے تو حدیث رسول ﷺ اس بنیاد پر تعمیر کیا جانے والا ڈھانچہ ہے۔ قرآن مجید تنا ہے اور حدیث اس تنے سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول اور کلیات بیان کئے گئے ہیں۔ ان اصولوں اور کلیات کی عملی تطبیق احادیث کے ذریعہ ہوئی۔

حدیث کے مترادف ایک لفظ سنت ہے، جس کی تعریف یہ ہے کہ وہ طریقہ جو محمد ﷺ نے مسلمانوں کے لیے قائم فرمایا ہے۔ اسلامی شریعت کی اصطلاح میں سنت محمد رسول ﷺ کا وہ طرز عمل جس کی آپ ﷺ نے دعوت دی، جس کو قائم کرنے کے لئے وہ دنیا میں بھیجے گئے اور جو صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے سیکھ کر اختیار کیا اور نسلا بعد نسل آج تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس طریقہ کو عربی زبان میں اور اسلام کی اصطلاح میں سنت کہا جاتا ہے۔ علمائے اصول کی اصطلاح میں سنت محمد ﷺ کا دیا ہوا وہ طریقہ جس پر مسلمان عمل کرتے ہیں، جو شریعت کے احکام کا ماخذ اور مصدر ہے۔ علمائے حدیث کے یہاں سنت سے مراد وہ طریقہ یا وہ انداز اور ڈھنگ ہے جس پر کوئی انسان زندگی گزارتا ہے یا جس کے مطابق کوئی کام کرتا ہے۔ جمہور علما کا کہنا ہے کہ طریقہ متبعہ کا نام سنت ہے، یعنی وہ طریقہ جس کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا وہ سنت ہے۔

علم حدیث کے بارے میں محدثین کرام نے جس باریک بینی اور دقیق نظری سے کام لیا، جتنی محنت، محبت، عقیدت اور کاوش سے علم حدیث کو آئندہ نسلوں تک پہونچایا اور رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کو محفوظ کیا، وہ پوری انسانی تاریخ کا ایک منفرد اور بے مثال

کارنامہ ہے۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ:

- حدیث و سنت کا مفہوم، تدوین حدیث اور اس کے مختلف مراحل، حفاظت حدیث اور اس کا طریقہ کار، مکہ اور مدینہ کے اہل قلم کے بارے میں واقفیت حاصل ہوگی۔
- اس بات کا علم ہو کہ ابتداء میں محمد ﷺ نے حدیث کو لکھنے سے کیوں منع کیا بلکہ بعد میں نہ صرف اجازت دی اور اس کا حکم دیا۔
- علم ہوگا کہ محمد ﷺ کے ذریعہ کئے گئے معاہدے، حکم نامے، ہدایت نامے، دستاویز وغیرہ احادیث ہی ہیں۔
- محمد ﷺ کے عہد کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے زمانہ میں حدیث کے میدان میں کیا کیا کام انجام دئے گئے اس سے بھی واقفیت ہوگی۔
- اس بات کا ادراک ہوگا کہ علم حدیث کی تدوین وکتابت کے بارے میں جو شکوک وشبہات ظاہر کیے جاتے ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں۔

12.2 کتابت و تدوین حدیث کا مفہوم

کتب تاریخ میں جہاں تدوین حدیث کا ذکر آیا ہے اس سے مراد سرکاری سطح پر ہونے والی وہ تدوین ہے جس کا اہتمام اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے دور خلافت میں فرمایا۔ جس کے تحت جملہ احادیث کے یکجا ضبط تحریر میں لانے کا سرکاری اور باقاعدہ انتظام ہوا۔ خود تدوین کا لفظ اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے کہ تدوین کے معنی لکھنے کے نہیں بلکہ پہلے سے لکھے ہوئے ذخیرے کے جمع کرنے یا یکجا کرنے کے ہیں۔ اس لیے تدوین حدیث کی حکومتی سطح پر سعی و کوشش سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہ اس سے قبل احادیث نہیں لکھی گئیں، یہ غلط ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ احادیث محمد ﷺ کے حیات میں ہی آل بیت رسول اللہ ﷺ اور مقربین صحابہ کے ذریعہ لکھی اور محفوظ کی جانے لگی تھی۔

12.2.1 تدوین حدیث کے مراحل

آنحضرت محمد ﷺ کو خود حدیث کی حفاظت اور روایت منظور و مطلوب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ جب گفتگو فرماتے تو آہستہ آہستہ اور خوب وضاحت کے ساتھ ارشاد فرماتے تاکہ سننے والے کو پورا فائدہ حاصل ہو۔ ضروری باتوں کو آپ ﷺ تین تین مرتبہ بھی دہراتے تاکہ حاضرین خوب یاد کرلیں، چنانچہ آپ ﷺ نے روایت حدیث کی ترغیب دلاتے ہوئے مختلف مواقع پر ارشادات فرمائے ہیں؛

1. "جو موجود ہیں وہ غیر موجود لوگوں تک پہونچادیں"۔

2. "تم مجھ سے سنتے ہو، دوسرے لوگ تم سے سنیں گے، اور پھر ان سے اور لوگ سنیں گے"۔

3. "اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو رونق اور تابندگی عطا کرے جس نے میری بات سنی اور یاد رکھی، یہاں تک کہ وہ بات اس شخص تک پہونچادی جس نے اسے نہیں سنا"۔

اس کے ساتھ آپ ﷺ نے صحت حدیث کو قائم رکھنے کے لئے فرما دیا کہ "جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ تدوین حدیث کی عظیم خدمت کئی مراحل میں مکمل ہوئی اور امت کی بے حد و حساب مساعی کی بدولت احادیث نبوی کا عظیم ذخیرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ احادیث کے معاملے میں صرف حفظ و اعتماد ہو ایسا بالکل نہ تھا، بلکہ حفظ اور ضبط تحریر میں لانے کا عمل بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔ چنانچہ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ "ہم حضرت محمد ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتے تو بعض اوقات ہم ساٹھ افراد ہوتے، آپ ﷺ ہم سے گفتگو فرماتے، پھر کچھ وقت کے لیے تشریف لے جاتے تو ہم ایک دوسرے کو آپ ﷺ کے فرمودات سناتے اور یہ احادیث ہمیں اس طرح یاد ہو جاتیں جیسے ہمارے دلوں میں پھوٹی ہوں"۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ایک تہائی رات نماز پڑھتا ہوں، ایک تہائی رات سوتا ہوں اور ایک تہائی رات آپ ﷺ کی حدیثیں یاد کرتا ہوں"۔

غرض جو موجود ہوتا وہ اس کو احادیث سناتا جو حاضر نہ ہوتا، اور جو حاضر نہ ہوتا وہ حاضر ہونے والے سے دریافت کر لیتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کو احادیث سناتے، اقوال رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ و اشاعت کرتے اور حفظ کی تمام صورتوں کے ساتھ ساتھ احادیث لکھتے بھی تھے، یعنی حفظ اور تحریر دونوں ذریعوں سے احادیث رسول ﷺ کو محفوظ رکھتے۔ چنانچہ متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے احادیث تحریر کیں اور ان کو صحیفوں اور مجموعوں میں جمع کیا اور پھر ان سے ان کے تلامیذ نے مجموعے تحریر کئے۔ اسی طرح یہ حدیث کے ذخائر خواہ حفظاً و کتابۃً کسی شکل میں ہو منتقل ہوتے رہے۔ صحابہ سے تابعین اور تابعین سے ان کے تلامذہ نے صحیفوں اور مجموعوں میں احادیث لکھیں۔ احادیث رسول ﷺ کے تحفظ و تحریر کا یہ اہتمام ایک عالی شان علمی تحریک کی صورت میں مسلسل جاری رہا۔

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ سرکاری سطح پر تدوین کا کام یعنی تدوین حدیث کا باقاعدہ انتظام سب سے پہلے حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے ان کے والد محترم عبد العزیز بن مروان (جو مصر کے گورنر تھے) نے بھی تدوین حدیث کی سعی کی تھی۔ انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے مروی احادیث کا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ پھر کثیر بن مرہ حضرمی (جو کہ تابعی ثقہ ہیں، اصحاب السنن نے ان کی احادیث روایت کی ہیں) جنہوں نے بہت سے صحابہ کرام سے استفادہ کیا تھا۔ جن میں ستر تو بدری صحابہ تھے۔ انہوں نے صحابہ کرام سے جو احادیث سنی اس کو یکجا کر کے تحریر میں لائیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز جب خلیفہ ہوئے انہوں نے مدینہ منورہ میں اپنے عامل ابو بکر بن حزم کو تحریر کیا کہ رسول اکرم ﷺ کی احادیث تحریر کر کے میرے پاس روانہ کیجیے، مجھے ڈر ہے کہ اہل علم کے اٹھ جانے سے یہ علم مٹ نہ جائے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے احادیث کے جمع کرنے اور مدون کرنے کے جس عظیم کام کا آغاز کیا تھا وہ آپ کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ نے نہ صرف ابو بکر بن حزم کو بلکہ تمام علاقوں کے گورنروں کو فرامین جاری کیے کہ رسول ﷺ کی احادیث کو جمع کر کے میرے پاس بھیجیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابن شہاب زہری، جو امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں، کو بطور خاص جمع و تدوین حدیث پر مامور فرمایا تھا۔ ابن شہاب زہریؒ نے احادیث کا ذخیرہ جمع کر کے آپ کے پاس ارسال کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کی نقل تیار کرا کے اسلامی حکومت کے تمام مراکز میں بھیج دی۔ ان تمام احادیث کے جمع کرنے اور مدون کرنے کی یہ عظیم کوشش جو ثمر بار ہوئی اور روز بروز اس میں اضافہ ہوتا رہا اور اس عظیم جدوجہد نے بعد میں آنے والی نسلوں اور بعد میں آنے والی محدثین کے لیے تدوین حدیث کے کام کو سہل کر دیا، جس سے دوسری صدی ہجری کے آغاز ہی سے کتب حدیث کی تالیف و تصنیف کی ایک محرک اور مسلسل تحریک چل پڑی۔ علماء اور محدثین کی بڑی تعداد اس وقت سے احادیث و سنن کی جمع و تدوین میں مصروف ہو گئی۔ اس دور کی مشہور تصنیف مؤطا امام مالک ہے۔

صحابہ کرام اور تابعین کا کام تدوین حدیث کا اولین مرحلہ ہے۔ جب کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے فرمان کے تحت انجام پائے جانے والا کام تدوین حدیث کا دوسرا مرحلہ ہے اور اس کے بعد وہ مرحلہ ہے جس میں محدثین نے احادیث کو مسانید، سنن، جوامع اور صحاح کے متنوع صورتوں میں مدون کیا۔ یہ تمام مراحل ایک دوسرے سے ملحق اور پیوست ہیں، ان میں کہیں کوئی انقطاع یا عدم تسلسل نہیں ہے۔ جن اصحاب نے تدوین کا یہ کام سرانجام دیا وہ سب تابعی تھے، جنہوں نے نہ صرف صحابہ کرام سے احادیث سنی تھیں اور یاد کیں تھیں بلکہ حفظ و تحریر دونوں ذریعوں سے محفوظ کیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز خود بھی تابعی ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کے تدوین حدیث کے حکم سے متعدد مؤلفات اور تصانیف وجود میں آئیں۔ اس وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ تھی کہ تمام احادیث کو یکجا جمع کر لیا جائے۔ اس وقت نہ تو ترتیب و تنسیق اور تہذیب مد نظر تھی اور نہ ہی احادیث کو فقہی ابواب کے تحت مرتب کرنے کی تھی۔ بعض حضرات، جن کو تاریخ تدوین حدیث سے واقفیت نہیں ہے، ان کے ذہنوں میں کچھ اس طرح کا خاکہ ہے جیسے احادیث زبانی نقل ہوتی رہی اور جب امام بخاری آئے تو انہوں نے یہ نقل در نقل ہوتی ہوئی احادیث کو جمع کر لیں، لیکن یہ سادہ لوحی اور ناواقفیت کی انتہا ہے۔

12.2.2 حفاظت حدیث کے تین طریقے

حدیث رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے ویسے تو بے شمار طریقے ہیں جو کہ علم الحدیث اور اس کے متعلقہ فنون کی کتابوں میں ملتے ہیں، لیکن ان میں جو سب سے زیادہ اہم اور بنیادی طریقے ہیں وہ تین ہیں۔

1. زبانی یاد کرنا 2. تعامل (یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں احادیث نبویہ پر عمل کرنا) 3. کتابت

1. زبانی یاد کرنا:

جہاں تک عربوں کے حافظوں کی بات کی جائے تو ان کی یادداشت اور ان کی ذہن کا کوئی مقابلہ نہیں۔ بسا اوقات وہ سینکڑوں اشعار

کے قصیدے ایک ہی مرتبہ سن کر یاد کر لیتے۔ صحابہ و تابعین اور محدثین کرام کے قوت حافظہ کے حیرت انگیز واقعہ سیر، فن حدیث اور اسماء رجال کی کتابوں میں موجود ہیں۔

2. تعامل:

دوسرا طریقہ تعامل کا ہے یعنی یہ کہ حدیثوں کو صرف زبانی یاد کرنے پر ہی موقوف نہیں کیا بلکہ صحابہ کرام نے انہیں اپنی زندگی میں ڈھالنے اور اس پر عمل کرنے کی حد درجہ کوشش کی۔ مثلاً اگر کوئی استاد اپنے شاگرد کو کچھ بتانا چاہتا مثلاً وضو کے مسائل تو وہ خود وضو کر کے دکھاتا اور کہتا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو ایسے ہی کرتے سنا ہے یا دیکھا ہے۔ غرض یہ کہ اپنے تمام سماجی و سیاسی معاملات، اخلاقیات، عبادات، معیشت وغیرہ غرض یہ کہ زندگی کی ہر پہلو پر حدیث کو نافذ کرتے اور اسی کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتے۔

3. کتابت:

تیسرا طریقہ کتابت کا ہے۔ آنحضرت محمد ﷺ نے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ قلم بند کرایا تھا۔ لیکن یہ طریقہ پچھلے دو طریقوں کے معاملے میں کم استعمال ہوا ہے جس کے بنیادی اسباب یہ ہیں۔

آپ ﷺ نے جب قرآن کا نزول شروع ہوا تو قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ اس کی بھی کچھ وجوہات تھیں لیکن بعد میں اس ممانعت کو منسوخ بھی فرما دیا تھا۔ مگر بعض صحابہ کرام جنہیں ان کا علم نہ تھا وہ احادیث قلم بند کرنے سے اخیر دم تک احتیاط کرتے رہے۔ بہت سے صحابہ و تابعین کو یہ ڈر تھا کہ اگر حدیث کو قلم بند کیا گیا تو لوگ حفظ کرنے اور زبانی یاد کرنے میں دل نہ لگائیں گے اور کتابت پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ صحابہ کرام کو یہ بھی خوف لاحق تھا کہ اگر قلم بند کیا ہوا نسخہ حدیث رسول ؐ اگر نااہل اور جاہل لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تو یہ لوگ بھی عالم ہونے کا دعویٰ کر بیٹھیں گے اور روایت حدیث میں جس احتیاط کی ضرورت ہے اس کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے عوام کی گمراہی کا سبب بنیں گے۔ ایک بات اور عربوں کے یہاں عام تھی وہ یہ کہ وہ اپنے حافظے پر بھروسہ رکھتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی حافظے اور زبانی یادداشت کا جو ملکہ عطا فرمایا تھا اسے وہ کتابت کے مقابلے میں حفظ کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ کسی بات کو لکھ کر بیان کرنا ان کے یہاں عیب سمجھا جاتا تھا۔ اس کو وہ اپنے حافظے کی کمزوری سمجھتے تھے۔ ان اسباب کی بناء پر حفاظت حدیث کے کام میں تحریر و کتابت کا استعمال نسبتاً کم ہوا۔

12.2.3 مکہ کے اہل قلم

بلاذری نے فتوح البلدان میں سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جس وقت اسلام آیا قریش میں سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے۔ ان کے نام: علی بن ابی طالبؓ (کرم اللہ وجہہ)، عمر بن خطابؓ، عثمان بن عفانؓ، ابو عبیدہ بن جراحؓ، طلحہؓ، یزید بن ابی سفیان، ابو حذیفہ بن عتبہ، حاطب بن عمرو، ابو سلمہ بن عبد الاسد، ابان بن سعید اور ان کے بھائی خالد بن سعید، عبد اللہ بن سعد، حویطب بن عبد العزیٰ، ابوسفیان، معاویہ بن ابوسفیان، جہیم بن الصلت اور خلفائے قریش میں سے العلاء بن حضرمی۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عامر بن فہیرہ (حضرت ابو بکر صدیقؓ کے غلام) اور ورقہ بن نوفل جو (حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی) بھی لکھنا جانتے تھے۔

12.2.4 مدینہ کے اہل قلم

بلاذری نے واقدی سے نقل کیا ہے کہ مدینہ کے مشہور قبیلوں اوس اور خزرج میں عربی لکھنے والوں کی تعداد کم تھی۔ اسلام سے قبل اہل مدینہ کے بچے یہ فن سیکھتے تھے، جب اسلام آیا تو اوس اور خزرج میں متعدد لکھنے والے تھے۔ ان میں: سعد بن عبادہ، منذر بن عمرو، ابی بن کعب، زید بن ثابت، یہ عربی و عبرانی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔ رافع بن مالک، اسید بن حضیر، معن بن عدی، بشیر بن سعد، سعد بن ربیع، اوس بن خولی، عبد اللہ بن ابی المنافق اور سوید بن الصامت، اسید بن حضیر وغیرہ اہم ہیں۔

12.2.5 کتابت عہد رسالت میں

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا جو دین پیش کیا اس نے پہلے دن سے ہی لکھنے پڑھنے کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ یہی قوم آگے چل کر اقوام عالم کی معلم بن گئی۔ انہوں نے تحریر و کتابت کو بام عروج پر پہنچا دیا اور بالآخر عربی زبان میں مختلف دینی و دنیوی علوم کا وہ نادر اور بیش بہا ذخیرہ جمع کر دیا جسے دور حاضر کے تمام علوم و فنون کے "سنگ بنیاد" کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا۔

تحریر و کتابت کے سلسلے میں اسلام نے جو روش اختیار کی اس کا کچھ اندازہ آنے والی سطور سے ہو گا۔ آپ ﷺ کو سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی وہ پڑھنے اور لکھنے کی تعریف پر مشتمل تھی۔ اقرا باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ قرآن کی ایک مستقل سورۃ کا نام "القلم" ہے جس کی ابتدا ہی ان الفاظ سے ہوئی ہے۔ "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ" (قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں)

12.2.6 سفر ہجرت میں بھی لکھنے کا اہتمام

جب آپ ﷺ نے ہجرت مدینہ کا سفر فرمایا تو کفار مکہ نے آپ ﷺ کی گرفتاری پر سو اونٹ کا اعلان کر دیا۔ سراقہ بن مالک انعام کی لالچ میں تلاش کرتا ہوا آپ ﷺ تک پہونچ گیا لیکن معجزانہ طور پر آپ تک نہ پہنچ سکا اور بے بس ہو گیا تو عرض کیا کہ میں چلا جاتا ہوں آپ مجھ کو ایک تحریر لکھ دیجیے کہ اگر آپ غالب ہوئے تو مجھ کو امان ہے۔ تو آپ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کے غلام سے امان نامہ لکھوا دیا۔

12.2.7 تاریخ کا پہلا تحریری دستوری مملکت

ہجرت کے پانچ ماہ بعد جب مدینہ طیبہ میں آنحضرت ﷺ نے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تو ایک "دستور مملکت" نافذ فرمایا۔ اس تحریری دستور مملکت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات، حقوق و فرائض اور قصاص، دیت، فدیہ، جنگی قیدیوں کے معاملات اور مسلمانوں کی جدا قومیت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ دستور 52 دفعات پر مشتمل ہے۔

12.2.8 مردم شماری کی پہلی تحریر

آپ ﷺ نے ہجرت کی ابتدائی زمانے میں مسلمانوں کی مردم شماری کرائی، جسے باقاعدہ تحریر کرایا۔ صحیح بخاری میں حضرت

حذیفہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، "مجھے ان لوگوں کے نام لکھ کے دو جو اسلام کا اقرار کرتے ہیں"۔ (راوی کہتے ہیں) اس پر ہم نے آپ کو پندرہ سو مردوں کے نام لکھ کے دیے۔ بخاری میں اس کے فوراً بعد ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "پس ہم نے مسلمانوں کو پانچ سو کی تعداد میں پایا"۔ ہو سکتا ہے کہ مردم شماری آپ ﷺ نے دو مرتبہ کرائی ہو۔

12.2.9 دربار نبوی کے کاتب

ہجرت کے بعد آپ ﷺ نے جو اسلامی حکومت قائم فرمائی اس کی حدود بہت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ اتنے وسیع نظام حکومت کے لیے تحریر مراسلات اور فرامین کے بغیر بہت مشکل تھا۔ دربار نبوی میں کتابت کی خدمت مستقل طور سے یا گاہے انجام دینے والے تینتالیس صحابہ کرامؓ کے نام بیان کیے گئے ہیں جو قرآن کریم کے علاوہ سرکاری مراسلات اور فرمان بھی تحریر فرماتے تھے۔

12.2.10 خواتین کے لکھنے کی تعلیم

دین کی عام تعلیم کی طرح تحریر و کتابت میں بھی آپ ﷺ کی تعلیمی سیاست کا رخ صرف مردوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آپؐ نے عورتوں کو بھی یہ فن سکھانے کا انتظام فرمایا۔ چنانچہ ابو داؤد میں الشفاء بنت عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں ام المومنین حضرت حفصہؓ کو لکھنا سکھاؤں۔ یہ آپ ﷺ کی توجہ کا ہی نتیجہ تھا کہ نہ صرف قرون مابعد میں بلکہ خود عہد رسالت میں ایسی کئی خواتین کے نام ملتے ہیں جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ بلاذری نے ایسی پانچ خواتین کے نام سند سے ذکر کیے ہیں۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ، ام کلثوم بنت عقبہ، عائشہ بنت سعد، کریمہ بنت مقداد اور الشفاء بنت عبد اللہ وغیرہ کے نام شامل کیے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی خواتین تھیں جو لکھنا جانتی تھی۔

12.2.11 کتابت حدیث کی ممانعت اور اس کے جواز کی حدیث

اسلام کے اولین دور میں جب وحی کا نزول ہوا تو آپ ﷺ اس کو لکھوا لیا کرتے تھے۔ اس وقت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مرکز قرآن کریم ہی رہا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام قرآن کو یاد کرتے اور اس کو سمجھتے، اس پر غور و فکر کرتے، اس کے احکام پر عمل کرتے گویا یہ کہ قرآن کا علم اور اس پر عمل ساتھ ساتھ تھا اور یہ کام سارا کا سارا حضور ﷺ کی نگرانی اور رہنمائی میں ہوتا تھا۔ اس وقت مقصود ہی یہی تھا کہ قرآن کریم کو توجہ کا مرکز بنایا جائے۔ اس لیے آپ ﷺ نے اس نزول وحی کے اولین دور میں قرآن کے ساتھ کسی حدیث کو لکھنے سے منع فرمادیا تھا تاکہ اللہ کا کلام اور آپ ﷺ کی بیان کردہ آیات قرآن کی تشریحات قرآنی آیات سے ملتبس نہ ہو جائے چنانچہ امام خطابیؒ فرماتے ہیں، "رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی صحیفہ پر قرآن کے ساتھ حدیث لکھنے سے منع فرمایا تھا تاکہ قرآن کی آیات اور احادیث باہم اس طرح نہ مل جائیں کہ بعد میں کسی قاری کو شبہ پیدا ہو جائے۔ جہاں تک نفس تحریر کا تعلق تھا وہ ممنوع قرار نہیں دی گئی تھی۔"

12.2.12 کتابت حدیث کی اجازت

امام محمد بن قتیبہ کہتے ہیں کہ حدیث کے لکھنے کی ممانعت اولین دور میں ہوئی لیکن جب احادیث کی کثرت کی بنا پر ان کا حفظ دشوار ہوا تو احادیث کے لکھنے کی اجازت دے دی گئی۔

کتب حدیث کی جمع و تدوین کا کام رسول اکرم ﷺ کے زمانہ مبارک میں شروع ہو گیا تھا بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے احادیث کو لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ اسی طرح سے بعض واقعات میں یہ بھی آتا ہے کہ خلفائے راشدین میں سیدنا ابو بکرؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ نے پہلے احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور بعد میں یا تو ارادہ بدل دیا یا پھر تیار شدہ مجموعہ کو ضائع کر دیا۔ ان روایات کی بناء پر منکرین حدیث نے بہت کچھ حاشیہ آرائی کی اور یہ دعویٰ کیا ہے آپ ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا، اس لیے علم حدیث کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی رسول ﷺ نے اپنی سنت کو واجب التعمیل قرار دیا اور نہ ہی قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے سنت ضروری ہے۔ منکرین حدیث کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر سنت ضروری ہوتی تو آپ ﷺ نے قرآن کی طرح اس کی بھی کتابت کروائی ہوتی۔ یہ دلیل بظاہر ایسی مضبوط معلوم ہوتی ہے کہ اس کو پڑھنے والا اس سے متاثر ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ممانعت کیوں فرمائی؟ کن لوگوں کے لیے فرمائی؟ اور کس زمانے میں ممانعت فرمائی؟ اس پر کوئی منکرین حدیث اظہار خیال نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ بھی حدیثیں موجود ہیں جن میں آپ ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت دیدی تھی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کی ممانعت کتابت کے بارے میں حدیث صحیح مسلم موجود ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ سے کچھ نہ لکھو اگر کسی نے علاوہ قرآن کے کچھ لکھا ہے وہ مٹا دے بے شک مجھ سے جو سنو وہ زبانی بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جس نے عمداً مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے"۔

کتابت حدیث کی ممانعت کا ذکر کرنے کے بعد ضروری ہے کہ اس بات کا بھی ذکر کیا جائے یا اس حدیث کو بھی نقل کیا جائے جس میں کتابت حدیث کو لکھنے کی اجازت اور حکم آپ ﷺ نے دی ہو۔ اس سلسلے میں چند احادیث جس میں آپ ﷺ نے لکھنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ مندرجہ ذیل ہے:

- پہلی حدیث: حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا "علم کو ضبط (قید) کرو۔ میں نے کہا کہ ضبط کا کیا طریقہ ہے فرمایا لکھ لو" حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "لکھ کر علم کو ضبط کر لو"۔
- دوسری حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ایک شخص رسول اللہ کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا اور آپ ﷺ کی احادیث سنا کرتا تھا، اسے فرمودات نبوت بہت بھلے لگتے تھے مگر یاد نہ رکھ پاتا۔ اسی لیے اپنے کمزور حفظ کا رسول اللہ سے شکوہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنے سیدھے ہاتھ سے مدد لو اور اشارہ فرمایا کہ لکھ لیا کرو"۔
- تیسری حدیث: وہب بن منبہ اپنے بھائی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے تھے کہ "اصحاب رسول اللہ میں سے کوئی مجھ سے زیادہ احادیث بیان کرنے والا نہیں ہے سوائے عبد اللہ بن عمروؓ کے کیونکہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا"۔

- چوتھی حدیث: ابو نعیم نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ نے فرمایا کہ "میں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ میں آپ ﷺ سے احادیث سنتا ہوں کیا میں لکھ لیا کروں آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ اس اجازت کے بعد جو میں نے پہلی حدیث لکھی وہ آپ ﷺ کا مکتوب تھا۔ جو آپ ﷺ نے اہل مکہ کے لیے لکھا تھا۔
- پانچویں حدیث: حضرت رافع خدیج انصاریؓ سے روایت ہے کہ "ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ہم آپ سے حدیث سنتے ہیں کیا ہم اسے لکھ لیا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں لکھ لیا کرو۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت ساری احادیث موجود ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرت محمد ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت دے دی تھی اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ احادیث محمد ﷺ کے حکم سے ہی لکھی گئی۔ ان تمام توضیحات کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث لکھنے کی ممانعت کا تعلق نزول وحی کے اولین دور سے ہے، بعد میں نبی کریم ﷺ نے نہ صرف لکھنے کی اجازت دی بلکہ اس کے لکھنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ اس عمومی اجازت کے بعد صحابہ کرام نے اپنی تمام توانائیاں احادیث کو صدور اور سطور میں محفوظ کرنے میں لگا دیں۔

12.2.13 تدوین حدیث حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں

ایسے بہت سارے واقعات ہیں کہ آنحضرت محمد ﷺ نے نہ صرف صحابہ کرام کو لکھنے کی اجازت دی تھی بلکہ خود آپ ﷺ کی موجودگی میں اور آپ ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرام آپ ﷺ کے ارشادات کو لکھتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی روایت سنن دارمی میں منقول ہے، انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھا ہوتا تھا اور جو کچھ بھی آپ ﷺ ارشاد فرماتے میں لکھ لیا کرتا۔ قریش کے بعض ذمہ دار حضرات نے مجھ سے کہا تم رسول اللہ ﷺ کی ہر بات کو لکھ لیتے ہو۔ ممکن ہو بعض اوقات آپ ﷺ غصہ میں ہوں بعض اوقات آپ ﷺ مزاح کے موڈ میں ہوسکتے ہیں اور وہ مزاح کے طور کوئی بات ارشاد فرماتے ہوں۔ تم ہر بات کیوں لکھ لیتے ہو؟ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ لوگ ایسا کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں جو سنو وہ لکھو۔ محمد ﷺ فرماتے ہیں "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میری زبان سے حق کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔ اس میں آپ ﷺ نے قسم کھا کر کہا کہ میں جو بھی کہتا ہوں وہ حق ہے لہذا اس کو لکھو"۔

ایک روایت کے مطابق عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ نے ڈیڑھ ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔ ان کے اس مجموعے کو "صحیفہ صادقہ" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ مجموعہ نسل در نسل حضرت عمرو بن العاص کے بعد ان کے بیٹے اور پھر انہوں نے اس کے پڑھنے کے بعد اس کو روایت کرنے کی اجازت حاصل کی اور اس طرح بعد کے نسل سے منتقل ہوتے ہوئے یہ مجموعہ امام احمد بن حنبلؒ تک جا پہونچا۔ یہ ایک ذخیرہ تھا جو صحابہ کرام کے زمانے سے پہلے ایک صحابی نے حضور کی مجلس میں مرتب کیا۔ اس کو زبانی یاد کیا، زبانی یاد کرنے کے بعد اپنے بیٹے کو پہونچایا۔ بیٹے نے آگے لوگوں تک پہونچایا اور ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا، اس طرح سے یہ ذخیرہ امام احمد بن حنبل تک پہونچا۔ امام احمد بن حنبل نے اس ذخیرہ کے بیشتر حصہ اپنے مجموعے میں محفوظ کر لیا۔ پورا ذخیرہ اس لیے نہیں کیا کہ کتاب کو مرتب کرنے میں انہوں نے جو معیار اپنایا

اس وجہ سے کچھ چھوڑنا پڑا۔

12.3 عہد رسول اللہ کی سرکاری دستاویز

یہ دستاویز دو قسم کی تھیں۔ اول وہ جو حضور رﷺ نے ہجرت سے پہلے لکھوائی تھیں اور دوسری ہجرت کے بعد لکھی گئیں۔

- ہجرت سے پہلے کے دستاویز:

ایک تو وہ ہے جو ہجرت کے وقت سراقہ کو آپ ﷺ نے پروانہ امن لکھ کے دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ ہجرت سے پہلے آپ ﷺ نے تمیم دارمی تمیم اوس بن خارجہ بن سوادالداری کو اس مضمون کا ایک پروانہ لکھ دیا تھا کہ جب فلسطین کا شہر جرون (یہ شہر آج کل خلیل کے نام سے مشہور ہے) فتح ہو گا تو وہ تمہیں بطور جاگیر دے دیا جائے گا۔

- ہجرت کے بعد کے دستاویز:

آپ ﷺ جب مدینہ میں وارد ہوئے تو آپ ﷺ نے جو دستور نافذ کیا وہ تقریباً 52 دفعات پر مشتمل ہے۔ یہ تحریر چمڑے پر تھی، اس کو بین الاقوامی سطح پر بہت اہمیت حاصل ہے، یہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے۔ اسی طرح 2ھ میں آپ ﷺ نے بنو حمزہ سے ایک تحریری معاہدہ کیا تھا۔ ہجرت کے پانچویں سال دو قبائل، بنو فرازہ اور بنو غطفان، سے معاہدہ کیا ہے۔ ہجرت کے چھٹے سال صلح حدیبیہ کا تاریخی واقعہ کا ظہور ہوا۔ معاہدہ کرتے وقت جب اہل مکہ نے "رسول اللہ" کے الفاظ پر اعتراض کیا تو آپ ﷺ نے اس کو تلوار کی نوک سے کھرچ ڈالا۔ ساتویں ہجری میں آپ ﷺ بہت سارے ملوک کو تبلیغی خطوط لکھے، قیصر وکسری ومقوقس وغیرہ۔ اس طرح کے بہت سارے خطوط وتحریرات آپ ﷺ کی سیرت وحدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں جن کو آپ ﷺ نے لکھوائیں۔ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت محمد ﷺ نے خطبہ فرمایا، خطبہ کے بعد ایک صحابی، جو یمن کے تھے اوران کا نام ابو شاہ تھا، عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ نے خطبہ میں بہت اچھی باتیں ارشاد فرمائیں، یہ خطبہ کوئی لکھ کر دے دیتا تو بڑا ہی اچھا ہوتا۔ آپ ﷺ نے خطبہ لکھ کر دینے کو کہا۔ لوگوں نے ابو شاہ کو خطبہ کا مکمل متن لکھ کر دے دیا جو ان کے پاس لکھا ہوا موجود تھا۔

- صحیفہ علیؓ: حضرت علی بن ابی طالبؓ کے پاس بھی تحریری احادیث کا ایک مجموعہ تھا جو کہ "صحیفہ علی" اور "الجامعہ" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی عہد رسالت میں لکھا گیا تھا۔ چنانچہ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں "ماعندنا شئ الا کتاب الله وهذه الصحيفة عن النبى صلى الله عليه وسلم" ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے سوائے کتاب اللہ (قرآن) کے اور اس صحیفے کے جو نبی ﷺ سے منقول ہے۔ حضرت علیؓ اس صحیفے کو نہایت اہتمام وحفاظت سے رکھتے اور مجلس وخطبات میں اس کے مضامین بیان کرتے۔ اس صحیفے اور اس کے مضامین کا ذکر حضرت علیؓ کی زبانی صحیح بخاری میں چھ مقامات پر ملتا ہے، کہیں اجمالی تو کہیں تفصیلی تھا۔ اس صحیفہ میں دیت، خون بہا، فدیہ، قصاص، ذمیوں کے حقوق اور ولاء ومعاہدات کے احکام لکھے ہوئے تھے۔ نیز زکوۃ اور دیت کے مسائل کے لیے اونٹوں کی عمریں اور مدینہ کے حرم ہونے کی تفصیلات بھی۔

- الصحیفہ الصادقہ: پیچھے بیان ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ بھی آنحضرت ﷺ کی احادیث بروقت لکھ لیا کرتے تھے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو حضور ﷺ نے کہا کہ میں خدا کی قسم جو کچھ کہتا ہوں حق ہی کہتا ہوں اس لیے تم لکھ لیا کرو۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جو مجموعہ تیار کیا اس کا نام ''الصحیفہ الصادقہ'' رکھا تھا۔ ابوہریرہؓ کے بیان سے لگتا ہے کہ یہ مجموعہ کافی ضخیم تھا کیونکہ ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ نبی ﷺ کی حدیثیں مجھ سے زیادہ کسی صحابہ کے پاس نہیں تھیں سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص کے، کیونکہ میں لکھتا نہ تھا اور وہ لکھ لیا کرتے تھے۔
- حضرت انس کی تالیفات: حضرت انسؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آنے کے پہلے ہی سے لکھنا جانتے تھے۔ انہیں دس سال کی عمر میں ان کی والدہ ام سلیم نے حضور ﷺ کی خدمت پیش کرتے ہوئے کہا کہ '' ھذا ابنی وھوغلام کاتب'' یہ میرا بیٹا ہے اور وہ لکھنا جانتا ہے۔ اس پہلی حاضری کے بعد مسلسل دس سال تک آپ خدمت نبوی ﷺ میں اس طرح سے رہے جیسے گھر کے فرد ہوں۔ انہوں نے نہ صرف عہد رسالت میں احادیث کے کئی مجموعے لکھ کر تیار کیے بلکہ توثیق کے لیے ان مجموعوں کو نبی ﷺ کو پڑھ کر بھی سنائے۔ بعد میں یہ ان مجموعوں سے احادیث روایت کرتے تھے۔
- صحیفہ عمرو بن حزمؓ: اس سلسلے کی اہم کڑی یہ واقعہ بھی ہے کہ جب دس ہجری میں یمن کا علاقہ نجران فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو اس کا عامل مقرر کیا اور بوقت آپ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب سے ایک دستاویز لکھوا کر ان کے حوالے کی جس میں عام نصیحتوں کے علاوہ طہارت، نماز، زکوۃ، عشر، حج، عمرہ، جہاد، غنیمت اور جزیہ وغیرہ کے احکام اور نسلی قومیت کے نظریہ کی ممانعت، دیت (خون بہا) بالوں کی وضع، تعلیم قرآن اور طرز حکمرانی کے متعلق ہدایت درج تھیں۔ اس دستاویز کے بارے میں خود امام زہری کا بیان ہے کہ: ''جاء أبی بکر بن حزم بکتاب فی دفعة من أدمٍ عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ''میرے پاس آنحضرت ﷺ کی ایک کتاب عمرو بن حزم کے پوتے ابوبکر لے کر آئے جو چمڑے کے ٹکڑے پر لکھی ہوئی تھی۔

حضرت عمر بن حزمؓ نے نہ صرف اسے محفوظ رکھا بلکہ ایک دوسرا کام یہ کیا کہ اکیس دوسرے نوشتے بھی جو آنحضرت ﷺ نے بنی عادو بنی عریض کے یہودیوں، تمیم داری، قبائل جہینہ وجذام وطی وثقیف وغیرہ کے نام لکھوائے تھے حاصل کیے اور ان سب کی ایک تالیف کی جسے عہد رسالت کی سرکاری دستاویزوں کا اولین مجموعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح آنحضرت ﷺ کی خود املا کرائی ہوئی حدیثوں میں ایک طویل سلسلہ ان سیاسی وسرکاری دستاویزوں کا ہے جو آپ ﷺ نے 33 سال کے عرصہ میں وقتاً فوقتاً لکھوائے تھے اور یہ تمام تحریریں بھی حدیث کی ضمن میں آتی ہیں جو کہ حدیث کی کتابوں میں غزوات، وفود اور مکتوبات اور جہاد وغیرہ کے ابواب میں منقول ہوتی چلی آرہی ہیں۔ مندرجہ ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش ہے۔
- جنگی ہدایات: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات فوجی دستوں کو بوقت روانگی ان کے دستے کے امیروں کو جنگی نوعیت کی ہدایات بھی لکھوادیا کرتے تھے۔
- عدالتی فیصلے: اسی طرح بعض عدالتی کاروائیاں اور فیصلے بھی آنحضرت ﷺ نے قلمبند کرائے۔

- تحریری معاہدے: ہجرت مدینہ کے فوراً بعد آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے بہت سارے تحریری معاہدے کرائے۔ مثلاً صلح حدیبیہ کا معاہدہ، میثاق مدینہ غرض اس طرح کے بہت سارے معاہدے حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔
- جاگیروں کے ملکیت نامے: آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے بہت سے لوگوں کو جاگیریں عطا فرمائیں اور ان کے ملکیت نامے بھی تحریر کرائے۔ طبقات ابن سعد میں ان کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت زبیر بن العوامؓ کو بڑی جاگیر عطا کرتے وقت یہ دستاویز لکھوا کر دی:

بسم الله الرحمن الرحيم ـ هذا ما أعطى محمد رسول الله زبير أعطاه سوراق كلها علاه وأسفله۔ ما بين مورع القرية إلى موقت إلى حين الملحمة لا يحاق فيها أحد - وكتب عليؓ۔

ترجمہ: یہ دستاویز محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے زبیر کو دی ہے ان کو سوراق (کا علاقہ) پورا کا پورا بالائی حصہ سے زیریں حصہ تک مورع (گاؤں) سے موقت (گاؤں) تک دیا ہے ان کے مقابلے میں کوئی اپنا حق اس میں نہ جتلائے۔ کتبہ علی۔
- بیع نامے: ترمذی شریف کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قیمتی اشیا کی خرید و فروخت کے وقت اس کی دستاویز یعنی بیع نامے لکھوایا کرتے تھے۔ یہ حدیث ابواب البیوع کتاب الشروط جامع ترمذی میں موجود ہے۔
- وقف نامے: صحیح مسلم کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ عہد رسالت میں وقف نامے لکھنے کا رواج تھا جیسا کہ حدیث میں خلاصہ ہے کہ خیبر کی ایک عمدہ زمین حضرت عمر فاروقؓ کے حصے میں آئی تو حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اس کے متعلق مشورہ کیا اور یہ مشورہ دیا کہ اگر چاہیں تو اسے اللہ کے راستے میں وقف کر دیں، حضرت عمرؓ نے یہ زمین وقف فرمادی۔

12.4 تدوین حدیث صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کے دور میں

عہد صحابہ میں تحریر و کتابت کو جو ترقی حاصل ہوئی خصوصاً احادیث نبویہ کی تالیف و کتابت کے میدان میں جو عظیم کارنامے اس دور میں انجام دیے گیے وہ بھی در حقیقت حضورؐ کی ہی اس تعلیمی سیاست کا نتیجہ تھا جو پچھلے اوراق میں مذکور ہوئے ہیں۔ اس دور میں بہت سارے صحابہ کرامؓ نے احادیثیں لکھیں۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

- حضرت ابو بکر صدیقؓ: مشہور صحابی حضرت انس بن مالک کو جب حضرت ابو بکرؓ نے تحصیل زکوۃ کے لیے بحرین روانہ کیا تو ان کو ایک کتاب الصدقہ لکھ کر روانہ کیا۔ مسند احمد کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے انس بن مالک کو وہ تمام احکام جو زکوۃ کے بارے میں ہیں اور حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے ثابت ہے وہ لکھ کر دئے۔

- حضرت عمر فاروقؓ: ایک وقف نامے کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عمرؓ کا اپنے دور خلافت میں خود بھی حدیثیں لکھنا ثابت ہے ۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے آذربائیجان میں اسلامی سپہ سالار عتبہ بن فرقد کے نام ایک فرمان بھیجا۔ جس میں حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی حدیث تحریر فرمائی۔

- حضرت علی بن ابی طالبؓ: آپ کے ایک صحیفے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ جب آپ کے دور میں عبد اللہ بن سبا کی سازش کے

سبب شیعہ وخوارج کے فرقے پیدا ہوئے اور انہوں نے خود ساختہ حدیثیں مسلمانوں میں پھیلانا شروع کیا تو اس کے سرکوبی کے لیے آپ صحیح احادیث نبویہ کی نشرواشاعت کا خود اہتمام فرمایا۔

- حضرت ابوہریرہؓ: جب سے حضرت ابوہریرہؓ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے خود کو گویا حدیث یاد کرنے اور دوسروں تک پہونچانے ہی کے لیے وقف کر دی۔

- حضرت ابن عباسؓ: حضرت ابن عباسؓ کے پڑھنے اور لکھنے کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے اپنی وفات کے بعد اتنی تالیفات چھوڑیں کہ ایک اونٹ پر لادی جاسکتی تھیں۔

- حضرت سمرۃ بن جندبؓ: آپ نے احادیث کا ایک رسالہ اپنے بیٹوں کے لیے تالیف کیا تھا۔ حافظ ابن حجر نے اس نسخہ کو "نسخہ کبیرہ" کہا ہے اور فرمایا کہ اس میں کی اکثر حدیثیں سنن اربعہ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) میں آگئی ہیں۔

- حضرت سعد بن عبادہؓ: یہ زمانہ جاہلیت سے لکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے بھی حدیث کی ایک کتاب لکھی تھی جو ان کے بیٹے کے پاس تھی۔ اس کتاب کی ایک حدیث ترمذی میں بھی نقل کی گئی ہے: ربیعہ کہتے ہیں کہ مجھے سعد بن عبادہؓ کے بیٹے نے بتایا کہ ہم نے سعد (اپنے والد) کی کتاب میں یہ حدیث دیکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گواہ کے ساتھ حلف پر فیصلہ فرمایا۔

- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: آپ نے عہد رسالت میں احادیث میں صرف دعائے استخارہ اور تشہد لکھی تھی لیکن بعد میں انہوں نے ایک کتاب تالیف فرمائی تھی جس کو ان کے صاحبزادے عبدالرحمن نے معنؒ کو دکھائی اور قسم کھا کر بتایا کہ: "انه خط أبيه بيده" یہ میرے والد نے خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہے۔

ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرام ہیں جنہوں نے تدوین حدیث پر کام کیا اور بہت ساری تالیفات لکھیں۔ چند کے اسماء درج ذیل ہیں۔

حضرت انسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ جو کہ مشہور صحابہ اور کاتبین وحی میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک مجموعہ "الصحیفہ" اور "الجامعہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے علاوہ براء بن عازبؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی اَوفیٰؓ۔۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ جن صحابہ کرام کی وفات کوفہ میں ہوئی ان میں یہ سب سے آخری صحابہ ہیں۔ ان کے پاس ایک صحیفہ موجود تھا جس میں سے وہ روایت کرتے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا مرتب کیا ہوا ایک مجموعہ آج بھی دستیاب ہے اور استنبول کے کتب خانہ سعید علی پاشا میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ مشہور صحابہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کا لکھا ہوا ایک مجموعہ اسی کتب خانہ سعید علی پاشا میں موجود ہے۔ جس میں حج کے احکام لکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ چند مجموعے ہیں جو صحابہ کرام کے زمانے میں لکھے گیے۔

12.5 فرہنگ

دقیق نظری : مشکل پسندی، باریک بینی

استخارہ	:	خیر طلب کرنا، کام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کلام اللہ یا دوسرے مقرر طریقوں سے استصواب یا مشورہ، خواب وغیرہ میں اشارہ غیبی کا انتظار
توثیق	:	کسی قول بیان کی صحت کے بارے میں یقین دلانا یا اس کی تائید کرنا
دستاویز	:	کوئی اہم تحریر، یادداشت، اقرارنامہ جو آئندہ حوالے کے لئے مفید ہو

12.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- حدیث سے مراد وہ سبھی چیزیں جن کا تعلق محمد ﷺ سے ہے، خواہ وہ آنحضرت ﷺ کے اقوال ہوں، افعال ہو یا خاموش منظوری۔
- لفظ سنت بھی حدیث ہی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، اس کا مفہوم علمائے جمہور کے یہاں طریقہ متبعہ کا نام سنت ہے یعنی وہ طریقہ جس کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔
- نبوت کے آغاز میں حدیث کے لکھنے کی ممانعت تھی کیوں کہ اللہ کا کلام اور رسول ﷺ کے کلام کے مل جانے کا ڈر تھا۔ لیکن جب یہ امکان ختم ہو گیا تو محمد ﷺ نے کتابت حدیث کی اجازت دے دی یعنی حدیث کے لکھنے اور جمع کرنے کا کام محمد ﷺ کے حیات ہی میں شروع ہو چکا تھا۔

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

12.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. تدوین حدیث کا باقاعدہ انتظام کس کے عہد میں ہوا؟

(a). عمر بن خطاب (b). عمر بن عبد العزیز (c). عبد الملک بن مروان (d). سلیمان بن عبد الملک

2. حضرت عمر بن عبد العزیز نے کس کو تدوین حدیث پر مامور کیا تھا؟

(a). امام بخاری (b). ابن شہاب زہری (c). امام شافعی (d). حضرت ابوہریرہ

3. جس وقت قریش میں اسلام آیا کتنے لوگوں کو پڑھنا لکھنا آتا تھا؟

(a). تیرہ (b). پندرہ (c). سترہ (d). گیارہ

4. حضرت علیؓ کے مجموعے کا کیا نام ہے؟

(a). الجامعہ (b). صحیفہ الصادقہ (c). صحیفہ ابوہریرہ (d). صحیفہ وہب بن منبہ

5. دوران ہجرت آپ ﷺ نے کس کو امان نامہ لکھ کر دیا تھا؟

(a). تمیم داری (b). ابی بن کعب (c). معاذ بن جبل (d). سراقہ بن جعشم

12.7.1 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. حدیث کی حفاظت کے کون سے طریقے اپنائے گیے اس پر روشنی ڈالیے۔
2. عہد رسالت میں کتابت حدیث پر اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔
3. تدوین حدیث میں حضورؐ کی حیات مبارکہ میں تدوین حدیث کی نوعیت پر قلمبند کیجیے۔
4. عہد رسول کے سرکاری دستاویز پر مختصراً لکھیے۔
5. کتابت حدیث کی ممانعت اور اس کے جواز کی حدیث پر روشنی ڈالیے۔

12.7.2 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. تدوین حدیث کے مفہوم پر تفصیل سے گفتگو کیجیے۔
2. کتابت حدیث کی اجازت کے بارے میں اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔
3. صحابہ کرامؓ کے دور میں تدوین حدیث کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

12.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. کتابت حدیث عہد رسالت وعہد صحابہ میں : مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی (ادارۃ المعارف، کراچی)
2. کتابت و تدوین حدیث : ڈاکٹر مولانا ساجد الرحمن صدیقی (مکتبہ عمر فاروق، کراچی)
3. محاضرات حدیث : ڈاکٹر محمود احمد غازی (الفیصل ناشران و تاجران، لاہور)
4. تدوین قرآن حدیث اور تاریخ (فصل دوم) : سید اطہر بن جعفر کاظمی (ایجوکیشنل پریس، پاکستان)

معروضی سوالات کے جوابات

1. B	2. B	3. C	4. A	5. D

اکائی 13: تدوین حدیث

اکائی کے اجزا:

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 تدوین حدیث کا باضابطہ آغاز

13.3 پہلی صدی ہجری میں تدوین حدیث

13.3.1 پہلی صدی ہجری کے جامعین حدیث اور ان کی تصنیفی خدمات

13.4 دوسری صدی ہجری میں تدوین حدیث

13.5 تیسری صدی ہجری میں تدوین حدیث

13.6 چوتھی صدی ہجری میں حدیث

13.7 پانچویں صدی ہجری میں حدیث

13.8 حدیث کی بعض ابتدائی کتابیں

13.8.1 موطا امام مالک

13.8.2 مسند امام حمیدی

13.8.3 مصنف ابو بکر بن ابی شیبہ

13.8.4 مسند امام احمد بن حنبل

13.8.5 مسند اسحاق بن راہویہ

13.8.6 شرح معانی الآثار

13.9 فرہنگ

13.10 اکتسابی نتائج

13.11 نمونہ امتحانی سوالات

13.11.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

13.11.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

13.11.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

13.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

قرآن مجید کے بعد اسلامی شریعت کا دوسرا اہم ترین سرچشمہ حدیث ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر مستشرقین اور مخالف اسلام نے اس ذخیرہ کو مشتبہ کرنے کی پوری کوشش کی اور بے بنیاد الزامات تراشتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ماضی و مستقبل کے ہر زمانے میں واجب العمل ضرور ہے لیکن وہ قابل اعتماد طریقے سے محفوظ نہیں رہ سکی، آج قرآن کریم کے برعکس کوئی ایک کتاب بھی محفوظ نہیں ہے جس میں سنت کے بارے میں قابل اعتماد بات محفوظ ہو۔ حدیث کی بہت سی تصنیفات موجود ہیں جن میں احادیث کی بہت بڑی تعداد جمع کی گئیں ہیں اور بسا اوقات ان میں باہمی تضاد پایا جاتا ہے، نیز یہ تصنیفی کام بھی تیسری صدی ہجری میں عمل میں لایا گیا، لہذا ہم ان بیانات پر اعتماد نہیں کر سکتے جو تیسری صدی ہجری سے قبل احاطہ تحریر میں آئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دلیل بے شمار غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کی بنیاد پر قائم ہے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- تدوین حدیث اور اس کے مختلف ادوار میں خصوصا پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری میں کتابت حدیث پر کی گئی تحریری کاوشوں سے آگاہی حاصل ہو۔
- پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری کے اہم محدثین اور ان کے تصنیفات کا جائزہ لے سکیں۔

نیز چند حدیث کی کتابیں مثلا موطا امام مالک، مسند ابو بکر عبد اللہ حمیدی، مصنف ابو بکر بن ابی شیبہ، مسند امام احمد بن حنبل، مسند اسحاق بن راہویہ، شرح معانی الآثار وغیرہ پر تفصیلی تبصرہ کر سکیں۔

13.2 تدوین حدیث کا باضابطہ آغاز

عہد صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں بھی کتابت و تدوین حدیث کا سلسلہ جاری رہا۔ اور حفظ حدیث کا ویسا ہی انتظام کیا گیا جیسا کہ قرآن کریم کا تھا۔ بچوں کو جس طرح قرآن حفظ کرایا جاتا تھا اسی طرح سے حدیثوں کو زبانی یاد کرایا جاتا پھر اسے دہرایا بھی جاتا تا کہ حافظے میں موجود رہے۔ اسی کے ساتھ چونکہ اب لکھنے کا فن عام ہو رہا تھا اور وسائل بھی نسبتاً زیادہ میسر تھے اس لئے حدیثوں کو باقاعدہ فن کی شکل میں مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ ساتھ ہی جب اسلام عرب کے حدود سے نکل کر دوسرے علاقوں میں پھیلنے لگا تو اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اختلافات کو بچانے کے لئے رسول ﷺ کے اقوال و افعال کو باضابطہ تحریری طور پر مرتب و مدون کر دیا جانا چاہئے تا کہ ان کی حفاظت ہو جائے۔ اس کے علاوہ چونکہ رسول ﷺ کے اصحاب بھی رفتہ رفتہ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اس لئے یہ خیال بھی ہونے لگا تھا کہ اب کھرے کھوٹے کی گرفت کون کرے گا۔ صحابہ کرام کی موجودگی میں جھوٹی روایات کے عام ہونے کا خطرہ نہ تھا، لوگوں کو یہ اطمینان تھا کہ اگر کوئی بھی غلط حدیث بیان کی گئی تو یہ حضرات اسے ٹھیک کر دیں گے۔ لیکن جب صحابہ کے مبارک وجود سے دنیا خالی ہونے لگی تو حدیثوں کو مدون کی ضرورت کا احساس شدت سے پیدا ہوا۔

تدوین حدیث کے باضابطہ آغاز کا کریڈٹ انصاف پرور اور بیدار مغز اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز (متوفی 101) کو جاتا ہے۔ آپ کی نگاہ بصیرت نے محسوس کر لیا تھا کہ علوم شریعت اور حدیث و سنت کا جو سرمایا سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اسے تحریری شکل میں اگر جمع نہ کیا گیا یا صحیفوں اور نوشتوں کی صورت میں بکھرے ہوئے سرمایا کو یکجا نہ کیا گیا تو یہ امانت ضائع ہو جائے گی، اس لئے آپ نے تمام ممالک کے علماء اور ارباب حکومت کے نام سرکاری فرمان ارسال کیا کہ حدیث نبوی ﷺ کو تلاش کر کے جمع کیا جائے۔

13.3 پہلی صدی ہجری میں تدوین حدیث

پہلی صدی ہجری میں تدوین حدیث کا کام خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے سرکاری طور پر سنبھالا۔ اور جتنی بھی حدیث کی کتابیں وجود میں آئیں اس کے پس پشت آپ کی تحریک کار فرما تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ بہت کم عرصہ میں بڑا وقیع علمی کارنامہ وجود میں آیا جسے اس وقت کے اساطین علم نے انجام دیا۔ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی یہ تدوین حدیث کی اول کوشش تھی جو عمر بن عبد العزیز کے حصہ میں آئی۔

خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے تمام گورنروں اور بطور خاص والئی مدینہ ابو بکر بن حزم (متوفی 120ھ) کو سرکاری حکم بھیجا کہ وہ ان احادیث کو لکھ کر ان کی طرف روانہ کریں جو عمرہ بنت عبد الرحمان انصاریہ (متوفی 98ھ) اور قاسم بن محمد بن ابو بکر (متوفی 120ھ) کے پاس موجود ہیں، کیونکہ مجھے اس علم کے مٹ جانے اور اہل علم کے گذر جانے کا خوف دامن گیر ہے۔ قاضی ابو بکر نے خلیفہ کے حکم کے تعمیل میں احادیث جمع کیں اور متعدد کتابیں لکھیں، مگر قبل اس کے کہ وہ کتابیں ان کی خدمت میں پہنچتیں، خلیفہ وفات پاگئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کی دعوت کے جواب میں ریاست اسلامی کے تمام شہروں میں علما نے احادیث کی تدوین کا کام شروع کیا۔ آپ کی حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے حجاز کے نامور عالم امام محمد بن شہاب زہری (متوفی 122ھ) نے احادیث مرتب کرکے آپ کی

خدمت میں بھیجیں اور آپ نے ان کی نقلیں فوراً ریاست اسلامی کے مختلف علاقوں میں روانہ فرمادیں۔ اس طرح تدوین حدیث کے کام کی بنیاد رکھنے والے اصلا امام زہری ہیں۔ کیونکہ امام زہری اپنی اس کوشش کے سلسلے میں خود کہا کرتے تھے:

" اس علم کو میری طرح مجھ سے پہلے کسی نے مدون نہیں کیا"۔

اسی دور میں چند اور اہم کام ہوئے، چنانچہ حضرت عائشہؓ کے بھانجے اور ان کے علوم کے امین عروہ بن زبیر نے سیرت پر دو کتابیں لکھیں، اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے شاگرد خاص سعید بن جبیر نے اپنے استاذ کی احادیث کو تحریری شکل میں جمع کر دیا۔ پہلی صدی ہجری میں ایک اور قابل ذکر کام امام شعبی نے انجام دیا، جو کہ امام التابعین کہلائے، آپ نے حدیث کی ایک اہم کتاب "الابواب" کے نام سے تالیف کی جس میں احادیث کو موضوعات اور ابواب کی ترتیب میں جمع کیا۔ یہ کتاب موضوعاتی عنوانات اور سرخیوں کے تحت لکھی جانے والی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ایک اور کتاب جو قرآن مجید کی تفسیر پر مبنی احادیث پر مشتمل تھی جسے حسن بصری نے تصنیف کی۔ یہ بھی عمومی ترتیب کے مطابق ایک باقاعدہ کتاب تھی جو ایک مخصوص موضوع پر پہلی صدی ہجری میں لکھی گئی۔

بہر حال آج حدیث کا جو علم دنیا میں موجود ہے وہ تقریباً دس ہزار صحابہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ تابعین نے نہ صرف ان کی احادیث ہی لیں بلکہ ان سب صحابیوں کے حالات بھی بیان کر دیے ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ کس نے حضور ﷺ کی کتنی صحبت پائی ہے یا کب اور کہاں آپ کو دیکھا ہے اور کن کن مواقع پر آپ کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ احادیث ابتدائی دور کے مسلمانوں کے ذہن میں دفن پڑی رہیں اور دوڈھائی صدی بعد امام بخاری اور ان کے ہم عصروں نے انہیں کھود کر نکالا۔ لیکن تاریخ ہمارے سامنے جو نقشہ پیش کرتی ہے، وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

13.3.1 پہلی صدی ہجری کے جامعین حدیث اور ان کی تصنیفی خدمات

1. کتب سعید بن المسیب (متوفی 93ھ)
2. کتب حسن بصری (متوفی 110ھ)
3. عروہ بن زبیر کی سیرت کی دو کتابیں (متوفی 94ھ)
4. مکحول شامی کی کتاب السنن (متوفی 112ھ)
5. صحیفہ ہمام بن منبہ (متوفی 131ھ)
6. کتب عمر بن عبد العزیز (متوفی 101ھ)
7. سعید بن جبیر، عبد اللہ بن عباس کی احادیث کا مجموعہ مرتب کیا (متوفی 95ھ)
8. کتب امام محمد الباقر (متوفی 56ھ)
9. امام شعبی کی الابواب (متوفی 104ھ)

13.4 دوسری صدی ہجری میں تدوین حدیث

دوسری صدی ہجری میں اصاغر تابعین اور تبع تابعین کا وہ گروہ ہمارے سامنے آتا ہے جو ہزارہا کی تعداد میں دنیائے اسلام میں پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے بہت بڑے پیمانے پر تابعین سے احادیث لیں اور دور دراز ملکوں کے سفر کر کے ایک ایک علاقے کے صحابہ اور ان کے شاگردوں کا علم جمع کیا۔ اس دور کی تصنیف کردہ احادیث کی کتب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے بڑی تعداد موضوعات کے

لحاظ (یعنی ایک باب میں ایک ہی موضوع سے متعلق احادیث) سے ترتیب دی گئی ہے۔ جب کہ پہلی صدی ہجری میں ایسا نہ تھا۔ لیکن ایسی کتب بھی ملتی ہیں جو دوسری صدی ہجری میں اس ترتیب کے بغیر ہیں۔ اس دور میں جو کتب احادیث مرتب ہوئیں وہ دو قسموں پر مشتمل تھیں۔ ایک قسم وہ ہے جس میں صحیح اسناد کا التزام نہیں کیا گیا، بلکہ جو حدیث پہنچی وہ درج کر دی گئی۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں صحت کا التزام تو کیا گیا، مگر مرفوع حدیث کے اندراج کا التزام نہیں رہا، بلکہ منقطع، مرسل، آثارِ صحابہ حتیٰ کہ مقطوع کو بھی مرفوع کے ساتھ اکٹھا کر دیا گیا۔ اس دور میں چونکہ علماء وفقہاء کے نزدیک مرسل حدیث مستقل حجت تھی۔ اس لیے مرسل کو مرفوع سے علیحدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ بعد میں سب سے پہلے جب امام شافعی نے مرسل کی حجیت سے انکار کیا اور پھر ان کے دیکھا دیکھی عام محدثین میں بھی یہ خیال زور پکڑا تو اب اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ ایسی تصانیف عمل میں لائی جائیں جن میں یہ نقص نہ ہو، بلکہ حدیث مرفوع کو مرسل اور آثار سے بالکل ممیز کر دیا جائے۔ اس زمانہ کے علماء نے اس ضرورت کے پیش نظر جدید طرز اور انتہائی نئے انداز پر تصانیف مرتب کرنا شروع کر دی، اور تیسری صدی کی ابتداء سے تدوینِ حدیث کا یہ دور شروع ہوا۔

دوسری صدی ہجری میں مدون ہونے والی کتب کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند ممتاز اور نمایاں کتب اور ان کے جامعین کا نام درج ذیل ہیں۔

1. سیرت ابن اسحاق (متوفی 151ھ)
2. کتاب ربیع بن صبیح بصری (متوفی 160ھ)
3. کتاب سعید بن ابی عروبہ بصری (156ھ)
4. کتاب حماد بن سلمہ (متوفی 167ھ)
5. کتاب سفیان ثوری کوفی (متوفی 161ھ)
6. کتاب عبد اللہ بن مبارک (متوفی 181ھ)
7. مصنف عبد الرزاق بن ہمام (متوفی 211ھ)
8. مصنف سفیان بن عیینہ (متوفی 198ھ)
8. مصنف شعبہ بن حجاج (متوفی 160ھ)
10. موطا امام مالک (متوفی 179ھ)

13.5 تیسری صدی ہجری میں تدوین حدیث

تابعین و تبع تابعین کے مبارک دور میں تدوین حدیث کے عظیم الشان کام نے ایک باقاعدگی اختیار کر لی تھی۔ اب اس کی تدوین کو ایک فن کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اس زمانہ میں 'جامع'، 'سنن' اور 'مسند' کی اصطلاحات رائج ہو چکی تھیں۔ اس دور میں احادیث رسول ﷺ کو آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے الگ مدون کرنے کا کام شروع ہوا، اور اسی زمانے میں علم حدیث کی وہ عظیم الشان شخصیات اور احادیث مبارکہ کی وہ امہات کتب (بنیادی کتابیں) منظر عام پر آئیں جنہیں قدرت نے قبول عام اور بقائے دوام دونوں عطا کیا۔ اسی دور میں امام بخاری (متوفی 256ھ) نے تدوین حدیث کے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی جس کو بعد کے محدثین نے بھی اپنایا اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنی دانست میں صرف انہی حدیثوں کا انتخاب کیا جو اسنادی حیثیت سے بالکل بے غبار تھے اور صحیح کے ساتھ غیر صحیح کو مخلوط نہ کیا، یعنی حدیث کو جانچنے پرکھنے کے اصول و مبادی طے کیا۔ علم الرجال پر مبنی ایک مستقل علم کی بنیاد اسی دور میں رکھی گئی۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر

تیسری صدی ہجری کو علم حدیث کے ضمن میں سنہری دَور کہا جا سکتا ہے۔ تیسری صدی ہجری کے چند ممتاز اور نمایاں کتب حدیث اور ان کے مولفین کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

1. الجامع الصحیح محمد بن اسمعیل بخاری (متوفی 251ھ)
2. الصحیح مسلم بن الحجاج القشیری (متوفی 261ھ)
3. السنن ابو داود (متوفی 275ھ)
4. السنن نسائی (متوفی 303ھ)
5. السنن ابن ماجہ (متوفی 273ھ)
6. الجامع ترمذی (متوفی 270ھ)
7. مصنف ابو بکر بن ابی شیبہ (متوفی 235ھ)
8. مسند امام احمد حنبل (متوفی 241ھ)
9. المسند اسحاق بن راہویہ (متوفی 238ھ)
10 المسند علی بن عبد اللہ بن جعفر المدینی (متوفی 234ھ)

13.6 چوتھی صدی ہجری میں حدیث

چوتھی صدی ہجری میں حدیث کے سرمایے میں تو کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا، لیکن اس صدی کے علمائے حدیث نے حدیث کے پہلے کے مجموعوں کو زیادہ مرتب و منظم کیا۔ کچھ صحیح حدیثیں جو تیسری صدی ہجری کی کتب حدیث میں جمع ہونے سے رہ گئی تھیں ان کو بھی اس دور میں جمع کرنے کا کام کیا گیا۔ اس زمانے کے مشہور اماموں میں سلیمان احمد طبرانی متوفی (311ھ)، ابن خزیمہ (متوفی 311ھ)، امام طحاوی (متوفی 321ھ)، ابو حاتم محمد بن حبان (متوفی 245ھ) اور امام دار قطنی (متوفی 375ھ) وغیرہ ہیں۔

13.7 پانچویں صدی ہجری میں حدیث

پانچویں صدی ہجری کے نصف تک تو اسی انداز سے کام ہوتا رہا اور احادیث کا وافر ذخیرہ پوری احتیاط کے ساتھ تحریری شکل میں محفوظ کر دیا گیا۔ اس کے بعد جو کام اس موضوع پر ہوئے وہ مختلف کتابوں کے مجموعوں کی شکل میں زیادہ ہوئے۔ بعض نے صحاح ستہ کے مجموعے لکھے اور کسی نے مسانید و سنن کو جمع کرنے کی سعی بلیغ کی۔ مثلاً ابن کثیر کی "جامع المسانید والسنن"، جو صحاح ستہ، مسند احمد، مسند بزار، مسند ابویعلی اور معجم کبیر طبرانی کے مجموعوں کی حیثیت سے دس کتابوں کی احادیث پر مشتمل ہے۔

بہر حال پہلی صدی ہجری کے آخر میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم سے باقاعدہ سرکاری طور پر تدوین حدیث کا دروازہ کھلا۔ اب تک جو لوگ ذاتی طور پر اس علمی کام کو انجام دیتے تھے اب خلیفۂ وقت کے حکم سے اس علمی کام میں لگ گئے اور دوسری صدی ہجری میں اس سلسلے کو اتنی ترقی ہوئی کہ احادیث رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ آثار صحابہ اور تابعین کبار کے فتاوی کو بھی مدون کر دیا گیا۔ تیسری صدی ہجری علم حدیث کی سنہری صدی تھی۔ اس میں الموطا امام مالک، صحیحین اور کتب اربعہ جیسی باکمال کتب تصنیف ہوئیں۔ البتہ چوتھی صدی ہجری میں حدیث کے سرمایے میں تو کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا، لیکن جو صحیح حدیثیں اب تک جمع نہیں ہوئی تھیں ان کو جمع کیا گیا۔ علمائے حدیث نے مسلمانوں میں احادیث کی جمع و تدوین کو تین ادوار میں منقسم کیا ہے۔

جب ہر شخص نے اپنی ذاتی معلومات کو جمع کیا۔ یہ دور لگ بھگ 100ھ تک رہا۔ یہ دور صحابہ اور اکابر تابعین کا تھا۔

اس دور میں مختلف شہروں کی معلومات کو یکجا کیا گیا۔ یہ دور 150ھ تک رہا۔ یہ دور تبع تابعین کا تھا۔

اس دور میں تمام دنیائے اسلام کی حدیثوں کی تدوین ہوئی اور موجودہ کتب احادیث مرتب کی گئیں۔ یہ دور تیسری صدی ہجری تک رہا۔ یہ دور اصحاب صحاح کا تھا۔

پہلے دور کا تمام تر سرمایا دوسرے دور کی کتابوں میں جمع ہوا اور دوسرے دور کا پورا مواد تیسرے دور کی کتابوں میں پھیلا دیا گیا اور یہی تمام تر سرمایا آج ہزاروں اوراق میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا کی تاریخ کا سب سے قیمتی اور معتبر و مستند ذخیرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

13.8 حدیث کی بعض ابتدائی کتابیں

13.8.1 موطا امام مالک

موطا حدیث کی ابتدائی کتابوں میں سے ایک ہے جو کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں مدینہ منورہ میں لکھی گئی۔ امام مالک نے اسے مکمل کر کے جب مدینہ کے شیوخ حدیث کے سامنے پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

صاحب قاموس نے 'موطا' کے معنی تیار کرنے، روندنے اور نرم کرنے کے بتائے ہیں۔ مقدمہ اوجز میں امام مالک کا یہ بیان منقول ہے کہ "میں نے یہ کتاب لکھ کر ستر فقہائے مدینہ کے سامنے پیش کی۔ سب نے مجھ سے اتفاق کیا اس لئے میں نے اس کتاب کا نام موطا رکھ دیا" اس طرح موطا کے معنی مجازاً متفق علیہ ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ راہ جس پر سب چلے اور اس راہ کو روند ڈالا گیا۔

موطا امام مالک میں کل ایک ہزار سات سو بیس احادیث درج تھیں۔ ان میں سے چھ سو احادیث مسند ہیں جو مختلف صحابہ سے مروی ہیں۔ چھ سو تیرہ موقوف روایات ہیں۔ دو سو پچاسی مقطوع اور دو سو بائیس مرسل روایات ہیں۔ امام مالک فقیہ تھے۔ اس لئے آپ نے موطا میں بیشتر روایات فقہی مسائل کے متعلق ہی جمع کی تھیں۔ علماء حدیث نے موطا کو بخاری و مسلم کے ساتھ پہلے درجے کی کتب حدیث میں شامل کیا ہے۔ بقول امام شافعی "روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد موطا امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے"۔ موطا کا ایک امتیاز یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں کلام اللہ کے بعد جو کتاب آئی وہ کلام الرسول ﷺ کا یہی صحیح ترین مجموعہ تھا۔ نقش اول ہونے کے باوجود یہ ایک مکمل کتاب ہے۔ بڑے بڑے علماء اور فقہاء نے موطا امام مالک سے روایت کیا ہے۔ موطا امام مالک کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں بیان کی گئی حدیثیں صرف تین چار واسطوں سے ہی ﷺ تک پہنچ جاتی ہیں۔ موطا کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ عہد عباسی کے پانچ خلفاء مہدی، ہادی، ہارون، مامون، اور امین نے اس کے مطالعے کے لئے بغداد سے حجاز تک کا سفر کیا۔

امام مالک بن انس 93ھ مدینہ میں پیدا ہوئے اور 179ھ میں انتقال ہوا۔ زندگی بھر مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ یہیں پر اکابر تابعین اور فقہائے مدینہ کے سائے میں ان کی تمام تعلیم و تربیت ہوئی۔ اور حدیث و فقہ کے علوم میں انہوں نے کمال حاصل کیا۔ انہوں نے بیس ایسی حدیثیں بیان کی ہیں جو صرف تین واسطوں سے اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچتی ہیں۔ ان کے سلسلہ روایت عن مالک عن نافع عن

ابن عمر کو دنیا سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) کے نام سے یاد کرتی ہے۔ حدیث کے علاوہ امام مالک مدینہ کے فقیہ تھے اس لئے امام دار الہجرہ کہلائے۔ آپ کے شاگردوں میں امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے دو شاگرد امام محمد اور امام یوسف کے نام بھی شامل ہیں اور انہوں نے اپنی کتب میں امام مالک کی چند احادیث بھی نقل کی ہیں۔

13.8.2 مسند امام حمیدی

یہ امام حمیدی کی شہرہ آفاق حدیث کی کتاب ہے جس نے انہیں علم حدیث کی تاریخ میں ایک زندہ جاوید مقام عطا کیا ہے۔ مختلف ممالک میں مسانید کے مجموعے مرتب کرنے میں جن علماء کو شرف اولیت حاصل ہوا ان میں حمیدی کا نام بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے ان ہی نے مسند تصنیف کی، یہ گیارہ اجزاء پر مشتمل ہے اور اس میں 1293 حدیثیں ہیں، اکثر روایتیں مرفوعا مروی ہیں اور صحابہ و تابعین کے کچھ آثار بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کتاب کو "ام الکتب الحدیث" بھی کہا جاتا ہے۔ اس مسند سے امام بخاری نے 96 احادیث لی ہیں۔ بخاری کی پہلی مبارک حدیث کے رواۃ میں بھی حمیدی شامل ہیں اور یہ حدیث بھی آپ نے امام حمیدی سے ہی لی ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے مسند حمیدی کا آغاز جابر بن عبداللہ کی حدیث کو قرار دیا ہے، لیکن یہ واقعہ کے خلاف ہے، بقول مولانا اعظمی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے کسی غیر مستند نسخہ پر اعتماد کرتے ہوئے ایسا لکھ دیا ہے ورنہ جیسا کہ مسند سے ظاہر ہے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی حدیث سے اس کا آغاز ہوا ہے اور یہی تمام ارباب مسانید کا طریقہ کار رہا ہے کہ وہ پہلے خلفائے راشدین کی علی الترتیب روایات نقل کرتے ہیں، اس کے بعد عشرہ مبشرہ صحابہ کی حدیثیں، اس کے بعد دوسروں کی، امام حمیدی نے اسی سنت کی اتباع کی ہے۔

عبداللہ نام، ابو بکر کنیت، امام حمیدی نسلاً خالص عرب تھے، مکہ معظمہ کی خاک پاک سے اُٹھے اور آخر میں اسی کا پیوند بنے۔ امام حمیدی ان نامور اہل علم اتباع تابعین میں تھے جنہوں نے نہ صرف علم و عمل کے چراغ روشن کیے بلکہ قرطاس و قلم کے ذریعہ زر و جواہر کے انبار لگا دیئے۔ امام حمیدی کی جلالت مرتبت اور تبحرِ علمی، کا مزید ثبوت ان کے شیوخ و اساتذہ کی طویل فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے مل جاتا ہے، جس میں امام شافعی، مسلم بن خالد، فضیل بن عیاض جیسے فخر زمانہ ائمہ کے نام ملتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت سفیان بن عیینہ سے بیس سال تک مستفید ہوتے رہے۔ انہیں حدیث کی طرح فقہ میں بھی امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ امام شافعی سے اس فن میں خصوصی مہارت پیدا کی۔ جب امام شافعی مصر گئے تو حمیدی بھی ان کے ساتھ رہے، اس طرح وہ امام صاحب کے بکثرت اجتہاد کے امین بن گئے۔ امام شافعی کی وفات کے بعد وہ مصر سے مکہ واپس آ گئے اور وہاں مفتی و فقیہ کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی۔ امام شافعی فرماتے کہ میں نے الحمیدی سے بڑھ کر حافظ محدث نہیں دیکھا انہوں نے سفیان بن عیینہ سے 10000 (دس ہزار) حدیثیں نقل کیں۔ امام احمد حنبل فرماتے ہیں الحمیدی ہم میں امام ہیں۔

13.8.3 مصنف ابو بکر بن ابی شیبہ

مصنف ابو بکر بن ابی شیبہ کی سب سے مشہور کتاب ہے۔ اس کی بدولت ان کو لازوال شہرت نصیب ہوئی۔ یہ حدیث کی اہم اور بلند پایہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور، اہم، جامع اور مبسوط کتاب ہے۔

مصنف عبد الرزاق اس کے مقابلے میں قدیم ضرور ہے لیکن یہ اس سے زیادہ ضخیم اور جامع ہے۔ یہ کتاب کئی اجزاء پر مشتمل ہے۔ محدثین کے طریقے کے مطابق اس کو سندوں کے ساتھ فقہی کتابوں کی طرح ابواب و کتب پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کی ابتداء کتاب الطہارت سے ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس کو حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ ابن حزم نے اس کو موطا سے بھی بالا تر بتایا ہے۔ اس کتاب کے بعض خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

1. اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اکثر روایت کردہ حدیثیں صحاح ستہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔
2. اس کی دوسری بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وہی روایتیں لی گئی ہیں جن سے کوئی فقہی مسئلہ نکلتا ہو۔ احکام و مسائل کا یہ جامع اور مستند مجموعہ ہے۔ اس میں اہل حجاز اور اہل عراق دونوں کی روایات بغیر کسی ترجیح کے نقل کی گئی ہیں۔
3. تیسری بڑی اہم خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس میں مرفوع اور متصل روایات کے ساتھ ساتھ مرسل، منقطع اور موقوف حدیثیں بھی ہیں اور صحابہ کے آثار، تابعین کے فتاوے اور فقہاء وغیرہ کے آراء و اقوال بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے ہر حدیث کے متعلق سلف کے تعامل اور ائمہ کے اتفاق و اختلاف کا پتہ چل جاتا ہے۔

اس کتاب کے قلمی نسخے جرمنی، مدینہ منورہ کے مکتبہ محمودیہ اور خدلویہ مصر وغیرہ میں موجود ہے۔ ہندوستان میں مکتبہ سندیہ، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ مولانا عبد الحئی لکھنوی اور بعض دیگر کتب خانوں میں پایا جاتا ہے۔

آپ کا نام عبد اللہ بن محمد بن قاضی ابی شیبہ تھا اور کنیت ابو بکر تھی۔ آپ کی پیدائش واسط میں (عراق) 159ھ میں ہوئی۔ آپ کے اساتذہ میں عبد اللہ بن مبارک، شریک بن عبد اللہ القاضی، سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح اور یحیی بن سعید القطان جیسے محدثین تھے۔ ان سے امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام نسائی اور ابن ماجہ اور دوسرے کئی محدثین نے حدیث روایت کی ہے۔ بعد کے زمانے کے علماء نے علم حدیث میں ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے اور ان کے حفظ و ضبط کو بھی سراہا ہے۔ اسی طرح ان کی ثقاہت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ ان کا انتقال 235ھ میں تقریباً 74 سال کی عمر میں ہوا۔ مصنف کے علاوہ وہ کئی دوسری کتابوں کے بھی مصنف تھے۔ لیکن وہ سب اب معدوم اور نایاب ہیں۔

13.8.4 مسند امام احمد بن حنبل

"مسند" امام احمد بن حنبل کی کتابوں میں سب سے عمدہ کتاب ہے جس کو آپ نے 220ھ سے 237ھ کے درمیان لکھی۔ المسند اس حدیث کی کتاب کو کہتے ہیں جو فقہی ترتیب پر نہ ہو بلکہ صحابہ کے نام کی ترتیب پر ہو۔ خواہ ان کی مرویات میں صحیح، حسن یا ضعیف احادیث ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کو حروف تہجی کی ترتیب پر جمع کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات صحابہ کے شرف کو بھی اس ترتیب میں مد نظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً مسانید میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مرویات کو ان کے پہلے خلیفہ راشد ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے لکھا جاتا ہے۔

مسند احمد بن حنبل کا شمار حدیث کی مشہور ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کی تالیف میں امام صاحب نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اسے ساڑھے سات لاکھ سے زائد حدیثوں سے منتخب کیا ہے۔ اس میں تقریباً چالیس ہزار احادیث موجود ہیں۔ خود فرماتے

ہیں کہ میں نے اس کتاب کو لوگوں کے لئے امام و حجت بنایا ہے تاکہ اختلاف کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں۔ اگر اس میں کوئی حدیث مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کسی ایسی حدیث کو تسلیم نہ کریں جو اس میں موجود نہ ہو۔ علماء حدیث مسانید کو سنن سے نچلے طبقے میں رکھتے ہیں لیکن مسند احمد کی حیثیت ان سے مختلف ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے مسند احمد کو دوسرے درجے کی کتابوں سنن ابو داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی سے قریب تر رکھا ہے۔ محدثین ہر زمانے میں مسند احمد سے اخذ واستفادہ کرتے رہے ہیں اور اس کا شمار حدیث کی امہات کتابوں میں ہوتا ہے۔

یہ مسند کئی کتب احادیث کا مآخذ ہے۔ اس میں سب سے پہلے عشرہ مبشرہ سے روایات اکٹھی کی گئیں ہیں پھر چار اصحابِ کبار سے روایات، اہل البیت پھر اجلہ صحابہ کرام سے روایات، پھر اہل مکہ سے روایات ہیں، پھر اہل مدینہ سے روایات، پھر اہل شام سے روایات، پھر اہل کوفہ سے روایات ہیں، پھر اہل بصرہ سے روایات، پھر انصار سے روایات اور آخر میں صحابیات سے روایات درج کی گئی ہیں۔ ان صحابیات میں سب سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مرویات کو درج کیا گیا۔

یہ کتاب امام احمد بن حنبل کی عمر بھر کی محنت کا ثمرہ ہے۔ انہوں نے اسے مسودہ کی شکل میں اپنے پیچھے چھوڑی جسے ان کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ نے مسند کی جمع وترتیب کا کام کیا اور مسند کی روایات کے مشابہ دوسری روایات بھی شامل کر دیں۔ بعد کی ادوار میں مسند احمد کی بہت ساری شرحیں اور حواشی بھی لکھے گئے جو اس کی عام مقبولیت کے مظہر ہیں۔

احمد بن حنبل شیبانی 164ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے اور وہیں 241ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کے والد تیس سال کی عمر میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ والد کی وفات کے بعد امام احمد کی پرورش اور نگہداشت اُن کی والدہ نے کی۔ آپ نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ آپ نے چار سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم بغداد میں ہوئی۔ پندرہ برس کی عمر میں انہوں نے حدیث کی تعلیم شروع کی اور اپنے استاذ سے تین ہزار سے زائد حدیثیں پڑھیں۔ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ بغداد میں گزرا۔ عباسی خلفاء کے دور میں عجمی اثرات کے تحت جب یونانی منطق و فلسفے کا زور بڑھا اور معتزلہ کو عروج ہوا تو کلامی بحثوں کے نتیجے میں عقائد کے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے، ان میں خلق قرآن کا مسئلہ تھا۔ امام صاحب نے اس کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ حکمرانوں کی تمام تر ابتلاء وآزمائشوں کے مقابلے میں ہمیشہ حق پر قائم رہے اور کبھی بھی کسی قسم کی مداہنت سے کام نہیں لیا۔ جس کے پاداش میں نہ صرف قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں بلکہ کوڑے بھی لگائے گئے۔ آپ نے 77 کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔ تقریباً آٹھ لاکھ لوگوں نے جنازے میں شرکت کی۔

13.8.5 مسند اسحاق بن راہویہ

'مسند' اسحاق بن راہویہ کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے جو کہ چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ حاکم نیشاپوری نے دوسروں کی مسانید میں امام احمد کی مسند کے ساتھ اس کا بھی نام گنایا ہے۔ اس کی ترتیب و تکمیل سے وہ اپنی زندگی میں فارغ ہو چکے تھے اور اپنے شاگردوں کو زبانی اور پڑھ کر اس کا املا بھی کرایا تھا۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ اسحاق ان ہی راویتوں کی تخریج کرتے تھے جو اس کی سب سے بہتر اور اچھی روایت ہوتی۔ اس مسند کا ایک قلمی نسخہ علامہ سیوطی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ علامہ ذہبی نے اس کے

رجال کے نقد میں مستقل کتاب لکھی تھی، اس کو بھی سیوطی نے اس نسخہ کے حاشیے میں درج کیا ہے۔

اسحاق نام، ابویعقوب کنیت، اورابن راہویہ لقب تھا۔ آپ کی پیدائش 161ھ میں ہوئی۔ آپ خراسان کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ کے اساتذہ میں امام شافعی تھے۔ آپ امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی اور نسائی وغیرہ کے اساتذہ میں سے تھے۔ آپ کبار محدثین میں سے تھے۔ آپ کثیر الاسفار تھے۔ آپ نے عراق، حجاز، شام اور یمن کے سفر کیے۔ آپ کو گیارہ ہزار احادیث ازبر تھیں۔ آپ مرو کے رہنے والے تھے جو خراسان کا مضافاتی علاقہ تھا۔ آپ کے راہویہ لقب کی وجہ یہ ہے کہ ان کے والدین مکہ جارہے تھے کہ یہ راستے میں پیدا ہوئے جس سے راہویہ کہلائے۔ آپ کی تصنیفات میں المسند، الجامع الکبیر، الجامع الصغیر اور المصنف وغیرہ ہیں۔ آپ کو صاحب کتاب کشف الظنون 'صاحب المسند' قرار دیتے ہیں۔

13.8.6 شرح معانی الآثار

شرح معانی الاثارامام طحاوی کی نہایت ہی اہم اور مشہورو معروف کتاب ہے۔ اس میں فقہ و حدیث دونوں قسم کے مباحث ہیں۔ محدثین نے جن کتب حدیث کے مطالعے کا خصوصی مشورہ دیا ہے ان میں شرح معانی الاثار بھی ہے۔ اس کتاب کو بعض نے سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ پر بھی فوقیت دی ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک امام طحاوی کی کتاب شرح معانی الآثار کا مرتبہ سنن ابوداؤد کے قریب ہے، کیونکہ اس کے رواۃ معروف ہیں، اگرچہ بعض مختلف فیہ بھی ہیں، اس کے بعد ترمذی، پھر سنن ابن ماجہ کا درجہ ہے۔ اس کتاب کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں۔

1. اس میں بکثرت ایسی حدیثیں موجود ہیں جس سے دیگر کتب خالی ہیں۔
2. اس کتاب میں ایک حدیث کی مختلف اسانید کا تذکرہ جمع کیا گیا ہے جس سے ایک محدث کو بہت سے نکات و فوائد کا علم ہوتا ہے۔
3. غیر منسوب رواۃ کی نسبت اور مبہم راوی کا نام، مشتبہ کی تمیز، مجمل کی تفسیر، اضطراب و شک راوی سب کو نہایت ہی واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔
4. صحابہ و تابعین کے آثار، فقہاء کے اقوال اور ائمہ کی جرح و تعدیل بھی بیان کرتے ہیں، جس سے ان کے معاصرین کی کتابیں خالی ہیں۔
5. کبھی ترجمۃ الباب کسی فقہی مسئلہ پر قائم کرتے ہیں اور باب کی تحت روایت سے ایسے دقیق استنباط کرتے ہیں جس کی طرف اذہان کم منتقل ہوتے ہیں۔
6. کتاب کو فقہی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے، کبھی معلوم ہوتا ہے کہ باب کے تحت کی روایت بظاہر ترجمہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی مگر نہایت لطیف طریقے سے ترجمہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے اسے روایت کرتے ہیں۔
7. اس میں ادلہ احناف کے ساتھ دوسرے ائمہ کے دلائل بھی بیان کئے گئے ہیں اور اس پر نظر قائم کرکے پوری محاکمہ پیش کیا گیا ہے جس سے تفقہ کا اعلی نمونہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

امام طحاوی (239۔321ھ) کا تعلق یمن کے مشہور قبیلہ ازد کی شاخ حجر سے تھا، اس لئے اس کی طرف منسوب ہو کر ازدی کہلائے۔ آپ کے اباءواجداد فتح اسلام کے بعد مصر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ آپ نے طلب علم کے لئے مختلف ممالک کے اسفار کئے اور وہاں کے شیوخ سے استفادہ کیا۔ ان کی علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبان حدیث کا مرجع بنا دیا تھا۔ فن رجال وجرح وتعدیل میں آپ کو کامل دستگاہ حاصل تھی۔ آپ کے فضل وکمال، ثقاہت ودیانت کا اعتراف ہر دور کے محدثین ومورخین نے کیا ہے۔ آپ کثیر التصانیف ہیں۔

13.9 فرہنگ

بلند پایہ	:	عالی مقام، اونچے رتبے کا، عالی رتبہ
بقائے دوام	:	ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی
مشتبہ	:	مشکوک، غیر یقینی
عشرہ مبشرہ	:	وہ دس صحابی جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دی تھی

13.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- تدوین حدیث کا باقاعدہ انتظام اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے ذریعہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہوا۔
- حضرت عمر بن عبد العزیز نے تدوین حدیث کی ذمہ داری سب سے پہلے ابو بکر بن حزم اور محمد بن شہاب زہری کو سونپی۔
- محمد بن شہاب زہری نے سب سے پہلے حدیث کی کتاب مرتب کی۔
- امام شعبی کی کتاب "الابواب" موضوعاتی عنوانات اور سرخیوں کے تحت لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔
- دوسری صدی ہجری میں بڑی تعداد میں موضوعات کے لحاظ سے حدیث کی کتابیں لکھی گئیں۔
- دوسری صدی ہجری میں دو قسم کی کتب احادیث لکھی گئیں، پہلی وہ ہے جس میں صحیح اسناد کا التزام نہیں کیا گیا، دوسری قسم وہ ہے جس میں صحت کا تو التزام کیا گیا مگر مرفوع، مقطوع اور مرسل احادیث میں تفریق نہیں کی گئی۔
- تیسری صدی ہجری کو علم حدیث کے ضمن میں سنہرا دور کہا جاتا ہے۔
- تیسری صدی ہجری میں صحاح ستہ لکھی گئی۔
- امام مالک کو 'امام دار الہجرۃ' کا لقب ملا۔ موطا امام مالک میں ایک ہزار سات سو بیس احادیث درج ہیں۔
- مسند امام حمیدی کو امام الکتب الحدیث کہا جاتا ہے۔
- امام احمد بن حنبل نے خلق قرآن کے مسئلے میں قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں۔

13.11 نمونہ امتحانی سوالات

13.11.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. تدوین حدیث کا باقاعدہ انتظام کس عہد میں ہوا؟

(a) عہد نبوی ﷺ (b). عہد حضرت خلفاء راشدین (c). اموی دور (d). عباسی دور

2. حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں مدینہ کے والی کون تھے؟

(a). ابو بکر بن حزم (b). محمد بن شہاب زہری (c). امام شافعی (d). حضرت ابو ہریرہؓ

3. یہ قول کس محدث کا ہے کہ "اس علم کو میری طرح مجھ سے پہلے کسی نے مدون نہیں کیا"؟

(a). امام بخاری (b). محمد بن شہاب زہری (c). ابو بکر بن حزم (d). سعید بن جبیر

4. کس نے سب سے پہلے حدیث کی کتاب مرتب کر کے حضرت عمر بن عبد العزیز کی خدمت میں ارسال کیا؟

(a). ابو بکر بن حزم (b). محمد بن شہاب زہری (c). عروہ بن زبیر (d). سعید بن جبیر

5. موضوعاتی عنوانات اور سرخیوں کے تحت لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب کون سی ہے؟

(a). الابواب (b). کتاب السنن (c). موطا امام مالک (d). مسند امام احمد بن حنبل

6. کس صدی ہجری کو تدوین حدیث کے ضمن میں سنہرا دور کہا جاتا ہے؟

(a). پہلی صدی ہجری (b). دوسری صدی ہجری (c). تیسری صدی ہجری (d). چوتھی صدی ہجری

7. امام دار الہجرہ کس کا لقب پڑا؟

(a). امام احمد بن حنبل (b). امام ابو حنیفہ (c). امام شافعی (d). امام مالک

8. یہ کس کا قول ہے کہ "روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد موطا امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے"؟

(a). امام مالک (b). امام شافعی (c). امام احمد بن حنبل (d). امام ابو حنیفہ

9. حدیث کی کس کتاب کو ام الکتب الحدیث کہا جاتا ہے؟

(a). مسند احمد (b). مصنف ابن ابی شیبہ (c). موطا امام مالک (d). مسند امام حمیدی

10. حدیث کی اس کتاب کو کیا کہتے ہیں جس کی ترتیب صحابہ کے نام پر ہو؟

(a). مصنف (b). مسند (c). جامع (d). معجم

13.11.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. تدوین حدیث کے سلسلے میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی کاوشوں کو قلمبند کیجیے۔

2. پہلی صدی ہجری کے جامعین حدیث اور ان کی تصنیفی خدمات کو مختصراً ذکر کیجیے۔
3. دوسری صدی ہجری میں تصنیف کردہ احادیث کی کتب کی بنیادی خصوصیات کو قلمبند کیجیے۔
4. تیسری صدی ہجری کو تدوین حدیث کے لحاظ سے سنہرا دور کیوں کہا جاتا ہے؟ بیان کیجیے۔
5. ابو بکر بن ابی شیبہ کی کتاب مصنف کی بنیادی خصوصیات کو مختصراً بیان کیجیے۔

13.11.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. موطا امام مالک پر ایک تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. مسند امام احمد بن حنبل کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالیے۔
3. مسند امام حمیدی اور شرح معانی الآثار کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

13.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تدوین حدیث : مولانا سید مناظر احسن گیلانی
2. تذکرۃ المحدثین : مولانا ضیاء الدین اصلاحی
3. تاریخ حدیث و محدثین : محمد ابو زہرہ
4. علم حدیث اور چند اہم محدثین : پروفیسر محمد سالم قدوائی
5. تدوین حدیث : محمد حنیف خاں رضوی
6. علم حدیث ایک تعارف : محمد فاروق خاں

معروضی سوالات کے جوابات:

1.C	2.A	3. B	4.B	5.A
6.C	7. D	8. B	9. C	10.

اکائی 14: کتب حدیث کی اقسام: مسند، صحیح، سنن، جامع، معجم

اکائی کے اجزا:

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 اقسام کتب حدیث

14.2.1 مسند (ج: مسانید)

14.2.2 صحیح

14.2.3 سنن

14.2.4 جامع

14.2.5 معجم

14.3 کتب حدیث کی دیگر اقسام

14.4 حدیث کی مشہور کتابیں

14.5 طبقات کتب حدیث

14.5.1 طبقہ اول

14.5.2 طبقہ دوم

14.5.3 طبقہ سوم

14.5.4 طبقہ چہارم

14.6 اکتسابی نتائج

14.7 نمونہ امتحانی سوالات

14.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

14.7.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

14.7.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

14.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

آپ نے پچھلی اکائی میں پڑھا کہ حفاظت حدیث کے سلسلے میں مسلمانوں نے جو کوششیں کی ہیں وہ ایسی بے بہا اور بیش قیمت ہیں کہ دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملے گی۔ انہوں نے اپنے رسول کی زندگی کی پبلک اور پرائیوٹ زندگی کا ایک ایک لمحہ محفوظ کر کے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو ایسا آئینہ بنا دیا جس میں ہر مومن اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے، اور یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ مسلمانوں نے حدیث کے سرمایے کو رسول اللہ ﷺ سے سن کر نہ صرف یہ کہ زبانی یاد اور محفوظ کیا بلکہ دور اول سے ہی کتابت حدیث کا اہتمام کیا۔ حدیث کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ الزام غلط، سراسر اتہام اور بہتان تراشی ہے کہ حدیثیں رسول اللہ ﷺ کے ڈھائی سو سال بعد لکھی گئیں۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے احادیث کے لکھنے کا اہتمام خود نبی ﷺ کے زمانہ میں کر رکھا تھا۔ خود حضور پاک ﷺ نے بعض چیزیں اپنے فرمان سے لوگوں کو نقل کروائیں۔ ابتداء میں مصلحتاً اور ضرورتاً حدیثوں کو لکھنے کی ممانعت کے بارے میں ارشاد رسول ﷺ سے ہی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مسلمان اللہ کے رسول ﷺ کی حدیثیں لکھتے تھے۔ بعد میں اجازت مل جانے کے بعد صحابہ کرام میں سے ایک بڑی تعداد نے حدیثوں کو لکھنے کا اہتمام رکھا اور مختلف صحیفے بھی تیار کیے۔ ان کے بعد تابعین کرام نے بھی اس سلسلے کو اسی طرح جاری رکھا۔

ڈاکٹر محمد مصطفی اعظمی کی تحقیق کے مطابق 252 تابعین کے پاس حدیث کے مجموعے تھے یا ان کے شاگردوں نے ان سے حدیثیں لکھیں۔ اور بعد کے ادوار میں دشمنان اسلام کی سازشوں کے نتیجے میں کچھ دوسری چیزیں اللہ کے رسول ﷺ کی طرف نسبت کر کے بیان کی جانے لگیں تو مسلمان علماء محدثین کرام نے نہ صرف یہ کہ حدیثوں کی پرکھ اور چھان بین کے لیے ایسے اصول وضع کیے جن کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیثوں کو الگ کیا جا سکے بلکہ ان اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس دور میں جو کتابیں مرتب ہوئیں وہ آئندہ کے لیے معیار بن گئیں۔ روایت کے معیار اور مواد کی نوعیت کی وجہ سے انہیں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا اور ان کی مختلف اقسام قرار دی گئیں۔ حدیثوں کے ایسے مستند اور صحیح ترین مجموعے بھی تیار کر دیے جن میں رسول اللہ ﷺ کے تمام اقوال، افعال، احوال اور اوصاف کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔ اس اکائی میں ہم ان اقسام کتب حدیث کے بارے میں جانیں گے۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ:

- کتب حدیث کی اقسام اور ان کی خصوصیات کے بارے میں معلوم ہو جائے۔
- مسند صحیح، سنن، جامع اور معجم کی خصوصیات اور معروف کتب کا علم ہو جائے۔
- مختلف طبقات کتب اور ان کے مقام و مقبولیت کا جائزہ لے سکیں گے۔

14.2 اقسام کتب حدیث

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے فرامین و اعمال، اقوال کو مختلف اوقات میں کثیر آئمہ کرام اور علمانے اپنے اپنے انداز میں قلمبند کیا۔ ان منفرد انداز سے احادیث کو جمع کرنے کی بناپر رفتہ رفتہ نئے اسالیب سامنے آتے رہے۔ اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کتب حدیث کی متعدد اقسام متعارف ہوئیں۔ ہم یہاں ان کتب کی اقسام اور ان کی خصوصیات کا مطالعہ کریں گے تا کہ جب ہم کسی حدیث کی کتاب کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس کتاب کا اسلوب اور آئمہ کا منہج جس کو پیش نظر رکھ کر وہ کتاب تحریر کی گئی ہے اس کا علم رہے۔

صحیفے

جیسا کہ آپ نے پچھلی اکائیوں میں پڑھا کہ تدوین حدیث کا آغاز عہد رسالت سے ہی ہو چکا تھا۔ اور مختلف تاریخی شواہد کے پیش نظر یہ بات پتہ چلتی ہے کہ کم از کم 52 کے قریب صحابہ ایسے تھے جن کے پاس تحریری شکل میں احادیث موجود تھیں۔ صحابہ کرام کے دست مبارک سے تحریر کردہ تقریبا 48 مجموعوں کا تذکرہ کتب حدیث میں موجود ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین کے احادیث کے ذاتی مجموعے 'صحیفہ' کہلاتے تھے۔ تدوین حدیث اور کتب حدیث کی اس پہلی قسم کا کام دور نبوی سے لیکر دوسری صدی کے اوائل تک جاری رہا۔

علماحدیث کے نزدیک یہ بھی کتب حدیث کی ایک قسم شمار ہوتی ہے اور اس کے بارے میں عموما معلومات بہت کم ہیں۔ ان میں سے معروف صحیفوں کے بارے میں آپ نے پچھلی اکائیوں میں پڑھا ہے۔ یہاں بھی کچھ مشہور صحیفوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سن 10 ہجری میں لکھا ہوا صحیفہ جو نبی ﷺ کے حکم پر حضرت ابی ابن کعب نے تحریر کیا تھا۔ یہ صحیفہ نجران کی فتح کے بعد وہاں کے مقرر کردہ والی عمرو بن حزم جو اس وقت سترہ سال کے تھے، کے لیے تحریر کیا گیا تھا۔ اس میں عام نصیحتوں کے علاوہ طہارت، نماز، زکوۃ، عشر، حج و عمرہ، جہاد، غنیمت، اور جزیہ کے احکام درج تھے۔ اس میں نسلی قومیت کے نظریہ کی ممانعت، دیت، تعلیم قرآن، اور طرز حکمرانی پر بھی نبوی ارشادات شامل تھے۔ اس کتاب کی رہنمائی میں حضرت عمرو بن حزم نے اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ کتاب ان کے پوتے ابو بکر کے پاس رہی۔ امام زہریؒ نے اس صحیفہ کی تعلیم حاصل کی ابو بکر سے ہی حاصل کی اور اس کو نقل کیا۔ اس

صحیفہ کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب 'الوثائق السیاسیۃ' میں بیان کیا ہے۔

صحیفہ صادقہ

یہ سب سے مشہور صحیفہ ہے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کا تحریر کردہ صحیفہ ہے۔ یہ پورا مجموعہ مسند احمد میں موجود ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ اس صحیفہ کا خاص خیال رکھتے تھے، اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ''یہ صادقہ ہے، یہ وہ کچھ ہے جو میں نے نبی ﷺ سے راست سنا ہے، اور میرے اور آپ ﷺ کے درمیان کوئی راوی نہیں ہے''۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے نبی کریم ﷺ کی اجازت سے تحریر کی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ صحیفہ آپ کی اولاد کے پاس رہا۔ ان کے پڑپوتے عمرو بن شعیب اس صحیفہ سے درس دیا کرتے تھے۔

'کتاب الصدقہ' کے نام سے ایک اور صحیفہ کا ذکر ملتا ہے جس کے بارے میں عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اسے اپنے عاملوں کے لیے تحریر کروایا تھا لیکن آپ ان کے پاس بھیج نہیں پائے اور آپ کی وفات ہو گئی۔ اس صحیفہ کو نبی ﷺ نے اپنی تلوار کے ساتھ منسلک کر لیا تھا۔ آپ ﷺ کے بعد یہ صحیفہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس رہا اور انہوں نے اس پر عمل کیا، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اس پر عمل کیا۔ یہاں تک کہ وفات پائی۔ اس صحیفہ کا بھی درس دیا جاتا تھا۔ حضرت سالمؓ سے یہ صحیفہ امام شہاب زہری نے پڑھا اور وہ اس کا درس دیتے رہے۔ (سنن ابی داؤد و نسائی)۔

صحیفہ علی کے نام سے مشہور صحیفہ حضرت علیؓ سے منسوب ہے، جس کے بارے میں آتا ہے کہ یہ آپؓ نے نبی ﷺ کے عہد میں تحریر کیا تھا۔ امام بخاری نے اپنی مشہور 'صحیح' میں حضرت علیؓ کے اس صحیفے اور اس کے مضامین کا ذکر کیا ہے۔

صحیفہ ہمام ابن منبہ: یہ حضرت ابو ہریرۃؓ کے شاگرد ہمام بن منبہ کا تحریر کردہ نوشتہ ہے جو انہوں نے حضرت ابو ہریرۃؓ سے احادیث سن کر جمع کی تھیں۔ اصلا یہ ابو ہریرۃؓ کی تالیف تھی لیکن اس کو لکھا ہمام بن منبہ نے ہے اس لیے ان سے منسوب ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے 1955 میں تحقیق کے بعد حیدر آباد دکن سے اسے شائع کیا۔ یہ صحیفہ بھی پورا کا پورا مسند امام احمد میں درج ہے۔

اس تعارف کے ساتھ ہم اب دیگر کتب حدیث کی اقسام کے بارے میں جانیں گے۔ علمائے حدیث نے مختلف نوعیتوں سے کتب حدیث کی تقسیم کی ہے۔ ذیل میں کتب حدیث کی معروف اقسام بیان کی جارہی ہیں۔

الموطا و المصنفات

دوسری صدی ہجری میں ہمیں اس قسم کی کتب حدیث کی کتابت کے شواہد ملتے ہیں۔ ان کتب کی تفصیل ابتدائی دور کی کتب حدیث کے ضمن میں آپ پچھلی اکائیوں میں پڑھ چکے ہیں۔ صحائف کے بر عکس ان کتب میں موضوعات اور ان کی ترتیب کا اہتمام نظر آتا ہے۔ محدثین کے نزدیک ان کتب میں نبی ﷺ کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال بھی شامل ہوتے ہیں۔

آئمہ حدیث نے موطا اور مصنف میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ موطا میں مولف کے اپنے اقوال بھی شامل ہوتے ہیں جبکہ مصنف میں

یہ شامل نہیں ہوتے۔ اس قسم کی چند مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں:

موطاالامام مالک: امام مالکؒ بن انسؓ امام دار الہجرہ، آئمہ اربعہ میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں امام مالک نے اہل حجاز کی قوی احادیث کو درج کرنے کا التزام کیا ہے اور فتاوی صحابہ اور تابعین بھی شامل کر دیے اور اس کے ساتھ اپنا نکتہ بھی بیان کر دیا۔ اسی کتاب کو عباسی خلفانے آئینی حیثیت دینی چاہی لیکن امام مالک نے انہیں منع کر دیا۔

امام مالک کے معاصر محمد بن عبد الرحمن بن ابی ذئب (158ھ) نے بھی اپنی موطا تحریر کی۔ ان کے علاوہ موطاعبدان ابو محمد عبد اللہ بن موسی المروزی، موطا محمد بن حسن الشیبانی بھی تصنیف کی گئیں۔

ابتدائی دور میں لفظ مصَنف عموماً اس مفہوم میں استعمال ہوتا تھا جس کے لئے بعد میں "سنن" کی اصطلاح معروف ہوئی۔ المصنف کی چند مشہور کتب کو درج کیا جاتا ہے۔

مصنف عبد الرزاق بن ہمام (یہ مخطوطے استنبول اور یمن میں کامل موجود تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں حیدر آباد دکن، ٹونک، حیدر آباد سند میں بھی اس کے نامکمل نسخے موجود ہیں۔ یہ تمام مخطوطات تحقیق کے بعد مصنف عبد الرزاق کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب فقہی ابواب کے مطابق مرتب کی گئی ہے، اس کی لائق ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں، بقول شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، یہ عجیب بات ہے کہ عبد الرزاق بن ہمام نے اپنی مصنف کو شمائل پر ختم کیا ہے اور شمائل کو آنحضرت ﷺ کے موئے مبارک کے ذکر پر تمام کیا ہے۔

مصنف از امام وکیع بن الجراح الرواسی: امام وکیع عراق کے مستند و ثقہ عالم شمار ہوتے تھے۔ امام سفیان ثوری کے بعد ان کی مسند پر بیٹھے تھے۔ مصنف امام ابو بکر ابن شیبہ امام بخاری، امام مسلم اور دیگر ائمہ ستہ میں سے بعض کے استاد ہیں۔ امام ابن ابی شیبہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کی مشہور علمی شخصیت ہیں۔ آپ کا شمار ثقہ حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔

14.2.1 مسند (ج: مسانید)

مسانید تدوین حدیث کے تیسرے مرحلہ کی تصنیف کردہ کتب ہیں۔ اس کا آغاز دوسری صدی کے نصف سے ہوا۔

مسند کی اصطلاح بنیادی طور پر دو طرح کی کتابوں کے لیے زیادہ رائج ہے۔

پہلی وہ کتابیں جس میں حدیث کو سند کے ساتھ ذکر کیا جائے اور وہ سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہو۔ مثال کے طور پر 'صحیح بخاری'، امام بخاری نے اپنی کتاب کے نام کے میں مسند کا لفظ بھی ذکر کیا ہے۔ اس طرح مسند کی مثال میں مسند ابی حنیفہ، مسند دارمی اور مسند بقی شامل ہیں۔

دوسری قسم میں مسند حدیث کے مجموعے میں ہر صحابی کی تمام روایات کو چاہے وہ کسی بھی موضوع سے متعلق ہوں ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے۔ اور حدیث کی روایت میں تین طریقے پر صحابہ کرام کی ترتیب ہو گی:

حروف تہجی کے اعتبار سے　　2. صحابہ کرام باعتبار سوابق اسلام　　3. صحابہ کرام باعتبار شرف ونسب

حروف تہجی کے اعتبار سے

مثلاً جن صحابہ کرام کا نام "ا" سے شروع ہوتا ہو، ان تمام کی احادیث ایک جگہ، پھر جن صحابہ کرام کا نام "با" سے شروع ہوتا ہو، ان کی احادیث ایک جگہ، الیٰ آخرہ جب یہ ترتیب ملحوظ رکھیں تو پہلے حضرت ابو بکرؓ، ابو ہریرہؓ حضرت انسؓ کی احادیث کو مرتب کیا جائے گا۔

باعتبار سبقت اسلام

یعنی جن صحابہ کرام نے پہلے پہل اسلام قبول کیا، سب سے پہلے ان کی احادیث، مثلاً: پہلے عشرہ مبشرہ کی روایات، (عشرہ مبشرہ سے مراد وہ دس صحابہ کرام جنہیں دنیا میں ہی جنت کی خوشخبری دی گئی تھی، اور وہ یہ ہیں: سیدنا ابو بکر صدیقؓ، عمر بن خطابؓ، عثمان بن عفانؓ، علی بن ابی طالبؓ، زبیر بن عوامؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، طلحہ بن عبید اللہؓ، ابو عبیدہ بن جراحؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، سعید بن زیدؓ) پھر اصحاب بدر' جو تعداد میں 313 ہیں۔ پھر اہل بیعت رضوان' جو تعداد میں تقریبا 1400 ہیں، اور پھر ان صحابہ کرام کی روایات ہوں گی جو فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔

باعتبار شرف نسب

نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے خاندان اس کے بعد الاقرب فالاقرب۔ مثلا سب سے پہلے خاندان نبوت بنو ہاشم کی احادیث لائی جائیں گی، پھر ان کی جن کا تعلق بنو ہاشم سے ہو، جیسے سیدنا عثمانؓ، اس لیے کہ آپ کی والدہ ہاشمیہ اور رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی پھوپی تھیں اور سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی، اس لیے کہ آپ کی بیٹی ام المومنین سیدہ عائشہؓ رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی زوجہ محترمہ ہیں، اور ان کے بعد ان کی احادیث لائی جاتی ہیں جو شرف نسب میں زیادہ فضیلت والے ہوں۔

کتب مسانید بہت سی ہیں لیکن ان میں سب سے قدیم غالبا امام عبد اللہ بن مبارک تمیمی کی ہے۔ جو حدیث کے حافظ، فقیہ وقت اور عربی لغت اور تاریخ کے بہت بڑے عالم تھے۔ مسند ابو داؤد طیالسی کی بھی قدیم ترین کتاب ہے اس میں 300 سے زیادہ صحابہ کی مسانید جمع ہیں۔ ان میں سب سے مشہور مسند امام حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی جمع کردہ مسند احمد بن حنبل ہے۔ حافظ ابن عساکر کی فہرست کے مطابق اس میں 1056 صحابہ اور صحابیات کی مسانید جمع ہیں۔ آئمہ اربعہ میں سے امام احمد کے علاوہ مسند امام شافعی اور امام ابو حنیفہ سے بھی منسوب ہیں۔ جو ان کی تالیفات نہیں ہیں بلکہ ان کے شاگردوں نے ان سے منسوب کی ہیں۔ اس کے علاوہ مسانید میں مسند ابو بکر بن ابی شیبہ، مسند بزار، مسند عبد بن حمید،، مسند ابو یعلیٰ، مسند یعقوب بن شیبہ، اور مسند ابن ابی اسامہ، وغیرہ ہیں۔ ان کی تفصیل پچھلی اکائی میں آچکی ہے۔

مسند کتب حدیث کی وہ قسم ہے جس پر محدثین کی سب سے زیادہ توجہ مرکوز رہی۔ تاریخ میں یہ بات ملتی ہے کہ ہر بڑے محدث نے 'مسند' لکھی ہے۔ علامہ کتانی نے اپنی کتاب 'الرسالة المتطرفة' میں 80 مسانید کے نام شمار کیے ہیں اور آگے درج کیا کہ اس کے علاوہ بھی اور مسانید تالیف کی گئیں ہیں۔

14.2.2 صحیح

کتابت حدیث کا یہ اگلا مرحلہ تیسری صدی ہجری سے مرتب ہونا شروع ہوا۔ اس قسم کی کتب میں مصنفین اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ اپنی کتب میں صرف صحیح احادیث کو درج کریں۔ اس صدی میں صحیح کتب تالیف کی گئیں۔ ان میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابن خزیمہ، صحیح الامام سعید بن عثمان، صحیح ابن حبان شامل ہیں۔ بعد کے ادوار میں محدثین نے ان کتابوں کا جائزہ لیا اور اس بات کو پرکھا کہ صحیح احادیث کے اندراج میں کس حد تک مقررہ شرائط کو پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق صرف بخاری اور مسلم سند کے اعتبار سے صحت کے اعلی ترین معیار پورا اترتی ہیں۔ اکثر صحیح کتب حدیث میں ضعیف احادیث کا اندراج ہوا ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو صحاح ستہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں آپ تفصیل سے اگلی اکائی میں پڑھیں گے۔

صحیحین کے علاوہ محمد بن اسحق بن خزیمہ نے بھی صحیح احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو 'صحیح ابن خزیمہ' کے نام سے معروف ہے۔ یہ کتاب موضوعات کی ترتیب پر ہے۔ اس کتاب کی حدیثوں پر محدثین نے عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر مصطفی اعظمی کی تحقیق سے منظر عام پر آچکی ہے۔

'التقاسیم والانواع' کے نام سے جو صحیح ابن حبان کے نام سے معروف ہے، ابو حاتم محمد بن حبان کا مرتب کردہ صحیح احادیث کا ایک مجموعہ ہے۔ کتاب کو اوامر اور نواہی کے انواع کے اعتبار سے احادیث مرتب کی ہیں۔ اسی طرح فقہی احکام کے تحت بھی احادیث الگ سے جمع ہیں۔ محدثین کے مطابق اس کتاب کی ترتیب بہت پیچیدہ ہے۔ جملہ حدیثوں کی تعداد 7491 ہے۔

موجودہ دور میں احادیث صحیحہ کو جمع کرنے کے حوالے سے محدث ناصر الدین البانی جو مشہور محدث اور چودھویں صدی میں علم تخریج کے امام تھے، نے احادیث کو صحت اور ضعف کے اعتبار سے تقسیم کرکے 'سلسلہ احادیث صحیحہ' اور 'سلسلہ احادیث ضعیفہ' ترتیب دیا ہے۔ جو ایک نمایاں کارنامہ ہے۔

14.2.3 سنن

سُنَن سنۃ کی جمع ہے، اور کتب حدیث کی ایک اہم قسم ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں سنن حدیث کی ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن کی جمع و ترتیب فقہی ابواب پر ہو۔ یہ کتابیں دین کے اکثر ابواب سے متعلق مضامین کا احاطہ کرتی ہیں۔ محدثین کی اصطلاح میں 'مرفوع' رسول ﷺ کی جانب منسوب باتوں کو کہا جاتا ہے۔ جب کہ صحابہ سے منسوب باتوں کو اصطلاح میں 'موقوف' کہتے ہیں۔ سنن کے مولفین 'مرفوع' روایتوں کو جمع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ البتہ سنن کی بعض کتابوں میں موقوف روایتیں بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کا آغاز کتاب الطهارة اور کتاب الصلاۃ سے ہو، صحاح ستہ کی چار کتابیں سنن میں داخل ہیں اور وہ یہ ہیں:

1 ترمذی　　2 ابوداؤد　　3 نسائی　　4 ابن ماجہ۔

صحاح ستہ میں موجود سنن کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں بھی سنن میں شامل ہیں: امام ابو محمد عبد الله بن عبد الرحمن

الدارمی کی "سنن دارمی ، ۔ مسند دارمی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رجال قلیل ہیں۔ جس کی وجہ سے اکثر ثلاثیات پر مشتمل احادیث ہیں۔ حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ سنن دارمی کو صحاح ستہ میں شامل کیا جائے کیوں کہ اس میں ضعیف احادیث کم ہیں۔

امام دارقطنی کی 'سنن دارقطنی امام بیہقی کی " سنن بیہقی " جسے السنن الکبری بھی کہا جاتا ہے، اور انہی کی " السنن الکبیرۃ " بھی ہے۔ یہ بہت ضخیم کتاب ہے۔ سنن سعید بن منصور، وغیرہ۔

ان کے علاوہ بھی محدثین نے سنن پر کتابیں تالیف کی ہیں، سنن کی تعداد جامع کتب حدیث سے زیادہ ہے۔

14.2.4 جامع

محدثین کی اصطلاح میں جامع اس حدیث کی کتاب کو کہا جاتا ہے جن میں آٹھ عنوانوں کے تحت حدیثیں آئی ہوں اور وہ 8 عنوانات یہ ہیں:

1. سیر : آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا طریقہ، لیکن شرعاً اس کا استعمال امورِ جہاد پر ہی ہوتا ہے (مغازی)
2. آداب : معاملات و معاشرت کے اداب پر مشتمل احادیث
3. تفسیر : وہ احادیث جن کا تعلق تفسیر قرآن سے ہو
4. عقائد : جن کا تعلق عقیدے سے ہو
5. فتن واشراط : مستقبل میں پیش آنے والے واقعات (پیشین گوئی نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، علامات قیامت سے متعلق روایتیں)
6. احکام : عملی زندگی سے متعلق احاادیث، فقہی مسائل پر مشتمل احادیث
7. زہدورقاق : تزکیہ نفس سے متعلق احادیث
8. مناقب : اہل بیت، صحابہ، صحابیات، سے متعلق فضائل پر مشتمل روایتیں

صحاح ستہ میں دو کتابوں کو جامع کا درجہ حاصل ہے ایک صحیح بخاری (جامع بخاری) دوسری سنن ترمذی (جامع ترمذی)

ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں تفسیر نہیں ہے۔ مسلم شریف میں بھی تفسیر اور قرأت کی احادیث کم ہیں۔

یہاں ایک بات ذہن نشین رہے کہ حدیث کی مختلف کتب ایک سے زیادہ قسم سے تعلق رکھ سکتی ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری صحیح بھی ہے اور جامع بھی۔

ان کے علاوہ جو کتب جامع میں شمار ہوتی ہیں ان میں سے کچھ کتابوں کی تفصیل یہاں درج کی جاتی ہے۔

الجامع سفیان بن سعید بن مسروق الثوری الاکوفی امام سفیان ثوری کی کتاب ہے۔ امام الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ فہرست ابن الندیم نے بھی اس کتاب کا ذکر 'مذہب اہل حدیث' کے باب میں درج کیا ہے۔

جامع الالصول لابن الاثیر: یہ علامہ مبارک بن محمد ابن اثیر کی تالیف ہے اس کتاب میں صحیحین ، موطا، سنن ابی داود، جامع الترمذی کی احادیث کی سندوں کو حذف کر کے متون کو فقہی ابواب میں جمع کیا ہے۔۔ ابواب کی ترتیب حروف تہجی پر قائم کی گئی ہے۔

جمع الجوامع للسیوطی: امام جلال الدین سیوطی کی تالیف ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں حدیث کی جتنی کتابیں ہیں وہ انہوں نے اس میں شامل کر دی ہیں۔

جمع الزوائد: یہ علامہ نور الدین کی تالیف ہے انہوں نے اس میں صحاح ستہ کے علاوہ سنن وغیرہ کی احادیث کو بھی اس میں جمع کر دیا ہے۔ وہ ہر حدیث کے آخر میں یہ فیصلہ بھی دیتے ہیں کہ راوی ثقہ ہیں یا ضعیف۔

کنز العمال: یہ علامہ علی متقی کی تالیف ہے۔ یہ کتاب بھی جامع میں داخل ہے اس میں مصنف نے امام سیوطی کی جامع الکبیر اور جمع الجوامع کو یکجا کیا ہے۔ اس کتاب کی طوالت کو دیکھ کر انہوں نے خود ہی اس کو مختصر کیا اور منتخب کنز العمال تصنیف کی۔

اس کے علاوہ جامع المسانید وا لسنن لابن الکثیر، الجامع الوزاعی، اللولو والمرجان لفواد عبد اباقی، الجمع بین الصحیحین وغیرہ جامع کی قسم میں شامل ہیں۔

14.2.5 معجم

اصطلاح محدثین میں معجم اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مولف اپنے اساتذہ و شیوخ، یا صحابہ کو حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کرے پھر ان حدیثوں کو ذکر کرے۔

شیوخ کی ترتیب بھی تین لحاظ سے کی جاتی ہے۔

1- ترتیب وفات کے لحاظ سے۔ 2- تقویٰ اور علم کے لحاظ سے۔ 3- حروف تہجی کے اعتبار سے۔

ترتیب وفات کے لحاظ سے

تاریخ وفات کا عتبار کیا جائے مثلاً جو استاد پہلے فوت ہو جائے، اس کی حدیث کو پہلے لکھا جاتا ہے۔

تقوی اور علم کے لحاظ سے

جو استاد زیادہ تقوی اور علم والا م ہو، ان کی حدیث کو پہلے ذکر کرنا، اس کے بعد علم و تقوی کے لحاظ سے جو ہو اس کا خیال رکھنا۔

حروف تہجی کے اعتبار سے

جس استاد کا نام 'الف' سے شروع ہو ان کی احادیث کو پہلے رقم کرنا اسی طرح ترتیب حروف الہجاء کا اعتبار رکھنا۔ حروف الہجاء کی ترتیب سے تالیف کی گئی تین کتابیں اس صنف میں بہت مشہور ہیں۔ جو امام ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے تالیف کی ہیں۔ المعجم الکبیر: یہ

صحابہ کی ترتیب پر ہے۔ یہ دنیا کی سب سے ضخیم معجم ہے۔ اس میں ساٹھ ہزار حدیثیں جمع ہیں۔ المعجم الاوسط اور المعجم الصغیر شیوخ اور اساتذہ کی ترتیب پر ہے۔ ان کتابوں میں امام طبرانی نے اپنے ہر استاد کی صرف ایک روایت لی ہے۔

ان کے علاوہ معجم الصحابہ از ابو محمد حسین بن مسعود بغوی اور معجم الصحابہ از قانع البغدادی بھی اس کی مثال ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے ایک اور نئی قسم بھی متعارف ہوئی ہے جس میں حروف تہجی کے اعتبار سے ٹکڑے لکھ کر پھر ان کو بیان کرنے والی کتب حدیث کے حوالے نقل کیے جاتے ہیں۔

یاقوت الحموی کی معجم البلدان شہروں کی ترتیب پر ہے۔ ان معاجم کے علاوہ معجم الصحابہ از امام احمد بن علی الہمدانی، معجم الصحابہ از ابو یعلی احمد بن علی الموصلی شامل ہیں۔

14.3 کتب حدیث کی دیگر اقسام

کتب احادیث کی اقسام میں ایسی کتب حدیث ہیں جو کم معروف ہیں اور ثانوی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کو بھی یہاں مختصر ادرج کیا جارہا ہے۔

مستخرج

حدیث کی اس کتاب کو مستخرج کہتے ہیں جس میں کسی کتاب کی حدیثوں کو ثابت کرنے کے لئے اس کتاب کے مؤلف کے علاوہ ان حدیثوں کو اپنی سند سے بیان کیا گیا ہو اور یہ سند کتاب کے مؤلف کے شیخ سے یا اس سے اوپر جا کر ملتی ہو اور مؤلف کتاب اس میں حائل نہ ہو۔ محدثین نے اس قسم کی کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں امام یعقوب بن اسحاق اسفرائینیؒ کی مستخرج ابو عوانہ ہے جسے صحیح ابو عوانہ بھی کہتے ہیں، اس کتاب کو امام اسفرائینیؒ نے صحیح مسلم کی احادیث پر مستخرج کیا ہے، اسی طرح امام اسماعیلی نے صحیح بخاری شریف کی احادیث کو اپنی سند سے بیان کیا ہے اور ان کی اس کتاب کا نام "مستخرج اسماعیلی" ہے۔

مستدرک

اس حدیث کی کتاب کو کہا جاتا ہے جس کا مولف کسی خاص ایک یا دو حدیث کی کتابوں کو سامنے رکھ کر، اسی صاحب کتاب کی شروط پر احادیث درج کرتا ہے جو اُس کتاب کے موضوع میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، خواہ مؤلف نے جان بوجھ کر انہیں ترک کر دیا ہو یا سہواً ایسا ہوا ہو۔ اور پھر اپنی کتاب میں ان احادیث کو الگ کر کے جمع کر دیتا ہے، اس عمل کو استدراک، اور اس کتاب کے مجموعے کو مستدرک کہتے ہیں، اس قسم کی سب سے مشہور کتاب امام حاکم رحمہ اللہ کی مستدرک علی الصحیحین ہے، جو انہوں نے بخاری و مسلم پر استدراک کرتے ہوئے تالیف فرمائی، اسے مستدرک حاکم بھی کہا جاتا ہے۔

اربعین

محدثین کی اصطلاح میں اربعین اس مجموعہ حدیث کو کہا جاتا ہے جس میں کسی ایک راوی کی ایک ہی موضوع پر چالیس احادیث کو جمع کیا جائے، یا متعدد راویوں کی مختلف موضوع پر چالیس احادیث کو جمع کیا جائے، اس قبیل کی کتابوں میں سب سے مشہور کتاب امام نوویؒ کی "اربعین نوویه" ہے۔

الجزء:

محدثین کی اصطلاح میں اس حدیث کی کتاب کو کہتے ہیں' جس میں کسی ایک صحابی کی، یا کسی ایک خاص موضوع یا خاص مسئلے پر احادیث جمع کی جائیں مثلاً اگر سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی احادیث جمع کر دی جائیں تو وہ کتاب " جزء ابی بکر "ہو جائے۔ اجزاء میں سب سے مشہور جزء امام بخاریؒ کی ' جزء رفع الیدین ' ہے، جس میں آپ نے رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرنے کی احادیث جمع فرمائی ہیں، نیز آپ نے جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھنے کی تمام احادیث کو "جزء القراءۃ" کے نام سے ایک کتاب میں جمع فرما دیا ہے۔ اسی موضوع پر امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی "کتاب القرا ءۃ" کے نام سے ایک مجموعہ حدیث جمع فرمایا ہے جس کا شمار بھی جزء ہی میں ہوتا ہے۔

اس قسم کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ جس میں جزء امام ابی سفیان، جزءالحسن بن العرفه العبدی، الجزء محمد بن عاصم الاصبہانی، جزء احمد بن عصام ، جزء طرق حدیث من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار لابن حجر عسقلانی، جزء فیه طرق حدیث طلب العلم فریضه علی کل مسلم لامام السیوطی، وغیرہ شامل ہیں۔

رسالہ

کتب حدیث کی یہ قسم رسالہ اجزا کی قسم سے مماثلت رکھتی ہے۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ رسائل میں موضوع بحث کو زیادہ مخصوص رکھا جاتا ہے۔ رسائل کو محدثین کی زبان میں کتب بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں جامع کے آٹھ عنوانوں میں سے کسی ایک عنوان پر احادیث کو جمع کیا جاتا ہے۔ جیسے آداب میں امام احمد کی کتاب الزہد اور تفسیر میں ابن جریر طبری کی کتاب۔ امام سیوطی اور امام ابن حجر عسقلانی کی بہت سی کتابیں اسی کتب حدیث کے ضمرہ میں آتی ہیں۔

کتب علل

ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں احادیث کے ضعف کی وجوہات کو بیان کیا جائے، مثلاً: کوئی روایت اگر ضعیف ہے تو کیوں ہے ؟ کیا اس کا کوئی راوی ضعیف ہے، یا اس سند کا سلسلہ ٹوٹا (منقطع) ہے، یا اور کوئی وجہ ہے۔ غرضیکہ احادیث کو ان کی علتوں کے ساتھ بیان کیا جائے، اس موضوع پر امام ابن جوزیؒ کی "العلل المتناہیة" اور امام دار قطنیؒ کی "کتاب العلل" اور امام ابن حاتم رحمہ اللہ کی "علل ابن حاتم" ہے۔

اطراف

محدثین کے نزدیک اطراف کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک خاص حدیث کی تمام سندیں، یا کئی مخصوص احادیث کی اسانید کو جمع کر دیا، جہاں تمام اسانید ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہاں سے آگے ایک سند نقل کر دی جائے، اس قسم کی کئی کتابیں ہیں: مثلاً ابن عساکرؒ کی "الاشراف علی معرفة الاطراف" حافظ جمال الدین مزّیؒ کی "تحفة الاشراف بمعرفة الاطراف" حافظ ابن حجرؒ کی "تحاف المهرة باطراف العشرة" وغیرہ ہیں۔

امالی

طباعت کی رواج سے پہلے اساتذہ اپنے لیکچر، یا کتب یا احادیث املا کرتے تھے، اس طرح جو کتاب بن جاتی اسے امالی کہا جاتا تھا۔ امالی 'املا' کی جمع ہے وہ کتاب جس میں شیخ کے املا کرائے ہوئے فوائد و نکاتِ حدیث جمع ہوں۔

سلف صالحین، میں فقہا، محدثین اور عربی فنون کے ماہرین میں طریقہ یہ ہوتا کہ اپنے فن کا استاذ اپنے فن اور بالخصوص محدثین اپنی یاد کی ہوئی حدیثیں اپنے شاگردوں کو املا کراتے املا یہ ہے کہ اس کے شاگرد قلم دوات کے ساتھ بیٹھتے اور جو استاذ بولتا لکھتے جاتے اس طرح شاگرد کے پاس کئی مجالس کے بعد مجموعہ تیار ہو جاتا اسے وہ شیخ کی 'امالی' کہتا۔ علمائے شافعیہ اسے امالی کے بجائے 'تعلیقہ' کہتے ہیں۔ اس کی مثال حافظ ابن حجر کی 'امالی'۔ اور امالی امام محمد ہے۔ جو ان کی روایات منفردہ اور معین مسائل ہیں۔

مسلسل

اصطلاحِ محدثین میں مسلسل اس مجموعہ حدیث کو کہتے ہیں جس میں وہ احادیث جمع کی جائیں جن کے اندر ایک خاص راوی، یا کئی راویوں کی کوئی صفت، کوئی فعل (کام) یا کسی قول کا تسلسل موجود ہو، مثلاً: ایک راوی نے ایک حدیث بیان کی اور اس کے بعد وہ ہنس پڑے اور فرمانے لگے کہ: اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد میرے شیخ نے بھی اسی طرح ہنسا تھا، اور ان کے شیخ نے بھی یہ فعل کیا تھا اور فلاں صحابی نے بھی اس روایت کو بیان کرنے کے بعد یہ عمل دہرایا تھا، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد تبسم فرمایا تھا۔

اس قسم کی روایات کو جس میں کسی حدیث کو بیان کرنے کے بعد کوئی خاص فعل یا عمل کیا گیا ہو تو اسے روایت "مسلسل بالفعل" کہا جائے گا، اگر کسی خاص صفت والی روایات جمع کی جائیں تو انہیں "مسلسل بالصفة" کہا جائے گا۔

اور اسی سلسلے کی ایک اور قسم ہے جسے حدیث "مسلسل باوّلیه" کہتے ہیں، ان میں ہر راوی اپنی خاص روایت بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ میرے شیخ نے یہ حدیث مجھے پہلی ملاقات میں بیان فرمائی ہے، اور اسی طرح ان کو بھی ان کے شیخ نے پہلی ملاقات میں یہ حدیث بیان کی تھی، الیٰ آخرہ۔

اسی کی ایک قسم "مسلسل بتحریک الشفتین" ہے کہ جب راوی اس حدیث کو بیان کرے تو اپنے ہونٹ ہلائے اور کہے کہ

:میرے شیخ نے بھی یہ حدیث بیان کرتے ہوئے یہ عمل کیا تھا، اسی طرح سیدنا ابن عباسؓ نے کیا تھا اور اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک لبوں کو حرکت دی تھی۔

14.4 حدیث کی مشہور کتابیں

حدیث کی مشہور کتابیں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں کچھ کتابیں ایسی ہیں جن کو شہرت دوام حاصل ہوئی اور جو ہر زمانے اور ہر دور میں یکساں طور پر مقبول رہیں۔ اہل سنت کے ہاں صحاح ستہ یا کتب ستہ کا شمار انہیں مشہور ترین کتابوں میں ہوتا ہے البتہ صحاح ستہ یا کتب ستہ میں حدیث کی کون سی کتابیں شامل ہیں اس بارے میں علمائے حدیث کے درمیان تھوڑا اختلاف رہا ہے، کچھ لوگ ابن ماجہ کے بجائے مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کرتے ہیں جب کہ کچھ علمائے حدیث نے سنن دارمی کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے۔ البتہ زیادہ معروف و مقبول روایت کے مطابق صحاح ستہ یا کتب ستہ میں درج ذیل کتابیں شمار ہوتی ہیں۔ 1۔ صحیح بخاری، 2۔ صحیح مسلم، 3۔ جامع ترمذی، 4۔ سنن ابو داؤد، 5۔ سنن نسائی، 6۔ سنن ابن ماجہ۔

مؤطا امام مالک کا درجہ بہت بلند ہے اور اکثر علماء حدیث نے اس کو صحیحین کے برابر درجہ دیا ہے جب کہ کچھ لوگ ان پر بھی اسے فوقیت دیتے ہیں۔ ہم نے حدیث کی ابتدائی کتب کے تحت اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

14.5 طبقات کتب حدیث

بعض علماء حدیث نے حدیث کی کتابوں کی صحت، شہرت اور مقبولیت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی درجہ بندی بھی کی ہے جسے طبقات کتب حدیث کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مشہور ہندوستانی محدث شاہ ولی اللہ دہلوی نے کتب حدیث کے چار طبقات بیان کیے ہیں جنہیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

14.5.1 طبقہ اول

اس طبقے میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مؤطا امام مالک کا شمار ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں صرف صحیح اور حسن حدیثیں پائی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ صحیح ابن حبان، مختار ضیاء قدسی، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن عوانہ، صحیح ابن سکن، صحیح حاکم اور منتقی ابن جارود کو بھی پہلے طبقے میں جگہ دی گئی ہے۔ البتہ صحت کے اعتبار سے بخاری، مسلم اور مؤطا امام مالک کو ان سب پر فوقیت حاصل ہے۔

14.5.2 طبقہ دوم

کتب حدیث کے دوسرے طبقے میں سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی کا شمار ہوتا ہے۔ اس طبقے کی کتابوں میں اکثر حدیثیں صحیح اور حسن ہیں، بعض ضعیف روایتیں بھی ان میں آگئی ہیں لیکن ان کا ضعف بیان کر دیا گیا ہے۔ اس طبقے کی کتب حدیث میں بیان کی گئی حدیثیں پہلے طبقے کی حدیثوں سے قریب تر ہیں اس لیے انہیں قابل اعتماد مانا گیا ہے۔ زوائد کو چھوڑ کر مسند احمد کا شمار بھی اسی طبقے میں

ہوتا ہے۔

14.5.3 طبقہ سوم

کتب حدیث کے تیسرے طبقے میں حدیث کی وہ کتابیں آتی ہیں جن میں صحیح اور حسن حدیثوں کے علاوہ ضعیف روایتیں بھی موجود ہیں یہاں تک کہ ان میں شامل بعض حدیثیں متہم **بالوضع** بھی ہو سکتی ہیں 'البتہ قابل اعتماد روایات کا عنصر ان میں غالب ہے۔ سنن دارمی، ابن ماجہ، بیہقی، دار قطنی، کتب طبرانی، تصانیف طحاوی اور مسند شافعی کا شمار اس طبقے کی کتابوں میں ہوتا ہے۔ علماء حدیث نے مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ اور زوائد مسند احمد (زوائد مسند سے مراد وہ حدیثیں ہیں جن کو امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے عبداللہؒ نے مسند کی تدوین کے وقت اس میں شامل کیا) کے علاوہ مسند طیالسی، مسند سعید بن منصورؒ،مسند ابی یعلیٰ موصلیؒ، مسند عبد بن حمیدؒ، مسند بزار، مسند ابن حریریؒ، تفسیر ابن جریرؒ، تفسیر ابن مردویہؒ، معجم صغیرؒ، معجم کبیرؒ، معجم اوسط للطبرانیؒ وغیرہ کو بھی تیسرے طبقے کی کتب حدیث میں جگہ دی ہے۔

14.5.4 طبقہ چہارم

کتب حدیث کے چوتھے طبقے میں حدیث کی وہ کتابیں شامل ہیں جن میں بیان کی ہوئی حدیثوں کا قرون اولیٰ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ محدثین کو ان کی کوئی اصل نہیں ملی یا پھر انہوں نے ان میں کوئی علت خفیہ (چھپا ہوا عیب) دیکھ کر انہیں نظر انداز کر دیا۔ ان کتب حدیث کی سبھی روایات ضعیف ہیں۔ دیلمی، ابو نعیم اور ابن عساکر وغیرہ کی تصانیف اس طبقے میں شامل ہیں۔

14.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- کتابت حدیث کا آغاز یوں تو صحابہ کے دور میں ہی ہو گیا تھا لیکن بعد کے ادوار میں دشمنان اسلام کی سازشوں کے نتیجے میں کچھ دوسری چیزیں اللہ کے رسول ﷺ کی طرف نسبت کر کے بیان کی جانے لگیں تو مسلمان علماء محدثین کرام نے نے نہ صرف یہ کہ حدیثوں کی پرکھ اور چھان بین کے لیے ایسے اصول وضع کیے جن کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیثوں کو الگ کیا جا سکے بلکہ ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس دور میں جو کتابیں مرتب ہوئیں وہ آئندہ کے لیے معیار بن گئیں
- روایت کے معیار اور مواد کی نوعیت کی وجہ سے انہیں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا اور ان کی مختلف اقسام قرار دی گئیں۔ حدیثوں کے ایسے مستند اور صحیح ترین مجموعے بھی تیار کر دیے جن میں رسول اللہ ﷺ کے تمام اقوال، افعال، احوال اور اوصاف کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔
- احادیث کی کتب مختلف انداز پر مرتب کی گئیں اور ہر قسم کو علیٰحدہ نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جس میں مسند، صحیح، جامع، معجم، سنن داخل ہیں۔

- مسند حدیث کی وہ کتاب جس میں ہر صحابی کی روایات علیٰحدہ جمع کی جائیں، راویوں کی ترتیب کبھی باعتبار فرق مراتب ہوتی ہے اور کبھی باعتبار اسماء حروف تہجی کی ترتیب پر۔ جیسے۔ مسند امام احمد، مسند ابو داؤد طیالسی وغیرہ۔
- جامع حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں آٹھ چیزوں کا بیان ہو۔ سیر، آداب، تفسیر، عقائد، فتن واشراط، احکام، زہد ورقاق، مناقب۔ صحاح ستہ میں بخاری اور ترمذی کو جامع کا درجہ حاصل ہے۔
- سنن حدیث کی وہ کتاب جس کی ترتیب ابواب فقہیہ کے اعتبار سے ہو اور صرف احادیث احکام ذکر کی جائیں۔ صحاح ستہ کی چار کتابیں سنن میں داخل ہیں۔
- معجم حدیث کی وہ کتاب جس میں راویان حدیث کی ترتیب حروف تہجی پر احادیث جمع کی گئی ہوں، خواہ وہ راوی مصنف کے اپنے شیوخ ہوں یا صحابہ کرام۔ امام طبرانی کی معاجم ثلاثہ اس کی بہترین مثال ہے۔
- اس کے علاوہ بھی اور انواع کی کتب حدیث مرتب کی گئیں، جیسے مستدرک، مستخرج، اجزاء، امالی، اربعین، قوامیس وغیرہ۔
- بعض علماء حدیث نے حدیث کی کتابوں کی صحت، شہرت اور مقبولیت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی درجہ بندی بھی کی ہے جسے طبقات کتب حدیث کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مشہور ہندوستانی محدث شاہ ولی اللہ دہلوی نے کتب حدیث کے چار طبقات بیان کیے ہیں۔
- پہلے طبقے کی کتب میں بخاری مسلم اور موطا کو شامل کیا جاتا ہے، دوسرے طبقے میں سنن نسائی، سنن ابو داؤد، اور جامع ترمذی شامل ہیں ہیں تیسرے طبقے کی کتب میں وہ کتابیں آتی ہیں جن میں صحیح اور حسن حدیثوں کے علاوہ ضعیف روایتیں بھی موجود ہیں یہاں تک کہ ان میں شامل بعض حدیثیں متہم بالوضع بھی ہوسکتی ہیں۔ اس میں سنن ابن ماجہ، سنن دارمی وغیرہ شامل ہیں۔ چوتھے طبقے کی کتب میں محدثین کے مطابق ان میں بیان کی ہوئی حدیثوں کا قرون اولیٰ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ان کتب حدیث کی سبھی روایات ضعیف ہوں۔ دیلمی، ابونعیم اور ابن عساکر وغیرہ کی تصانیف اس طبقے میں شامل ہیں۔

14.7 نمونہ امتحانی سوالات

14.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. کس کتب حدیث میں حدیثیں فقہی ترتیب کے اعتبار سے جمع کی جاتی ہیں؟

(a). سنن　　(b). جامع　　(c) معجم　　(d). مستدرک

2. کون سے کتاب کو صحیح کے علاوہ 'جامع بھی کہا جاتا ہے؟

(a). بخاری　　(b). ترمذی　　(c). ابن ماجہ　　(d). موطا امام مالک

3. امام سلیمان بن احمد الطبرانی کے حدیث کے مجموعہ کا نام کیا ہے؟

(a). الجامع الصحیح　　(b). سنن دارمی　　(c). المعجم الکبیر　　(d). مستدرک للحاکم

4. پہلے طبقے کی کتب میں کس کو شامل نہیں کیا جاتا ہے؟

(a). بخاری (b). مسلم (c) موطا (d). ترمذی

5. کون سی کتاب میں اساتذہ کی ترتیب سے حدیثیں جمع کی جاتی ہیں؟

(a) معجم (b). سنن (c). صحیح (d). اربعین

6. یاقوت الحموی کی معجم البلدان میں احادیث کی روایت کس ترتیب سے کی گئی ہے؟

(a). صحابہ کی ترتیب (b). اساتذہ کی ترتیب (c) شہروں کی ترتیب (d). سب صحیح

7. وہ کتابیں جس میں احادیث کو سند کے ساتھ ذکر کیا جائے اور وہ سند رسول ﷺ تک پہنچتی ہو اسے کیا کہتے ہیں؟

(a). سنن (b). جامع (c). مسند (d). مصنف

8. وہ کتابیں جن میں تمام ابواب دین سے متعلق حدیثیں جمع کر دی گئی ہوں؟

(a). سنن (b). جامع (c). مسند (d). مصنف

9. اس حدیث کی کتاب کو کیا کہتے ہیں، جس میں کسی ایک صحابی کی، یا کسی ایک خاص موضوع یا خاص مسئلے پر احادیث جمع کی جائیں؟

(a). امالی (b). علل (c). جزء (d). اربعین

10. مشہور ہندوستانی محدث شاہ ولی اللہ دہلوی نے کتب حدیث کے کتنے طبقات بیان کیے ہیں؟

(a). ایک (b). دو (c). تین (d). چار

14.7.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. جامع کسے کہتے ہیں؟ مع مثال واضح کیجیے۔
2. سنن کی خصوصیات پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. معجم پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
4. مسند کی تعریف کرتے ہوئے اس خصوصیات بیان کیجیے
5. طبقات کتب حدیث پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

14.7.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. کتب حدیث کی اقسام سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ اس کی اہمیت اور افادیت پر ایک نوٹ تحریر کیجیے
2. مسند، سنن اور جامع پر ایک تقابلی مضمون تحریر کیجیے۔
3. حدیث کی ثانوی درجہ کی کتب کی اقسام پر ایک تعارفی مضمون قلمبند کیجیے۔

14.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تدوین حدیث : مولانا مناظر احسن گیلانی
2. تذکرۃ المحدثین : غلام رسول سعیدی
3. تذکرۃ المحدثین : مولانا ضیاء الدین اصلاحی
4. علم حدیث: ایک تعارف : محمد فاروق خاں
5. علم الحدیث : صبحی صالح، اردو ترجمہ غلام احمد حریری
6. کتب حدیث کی اقسام ایک مختصر تعارف : محمد نبیل مشرف

معروضی سوالات کے جوابات

1. B	2.A	3.C	4.D	5.A
6.C	7. C	8. B	9. C	10. D

اکائی 15: صحیحین: بخاری اور مسلم کا تعارف

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید
15.1 مقاصد
15.2 صحاح ستہ
15.3 صحیح بخاری
15.3.1 احادیث اور ابواب وغیرہ کی تعداد
15.3.2 صحیح بخاری کی خصوصیات
15.3.3 صحیح بخاری کی شرحیں
15.3.4 صحیح بخاری کی مقبولیت
15.3.5 وجہ تالیف
15.3.6 مدت و کیفیت تالیف
15.4 امام بخاری: مختصر حالات زندگی
15.4.1 امام بخاری کا حافظہ
15.4.2 وفات
15.5 صحیح مسلم
15.5.1 صحیح مسلم کی خصوصیات
15.5.2 احادیث اور ابواب
15.5.3 صحیح مسلم کی شرحیں
15.6 امام مسلم: مختصر حالات زندگی

15.6.1 تصانیف و تالیف
15.7 اکتسابی نتائج
15.8 نمونہ امتحانی سوالات
15.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات
15.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات
15.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات
15.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

آپ نے پچھلی اکائیوں میں پڑھا کہ حفاظت حدیث کے سلسلے میں مسلمانوں نے جو کوششیں کی ہیں وہ ایسی بے بہا اور بیش قیمت ہیں کہ دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملے گی۔ تدوین حدیث کا آغاز دور صحابہ سے ہی اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور سے باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا تھا۔ آگے کے ادوار میں بھی یہ تدوین حدیث کا عمل پورے تسلسل، جوش اور تندہی کے ساتھ روبہ ارتقاء رہا۔ تیسری صدی ہجری کے اختتام تک یہ عمل اپنے پختگی اور کمال کو پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف موضوعات کے تحت حدیث کے مجموعے تیار ہوئے اور ان میں کچھ کتابوں کو عوام وخواص میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

قرآن کریم کے بعد چھ ایسی کتابیں ہیں جنہیں صحیح ترین کتابیں شمار کیا جاتا ہے، جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے ان صحاح ستہ میں ست دوسب سے مقبول و معروف کتابیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا ہم اس اکائی میں تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ:

- حدیث کی مشہور کتاب صحیح بخاری کی خصوصیات کے بارے میں واقفیت حاصل ہو۔
- صاحب صحیح بخاری کے احوال و کوائف اور علمی خدمات کا جائزہ لینے کا موقعہ مل سکے۔
- مسلم شریف کی تصنیفی خصوصیات اور اس کی تالیف کے اسباب کا جائزہ لے سکیں۔
- صحیح مسلم کے مصنف کی حیات وخدمات پر گفتگو کر سکیں۔
- صحیحین کی مختلف شروح و تعلیقات کے بارے میں علم ہو سکے۔

15.2 صحاح ستہ

آپ نے پچھلی اکائی میں پڑھا کہ حدیث کی مشہور کتابیں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں کچھ کتابیں ایسی ہیں جن کو شہرت دوام حاصل ہوئی اور جو ہر زمانے اور ہر دور میں یکساں طور پر مقبول رہیں۔ حدیث کی چھ صحیح ترین کتابوں کو صحاح ستہ کہتے ہیں۔ صحاح ستہ یا کتب ستہ میں درج ذیل کتابیں شمار ہوتی ہیں۔

1۔ صحیح بخاری، 2۔ صحیح مسلم، 3۔ جامع ترمذی، 4۔ سنن ابوداؤد، 5۔ سنن نسائی، 6۔ سنن ابن ماجہ۔

ان میں سب سے بلند پایہ کتاب امام بخاری کی صحیح بخاری ہے۔ اس کے بعد یہ رتبہ صحیح مسلم کو حاصل ہے۔

15.3 صحیح بخاری

صحیح بخاری کا اصل نام 'الجامع الصحیح المسند من امور رسول اللہ و سننه و ایامه' ہے۔ اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کی جامعیت اور صحت کو دیکھتے ہوئے اس کا اس سے بہتر کوئی دوسرا نام نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک ایسے دور میں جب حدیثوں کی کتابت اور تدوین کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا' امام بخاری پہلے شخص ہیں جنہوں نے احادیث کے بے شمار مجموعوں میں سے صرف صحیح ترین حدیثوں کو چھان پھٹک کر اکٹھا اور یکجا کیا۔

15.3.1 احادیث اور ابواب وغیرہ کی تعداد

صحیح بخاری میں تقریباً دس ہزار (بعض کے مطابق نو ہزار) حدیثیں ہیں جو چھ لاکھ حدیثوں میں سے منتخب کر کے لکھی گئی ہیں۔ امام نووی اور شیخ ابن صلاح کے مطابق بخاری میں کل سات ہزار دو سو پچھتر (7275) حدیثیں ہیں اور ان میں اگر مکررات کو حذف کر دیا جائے تو کل چار ہزار حدیثیں (4000) بچ رہتی ہیں۔ صحیح بخاری میں کتابوں کی تعداد 160 ہے اور تراجم ابواب تین ہزار چار سو پچاس کی تعداد میں ہیں۔ امام بخاری نے اپنے جن شیوخ سے صحیح بخاری کے اندر حدیثیں لی ہیں ان کی تعداد دو سو نواسی (279) ہے۔ مختلف مورخین کے نزدیک ان کی تعداد مختلف ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب کو ابواب و موضوعات پر ترتیب دیا ہے، 97 مرکزی عنوان ہیں، یہ کتاب 'کیف کان بدأالوحی' سے شروع ہوتی ہے اور 'کتاب التوحید' پر ختم ہوتی ہے۔

صحیح بخاری میں 22 روایتیں ایسی ہیں جو نبی کریم ﷺ سے صرف تین واسطوں کے ذریعے امام بخاری تک پہنچتی ہیں۔ انہیں ثلاثیات کہتے ہیں اور امام صاحب کو ان پر بڑا فخر تھا۔ ان میں سے گیارہ روایات مکی بن ابراہیم سے، چھ امام ابو عاصم النبیل سے تین محمد بن عبداللہ الانصاری سے ایک خلاد بن یحیٰی سے اور ایک عصام بن خالد الحمصی سے مروی ہیں۔

15.3.2 صحیح بخاری کی خصوصیات

صحیح بخاری حدیث کی پہلی کتاب ہے جس میں حدیث کی صحت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا۔ امام بخاری نے انتہائی محنت اور کوشش

کے ذریعہ پہلے لاکھوں حدیثیں جمع کیں، پھر ان پر ناقدانہ نظر ڈالی اور حدیث کے اصول و قواعد کو استعمال کرتے ہوئے ان میں سے تقریباً دس ہزار حدیثوں کا انتخاب کر کے انہیں ایک جلد میں جمع کر دیا۔ صحیح بخاری کی تدوین کے لیے امام بخاری نے سب سے پہلے حدیثوں کے درجے مقرر کیے، ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا اور کوشش کی کہ صحت و سند کے اعتبار سے مستفیض، متواتر اور حسن حدیثیں جمع کی جائیں، اس کے بعد صحیح حدیثوں کو لیا جائے مگر صحیح سے نیچے درجے کی حدیثوں (مثلاً مطلق حسن) کو صحیح بخاری میں جگہ نہ دی جائے۔ گو اس طرح کا التزام صحاح ستہ کی بقیہ پانچ کتابوں میں بھی ان کے مؤلفین نے کیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مؤطا امام مالک بھی اس خصوصیت میں ان کی شریک ہے لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اس التزام کو جس خوبی اور عمدگی کے ساتھ امام بخاری نے برتا ہے اس کی نظیر حدیث کے کسی بھی دوسرے مجموعے میں نہیں ملتی۔

صحیح بخاری کی ترتیب فقہی ہے اور ترتیب احادیث میں فقہی فوائد کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بخاری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی احادیث سے امام بخاری اس زمانے کی معاشرت کا بھی پتہ لگاتے ہیں اور معمولی واقعات سے نہایت مفید نتائج نکالتے ہیں۔ علما تحقیق و تنقید اور چھان بین کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بخاری حدیث کی وہ واحد کتاب ہے جس میں سب سے کم ضعیف حدیثیں ہیں۔ اس طرح صحیح بخاری حدیث کی صحت، احتیاط، قوت رواۃ، اتصال اسناد اور اس قسم کی دوسری بہت سی بے نظیر خوبیوں کے سبب علماء حدیث کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار پاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی نے اپنی کتاب ''محدثین عظام حیات و خدمات'' میں صحیح بخاری کی خصوصیات کو ان الفاظ میں پرویا ہے۔

- ❖ صحیح بخاری کی تالیف مقصد صحیح احادیث کو ہی جمع کرنا نہیں ہے بلکہ تراجم ابواب پر استدلال اور صحیح احادیث سے مسائل فقہیہ کا استخراج واستنباط بھی ہے چنانچہ وہ سب سے پہلے ترجمۃ الباب میں آیات قرآنیہ لاتے ہیں اور بعض اوقات آثار صحابہ و تابعین اور ارشادات ائمہ سے اس کی تائید کرتے ہیں پھر اس باب کے تحت پوری سند کے ساتھ حدیث درج کرتے ہیں۔
- ❖ امام بخاری کسی ایک باب کے تحت احادیث کثیرہ بیان کرتے ہیں اور کبھی صرف ایک حدیث ذکر کرتے ہیں یہ اس صورت میں جب انہیں ترجمۃ الباب کے لیے اپنی شرائط پر احادیث مل جائیں ورنہ ترجمۃ الباب کے تحت کسی حدیث کا ذکر نہیں کرتے بلکہ کسی حدیث کے بعینہ الفاظ یا اس کے ہم معنی الفاظ کو عنوان بنا کر اشارہ کرتے ہیں کہ اس عنوان کے تحت شرائط کے مطابق حدیث نہ مل سکی۔
- ❖ بخاری کبھی ایک ہی حدیث کو متعدد جگہ ذکر کرتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد ان متعدد مسائل کا استنباط ہوتا ہے جن ابواب سے متعلق وہ اس حدیث کو لاتے ہیں۔
- ❖ امام بخاری کا معمول ہے جب حدیث میں کوئی غریب لفظ آتا ہے جس کی نظیر کتاب اللہ میں موجود ہے تو اس کی وضاحت میں مفسرین کے اقوال نقل کرتے ہیں۔
- ❖ امام بخاری ہر کتاب کے شروع میں اس کے زمانہ نزول اور مشروعیت کی ابتدا جانب کبھی کبھی اشارہ کرتے ہیں۔

امام بخاری کتاب کے اختتام پر کوئی نہ کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں جس سے ختم کتاب کی جانب اشارہ ہوتا ہے۔

15.3.3 صحیح بخاری کی شرحیں

حدیث کی کتابوں میں جتنی مقبولیت اور شہرت صحیح بخاری کو حاصل ہوئی کسی بھی دوسری کتاب کو نہیں ملی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں اس کتاب کی شرحیں لکھی گئیں اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے۔ صاحب کشف الظنون نے صحیح بخاری کی 53 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان کے مشہور عالم حدیث مولانا عبد السلام مبارکپوری نے سیرۃ البخاری میں اس کی 143 شرحوں کے نام لکھے ہیں۔ ایک پاکستانی اسکالر محترمہ غزالہ بٹ نے اپنے ایم اے کے مقالے (برائے پنجاب یونی ورسٹی لاہور، 1969ء) میں بخاری کی دوسو سات شرحوں اور حواشی کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک ترجموں کا تعلق ہے صرف اردو زبان میں ہی اس کے 27 تراجم (تعداد اس سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے) معلوم وموجود ہیں۔ صحیح بخاری میں تراجم ابواب کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن ان سے صحیح استفادہ صاحب بصیرت علما و دانشور ہی کرسکتے ہیں۔ صحیح بخاری کی شرح بہت سارے لوگوں نے کی ہے لیکن سب سے زیادہ مشہور اور قبولیت جس شرح کو حاصل ہے وہ حافظ ابن حجر کی ''فتح الباری'' ہے۔

15.3.4 صحیح بخاری کی مقبولیت

امام بخاری کی تصنیف ''الجامع الصحیح'' جو آج صحیح بخاری کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ اس کتاب کی بلندی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امت مسلمہ اس کتاب کو مایہ ناز تصور کرتی ہے اور یہ یقین کرتی ہے کہ اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال و تقریرات جس تنقید و تحقیق کے ساتھ جمع کیے گیے ہیں اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ جن اسباب کی بنا پر مسلمانوں نے امام بخاری کو محدثین کا امام وامیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا اس میں یہ کتاب شامل ہے۔ ابتدا زمانہ سے لے کر آج تک اسلام میں نہ کسی فقیہ، محدث اور امام کی تالیف کو یہ مرتبہ ومقام حاصل ہوا جو امام بخاری کو حاصل ہے۔ اسلام میں کتاب اللہ کے بعد جس تالیف کے سامنے اسلامی دنیا سر تسلیم خم کرتی ہے وہ ''الجامع الصحیح'' ہے۔

صحیح بخاری کا مقام فن حدیث کی تمام کتابوں میں سب سے اعلی ہے۔ اس کتاب کی قبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانے تک صحیح بخاری کی بہت ساری شرحیں لکھی گئیں جس کی تعداد سینکڑوں سے بھی زیادہ ہے اور تمام اہل علم نے کوئی پہلو یا کوئی موضوع ایسا نہیں چھوڑا جس کو تحریر میں نہ لایا ہو۔ کسی نے نحوی تحقیقات کی تو کسی نے تراجم ابواب پر تو کسی نے لغات سے بحث کی اور کسی نے رجال سے کسی نے تعلیقات کو موصول کیا۔ کسی نے متابعات سے بحث کی تو کسی نے استخراج کیا لیکن امام بخاری کے دقیق خیال اور لطیف استدلال تک شاذ ونادر ہی لوگ پہنچ سکے۔ صحیح بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال ہی نہیں بلکہ قرآن کے اکثر مشکل مقامات کی تفسیر بھی درج ہے۔ امام بخاری کی اس تصنیف کو آج بھی وہی قبولیت حاصل ہے جس سے امت مسلمہ روحانی و دنیاوی دونوں حیثیت سے استفادہ کرتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجۃ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ: ''جو شخص اس کتاب کی عظمت کا قائل نہ ہو وہ

مبتدع ہے اور مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔"

15.3.5 وجہ تالیف

حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم سے جب باقاعدہ تدوین حدیث کا کام شروع ہوا تو لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آناً فاناً احادیث کا ایک دفتر تیار ہو گیا۔ ابتدائی دور میں تدوین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ ہر باب کو علیحدہ اجزا میں بلکہ ہر قسم کے آثار واحادیث کو بلالحاظ اکٹھا کر دیتے۔ بعد کے دور میں امام مالک نے موطا میں اہل حجاز کی قوی قوی حدیثیں لے آئے۔ لیکن جب کچھ اور ترقی ہوئی تو لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ صرف حدیث نبوی جمع کریں تو لوگوں نے اپنی اپنی مسندیں جمع کیں۔ امام بخاری نے ان تصانیف کا بغور جائزہ لیا ان کو جانچا اور پرکھا اور ان میں ہر قسم کی صحیح اور ضعیف حدیثوں کو مخلوط پایا تو انہوں نے عزم کیا کہ صرف صحیح صحیح حدیث کو جمع کریں جس کی بابت کسی کو کوئی شک نہ ہو۔ اس کے علاوہ ابراہیم بن معقل نسفی (کچھ اوراق کو چھوڑ امام بخاری سے پوری بخاری کا سماع کیا ہے) فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے بیان کیا "ہم لوگ ایک روز امام اسحاق بن راہویہ (اساطین امت میں شمار کے جاتے ہیں جنہوں نے دینی علوم خصوصاً تفسیر وحدیث کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں) کی خدمت میں حاضر تھے۔ آپ نے فرمایا: "لو جمعتم كتاباً مختصرالصحيح سنة النبي صلى الله عليه وسلم"، کاش نبی ﷺ کی صحیح حدیثوں سے ایک مختصر کتاب تم جمع کرتے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ: "فوقع ذلک فی قلبي" میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور اسی وقت جامع صحیح کی تدوین شروع کر دی۔ ایک اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ "امام بخاری نے جناب رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ میں آپ کے حضور میں کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے جس سے میں آپ کے اوپر سے مکھیوں کو ہانک رہا ہوں"۔ جب معبرین سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے یہ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جن جھوٹی حدیثوں کی نسبت کی جاتی ہے تم ان کو رفع کرو گے۔ اس متبرک خواب نے امام بخاری کے شوق کو دوبالا کر دیا اور آپ جامع صحیح کی تالیف میں ہمہ تن مشغول رہے۔

15.3.6 مدت و کیفیت تالیف

صحیح بخاری کو امام بخاری نے کب اور کتنے وقت میں تالیف کیا اور کتاب کو تالیف کرتے وقت کیا کیفیت تھی اس بابت وراق (امام بخاری کے کاتب محمد بن ابی حاتم) نے امام صاحب کا ایک قول نقل کیا ہے: میں نے جامع صحیح کو سولہ برسوں میں لکھا۔ مزید فرمایا کہ جامع صحیح کو میں نے تین بار تالیف کیا۔ اسی طرح ابو الهيشم کشمهینی فرماتے ہیں: میں نے امام فربری سے سنا، وہ امام بخاری کا یہ قول بیان کرتے ہیں کہ میں نے کوئی حدیث الجامع الصحیح میں اس وقت تک شامل نہیں کی جب تک وضو کر کے دو رکعت نماز نہ ادا کی ہو۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ میں نے اس کو مسجد (بیت اللہ) میں تالیف کیا۔ دو رکعت پڑھ کر ہر حدیث پر استخارہ کرتا، جب مجھے پوری طرح اس کی صحت کا یقین ہو جاتا تو الجامع الصحیح میں درج کر دیتا۔ اس کو میں نے اپنی نجات کے لیے حجت بنایا ہے۔

علامہ ابن عدی اپنے شیوخ کی ایک جماعت سے ناقل ہیں کہ امام بخاری نے الجامع الصحیح کے تراجم ابواب کو حجرہ نبوی اور منبر کے

درمیان میں بیٹھ کر لکھا اور ہر ترجمہ الباب کو دو رکعت نماز پڑھ کر لکھتے تھے۔ وراق نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ میں امام بخاری کے ساتھ تھا میں نے آپ کو کتاب التفسیر لکھنے میں دیکھا کہ رات میں پندرہ بیس مرتبہ اٹھتے اور چقماق سے آگ روشن کر کے چراغ جلاتے اور حدیثوں پر نشان لگا کر سو جاتے۔ اس سے اندازہ لگتا ہے کہ امام صاحب سفر و حضر ہر جگہ برابر اس کی دھن میں رہتے تھے اور جب کسی حدیث کے صحیح ہونے کا یقین ہو جاتا تو اس کی نشان دہی فرما دیتے۔ ابو جعفر عقیلی کہتے ہیں کہ امام بخاری نے صحیح بخاری کی تالیف مکمل کر کے اس وقت کے شیوخ کے سامنے پیش کیا جن کا فضل و کمال مسلمانوں میں تسلیم شدہ تھا اور بڑے پایہ کے لوگ شمار کیے جاتے تھے۔ سب نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور بالاتفاق صحت کی شہادت دی۔

15.4 امام بخاری: مختصر حالات زندگی

امام بخاری کا پورا نام محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ ہے۔ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے اور ان کے جد اعلیٰ بردزبہ فارس (ایران) کے رہنے والے اور مذہباً مجوسی تھے۔ ان کے بیٹے مغیرہ نے اسلام قبول کر لیا۔ امام صاحب کے خاندانی احوال کچھ زیادہ نہیں معلوم لیکن ان کے والد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا شمار معتبر محدثین میں ہوتا تھا۔ امام بخاری اپنے نام سے زیادہ اپنے وطن کی نسبت سے مشہور ہیں۔ بخارا ان کا وطن ہے اسی لیے بخاری کہلاتے ہیں۔ وہیں پر دوسری صدی ہجری کے اواخر یعنی 194ھ /810ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ انہیں اور ان کے بڑے بھائی کو لے کر مکہ چلی گئیں اور وہیں پر امام صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں فقہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علم حدیث کی جانب متوجہ ہوئے اور اپنے زمانے کے باکمال اساتذہ سے اس فن کی تعلیم حاصل کی جن میں اسحاق بن راہویہؒ اور علی بن المدینیؒ کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ امام بخاریؒ نے اپنے دور کے مسلم دنیا کے تمام اہم شہروں مثلاً بغداد، بصرہ، خراسان، کوفہ، خوارزم، حجاز اور شام ہر مقام پر پہنچ کر اور سفر کی مشکلات برداشت کر کے وہاں کے ائمہ فن سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تکمیل تعلیم سے پہلے ہی ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔

15.4.1 امام بخاری کا حافظہ

امام بخاری کا حافظہ بہت قوی تھا۔ استاد سے جو حدیث بھی سنتے فوراً یاد کر لیتے۔ ابتدا میں کتابت حدیث کے سخت خلاف تھے لیکن بعد میں ضروریات زمانہ کے تحت انہوں نے اپنی رائے بدل لی۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن میں ان کو ستر ہزار حدیثیں یاد تھیں جس کتاب پر ایک بار نظر ڈال لیتے وہ ذہن میں محفوظ ہو جاتی۔ وراق فرماتے ہیں کہ میں نے امام بخاری سے پوچھا کہ آپ کے دل میں جس وقت حدیث کے حفظ کرنے کا شوق ابھرا اس وقت آپ کی عمر کیا تھی۔ فرمایا دس سال یا اس سے بھی کم۔ اسی عمر سے امام بخاری محدثین کے حلقہ درس میں شامل ہونے لگے تھے۔ ابتدا میں ہی ایک واقعہ پیش آیا کہ علامہ داخلی (بخارا میں بڑے پایہ کے محدث شمار کیے جاتے تھے) نے ایک حدیث کی سند پیش کی۔ جس کی بابت امام بخاری نے اعتراض کیا۔ اس سے استاذ علامہ داخلی چونک پڑے اور ناگواری کا اظہار فرمایا تو امام بخاری نے متانت

سے عرض کیا کہ اگر آپ کے پاس اصل ہے تو رجوع فرمالیں۔ علامہ داخلی گھر گئے اور اصل کی طرف رجوع کیا تو ان کو احساس ہوا اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے۔ علامہ داخلی نے امتحاناً اس سند کی تصحیح کا سوال امام بخاری سے دریافت کر لیا، جس پر امام بخاری نے برجستہ اس حدیث کی صحیح سند بیان کر دی۔ جس کو استاذ محترم نے قبول کیا اور اپنی غلطی کو تسلیم کیا۔ اس واقعے کے وقت امام بخاری کی عمر گیارہ سال تھی۔

امام بخاری کی ذہانت و قوت حافظہ کا امتحان لینے کے لیے بغداد کے محدثین نے اس بات پر اتفاق کر کے سو حدیثوں کو لے کر اس طرح الٹ پلٹ کر دیں کہ ایک حدیث کی سند دوسرے حدیث کے متن میں ملا دیں۔ اسی طرح سے پوری سو حدیثوں کی سند اور متن کو خلط ملط کر کے دس آدمیوں کے ذمہ کیا گیا اور شہر بھر کے تمام اہل علم و محدثین کو جمع کیا گیا۔ منتخب کردہ لوگوں نے دس دس حدیثیں ایک کے بعد ایک پڑھیں جس پر امام بخاری لاادری (مجھے نہیں معلوم) کا جملہ دہراتے رہے۔ جب تمام لوگوں نے حدیثیں سنالیں تو امام بخاری اس وقت کھڑے ہوئے اور پہلے سائل کی طرف مخاطب ہو کر اس کے سوالات کی دس حدیثوں کو ترتیب کے ساتھ غلط کو صحیح سے الگ کر دیا۔ اس طرح آپ نے دسوں سائلین کی پوری سو حدیثوں کو بالترتیب پڑھ کر سنا دیا اور ان کی سندوں کو صحیح کر دیا۔ جسے دیکھ کر اہل بغداد سکتے میں آگیے اور آپ کی یادداشت و خداداد حافظہ کا سب نے اعتراف کیا۔

15.4.2 وفات

مکہ کے علاوہ امام بخاری کا قیام اس دوران بصرہ اور نیشاپور میں رہا جو ان دنوں مختلف علوم و فنون کے بہت بڑے مرکز تھے۔ آخر میں اپنے وطن بخارا آگئے لیکن آخری وقت میں حاکم بخارا سے بعض اختلافات کے سبب ان کو بخارا چھوڑنا پڑا لہذا وہ سمرقند کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں خرتنگ میں آکر رہنے لگے جہاں پہلے سے ہی ان کے کچھ رشتہ دار سکونت پذیر تھے۔ آخر عمر تک وہیں رہے۔ 256ھ / 870 میں انتقال ہوا۔ جنازے میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

امام بخاری سادگی، قناعت اور خودداری کا نمونہ تھے انہوں نے اپنی پوری زندگی نہایت سادگی کے ساتھ گزاری اور کبھی بھی اپنے علم و فضل کو دنیا کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ خوددار ایسے تھے کہ جلاوطنی منظور کر لی مگر علم کی ذلت کو گوارا نہیں کیا۔ امام صاحب کی ایک خاص بات ان کی بے تعصبی اور رواداری ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں انہوں نے ان لوگوں سے روایتیں لی ہیں جو مذہباً اہل سنت کے خلاف تھے۔ اسی طرح ان سے مختلف ممالک اور اطراف کے ہزارہا طلبہ نے حدیث کا درس لیا۔ ان کے درس کی اکثر مجلسیں یا تو مسجد میں ہوتیں یا پھر ان کے گھر کے صحن میں۔ صحیح بخاری کے علاوہ انہوں نے اور کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

(1) التاريخ الكبير، (2) التاريخ الأوسط، (3) التاريخ الصغير، (4) خلق أفعال العباد، (5) رسالة رفع اليدين، (6) رسالة قراءت الفاتحة خلف الإمام، (7) الأدب المفرد، (8) سيرالوالدين، (9) كتاب الضعفاء، (10) الجامع الكبير، (11) التفسير الكبير، (12) كتاب الأشربة۔

15.5 صحیح مسلم

یہ کتاب مشہور محدث امام مسلم کی تالیف ہے۔ کتاب کا پورا نام الجامع الصحیح ہے۔ علمی دنیا میں اسے نمایاں مقام حاصل ہے۔ شہرت و مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی کافی ہے کہ اگرچہ علماء حدیث نے متعدد حیثیتوں سے صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر ترجیح دی۔ اس کے باوجود صحیح مسلم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ہمیشہ بخاری کے ساتھ مسلم کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اور دونوں کتابوں کے لیے صحیحین کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح جو احادیث بخاری اور مسلم دونوں کتابوں میں موجود ہیں انہیں متفق علیہ کہا جاتا ہے۔

صحیح مسلم کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے امام مسلم لکھتے ہیں کہ مجھ سے میرے بعض تلامذہ نے درخواست کی کہ میں احادیث صحیحہ کا ایک ایسا مجموعہ تیار کر دوں جس میں بلا تکرار احادیث کو جمع کیا جائے۔ چنانچہ ان کی درخواست پر اپنی صحیح کی میں نے تالیف کی۔ امام مسلم کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے جن مشائخ کی احادیث کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے ان سب سے انہوں نے بالمشافہ اور براہ راست حدیث کا سماع کیا ہے۔ صحیح مسلم میں انہوں نے صرف اپنی ذاتی تحقیق پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر اس میں صرف ان حدیثوں کو بیان کیا ہے جن کی صحت پر اس وقت کے اکابرین کا اتفاق تھا۔ امام مسلم نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ تحقیق مزید کے لیے کتاب کے مکمل ہو جانے کے بعد اس زمانے کے مشہور محدث ابوزرعہ کی خدمت میں پیش کیا۔ ابوزرعہ اپنے زمانے میں جرح و تعدیل اور علل حدیث کے فن میں امام تسلیم کیے جاتے تھے۔ اور جس روایت کے بارے میں آپ نے کسی علت کی نشان دہی کی، امام مسلم نے اس کو اپنی صحیح سے خارج کر دیا۔ اس طرح پندرہ سال (15) کی لگاتار جدوجہد اور محنت کے نتیجے میں صحیح مسلم کی صورت میں حدیث کا یہ لازوال مجموعہ تیار ہوا۔

صحیح مسلم کا ایک خاص امتیاز اس کا مقدمہ ہے۔ کیوں کہ یہ مقدمہ ایک طرف جرح و تعدیل اور اصول حدیث سے متعلق انتہائی اہم نکتوں کی نشان دہی کرتا ہے تو دوسری جانب مقدمہ مسلم سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ امام مسلم نے جس زمانے میں اپنی صحیح کو مرتب کیا ہے اس وقت احادیث کے معاملے میں عام صورت حال کیا تھی اور کس قدر موضوع حدیثیں عام ہو گئی تھیں۔ امام مسلم نے مقدمے میں ان کے اسباب و وجوہات پر سے پردہ ہی نہیں اٹھایا ہے بلکہ ایسے مشکل حالات میں صحیح مسلم کو مرتب کر کے ان کا صحیح معنوں میں تدارک کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

15.5.1 صحیح مسلم کی خصوصیات

صحیح مسلم میں امام مسلم نے صرف وہ حدیثیں لی ہیں جو بالکل صحیح ہوں، اور جن کے راوی یا بیان کرنے والے متقن، حافظ، ضابط اور ثقہ تسلیم کیے گیے ہوں۔ امام مسلم نے صحیح مسلم میں حدیثوں کا انتخاب صرف محدثانہ اصولوں کے پیش نظر کیا ہے۔ اسی لیے اس میں تعلیقات اور منقطع روایتیں نہیں کے برابر ہیں۔ صحیح مسلم میں راوی کے نام، کنیت، صفت یا نسب میں اختلاف ہونے کی صورت میں اس اختلاف کو بیان کر دیا گیا ہے۔ صحیح مسلم کی روایتوں میں زبان و بیان کی پیچیدگیاں نہیں ہیں۔ صحیح مسلم کا طرز اور اسلوب ادا واضح اور قریب الفہم ہے۔ صحیح مسلم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں روایتوں کے بیان کرنے میں ہی صحت و قطعیت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے بلکہ

امام مسلم کے بعد جن لوگوں نے صحیح مسلم کی روایت کی ہے وہ بھی انتہائی باکمال لوگ ہیں۔

ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی نے اپنی کتاب "محدثین عظام حیات وخدمات" صحیح مسلم کی خصوصیات کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

- ❖ ہر حدیث کو اس کی مناسب جگہ پر لاتے ہیں اور وہیں اس کے طرق اور متعدد اسانید اور مختلف الفاظ کو جمع کر دیتے ہیں جس سے اس حدیث میں تعدد طرق اور الفاظ سے بسہولت واقفیت ہو جاتی ہے۔
- ❖ روایتوں کے الفاظ کے اختلاف کو اچھی طرح ضبط کرتے ہیں کبھی کسی حروف میں روایتوں کا اختلاف ہوتا ہے جس سے کبھی معنی میں تغیر ہوتا ہے اور کبھی تغیر نہیں ہوتا البتہ بسااوقات یہ تغیر ایسا پوشیدہ ہوتا ہے جس سے صرف ماہر فن ہی آگاہ ہو سکتا ہے لیکن امام صاحب نے پوری کتاب میں اس کا التزام فرمایا ہے۔
- ❖ امام صاحب نے مختلف طرق اور تحویل اسانید کو ایجاز کے ساتھ پیش فرمایا ہے۔ حدیث کے پورے متن کو یکجا بیان فرماتے ہیں اور اس کے پورے الفاظ نقل کرتے ہیں روایت بالمعنی کے بجائے روایت باللفظ بیان فرماتے ہیں اس کو صحابہ یا بعد کے لوگوں کے اقوال کے ساتھ ضم نہیں کرتے۔

صحیح مسلم کی ایک امتیازی خصوصیت حسن ترتیب اور حسن ادا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم حدیث کی باریکیوں اور اسرار سے کس درجہ واقف تھے۔

15.5.2 احادیث اور ابواب

صحیح مسلم میں خود مصنف نے تراجم ابواب کو نہیں لکھا ہے لیکن اپنی کتاب کو حسن ترتیب کے ساتھ ابواب کا لحاظ کرتے ہوئے مرتب کیا ہے۔ حالانکہ بعد میں لوگوں نے تراجم اور عناوین کو درج کر دیا ہے جو کہ مسلم کی شروحات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ صحیح مسلم میں 54 مرکزی عنوان اور ان کے ذیل میں 1329 ابواب ہیں۔ اس کتاب کا آغاز 'کتاب الایمان' سے ہوتا ہے اور اختتام 'کتاب التفسیر' پر ہوتا ہے۔

امام مسلم فرماتے ہیں کہ اس کتاب کو تین لاکھ احادیث سے انتخاب کرکے چار ہزار احادیث (حذف مکررات کے بعد) لی ہیں۔ حکیم سید احمد اللہ ندوی نے اپنی تصنیف "تاریخ حدیث ومحدثین" میں صحیح مسلم کی تعداد کے بابت فرماتے ہیں: صحیح مسلم میں چار ہزار غیر مکرر حدیثیں درج ہیں اور مکرر حدیثوں کو شمار کیا جائے تو حدیثوں کی جملہ تعداد سات ہزار دو سو پچھتر (7275) ہوتی ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کی وجہ سے اس سے استفادہ آسان ہو گیا ہے، انہوں نے تمام تناسب رکھنے والی حدیثوں کو ایک ہی مقام پر رکھا ہے اور اپنی پسند کے مطابق طرق حدیث کا ذکر بھی کیا ہے، عبارت میں اختصار اور نہایت احتیاط کے ساتھ ترتیب کو بہترین طور پر قائم کیا ہے۔ امام مسلم نے اپنے صحیح کے مقدمہ میں احادیث کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

1. پہلی قسم وہ ہے جس کی روایت ایسے حفاظ حدیث سے کی ہے جو اصحاب اتقان ہیں۔

2. دوسری قسم وہ ہے جس کی روایت ایسے حفاظ حدیث نے کی ہے جو حفظ اور اتقان میں متوسط درجے کے ہیں اور مستور بھی ہیں۔
3. تیسری قسم وہ ہے جس کی روایت ضعفاء نے کی ہے اور متروکین میں داخل ہیں۔

امام مسلم نے صحیح مسلم میں پہلی اور دوسری قسم کی احادیث بالاستیعاب یعنی پوری درج کی ہے۔ تیسری قسم کی احادیث میں سے منتخب کر کے لیا ہے۔

15.5.3 صحیح مسلم کی شرحیں

صحیح بخاری کی طرح صحیح مسلم بھی حدیث کی انتہائی اہم اور مقبول کتاب رہی ہے۔ اس کی شہرت اور مقبولیت کا انداز اس سے بھی لگایا جایا سکتا ہے کہ صحیح مسلم کی شرحیں یا تعلیقات لکھنے کے علاوہ اہل علم کے ایک بہت بڑے طبقے نے تالیف حدیث میں ان کی پیروی کی ہے اور صحیح مسلم کے طرز پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ صحیح مسلم کے مستخرجات کی تعداد ہی امام نووی نے آٹھ لکھی ہے۔

صحیح مسلم کی شرحوں کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ صاحب کشف الظنون نے اپنے زمانے تک 15 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ صحیح مسلم کی مختصرات بھی لکھی گئیں اور ان کی شرحیں بھی ہوئیں۔ مستخرجات، شروح اور مختصرات کے علاوہ مختلف زبانوں میں صحیح مسلم کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ صرف اردو زبان میں ہی تقریباً دس ترجموں کا پتہ ملتا ہے۔

15.6 امام مسلم: مختصر حالات زندگی

امام مسلم کا پورا نام مسلم بن حجاج بن مسلم بن ورد ہے۔ ابو الحسین کنیت اور عساکر الدین لقب ہے۔ ان کا سلسلہ نسب عرب کے مشہور قبیلے قشیر سے ملتا ہے۔ اس لیے قشیری بھی کہلاتے ہیں۔ امام مسلم 206ھ / 815 یعنی تیسری صدی ہجری کے آغاز میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں اگر ایک طرف علم حدیث کے بڑے بڑے ائمہ فن اور مجتہدین فن موجود تھے تو دوسری طرف ان کا مولد و مسکن نیشاپور ہر طرح کے علوم وفنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور وہاں پر اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے حدیث کے بڑے ائمہ فن موجود تھے۔

امام مسلم کی ابتدائی زندگی اور شروع کی تعلیم وتربیت کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے کس کے سامنے سب سے پہلے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ہاں اتنا ان کے بارے میں مشہور ہے کہ صرف 12 برس کی عمر سے انہوں نے حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی۔ امام مسلم نے علم حدیث کے حصول کے لئے صرف نیشاپور کے علما پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس زمانے میں سفر کی تمام مشکلات کے باوجود مسلم دنیا کے ان تمام مقامات کی خاک پیمائی کی جہاں جہاں کہ انہیں علم حدیث کا نور مل سکتا تھا۔ چنانچہ امام مسلم نے رے، عراق، حجاز، مصر وغیرہ علاقوں کا سفر کیا اور ان علاقوں کے شہروں میں موجود ائمہ حدیث سے استفادہ کیا۔ امام بخاری جن دنوں نیشاپور میں مقیم تھے۔ امام مسلم نے ان سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ ان کے مشہور اساتذہ میں اسحاق بن راہویہ، ابو حاتم، ابوزرعہ اور امام احمد بن حنبل شامل ہیں۔

امام مسلم کو اپنے زمانے میں بہت زیادہ شہرت اور ناموری حاصل ہوئی۔ ان کی فطری قابلیت اور قوت حافظہ کا اعتراف خود ان کے اساتذہ نے کیا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں گو بڑے بڑے ماہرین فن موجود تھے لیکن وہ امام مسلم سے روایتوں کو بیان کرنے میں ذرا بھی نہ شرماتے تھے۔ اسی طرح ان کے کئی ہم عصروں نے ان کی تالیف صحیح مسلم کی پیروی اور تائید میں اسی کے طرز پر حدیث کی کتابیں تالیف کیں۔ غرض امام مسلم کی شہرت و مقبولیت اتنی زیادہ تھی کہ کچھ لوگوں نے ان کو امام بخاری پر بھی ترجیح دی ہے۔

امام مسلم کی وفات کا واقعہ بھی حیرت انگیز ہے اور علم حدیث کے تئیں ان کے شوق اور دل چسپی کا مظہر ہے۔ ہوا یہ کہ ان کی مجلس میں لوگوں نے ان سے ایک حدیث پوچھی جو انہیں یاد نہ تھی، گھر آکر انہوں نے اپنے ذخیرہ حدیث میں اس حدیث کو تلاش کرنا شروع کیا۔ پاس ہی کھجور کا ایک ٹوکرا رکھا ہوا تھا تلاش کے دوران امام صاحب کھجوریں نکال نکال کر کھاتے جاتے تھے۔ تلاش حدیث میں اس قدر منہمک تھے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ کتنی کھجوریں کھالیں، اور اسی وجہ سے ان کی موت ہوگئی۔ اس طرح 261ھ / 875 میں آسمان علم حدیث کا یہ درخشاں و تابندہ ستارہ صرف 55 برس کی عمر میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگیا۔ نیشاپور کے باہر ایک مقام مصر آباد میں سپرد خاک ہوئے۔

15.6.1 تصانیف و تالیف

امام مسلم کو تصنیف و تالیف کے کام سے فطری لگاؤ تھا۔ درس و تدریس کے کام میں مشغول ہونے کے باوجود انہوں نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں۔ صحیح مسلم تو ان کا علمی شاہ کار ہے ہی۔ اس کے علاوہ بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جن کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے:

(1) مسند کبیر، (2) الاسماء والکنی، (3) جامع کبیر، (4) کتاب العلل، (5) کتاب التمییز، (6) کتاب الوحدان، (7) کتاب الافراد، (8) کتاب الاِقران، (9) کتاب سوالا ته لأحمد بن حنبل، (10) کتاب حدیث عمرو بن شعیب، (11) کتاب الانتفاع بإهاب السباع، (12) کتاب مشائخ مالک، (13) کتاب مشائخ ثوری، (14) کتاب مشائخ شعبہ، (15) کتاب المخضرمين، (16) کتاب أولاد الصحابه، (19) کتاب أوهام المحدثين، (18) کتاب الطبقات۔

کتابوں میں موضوعات کے تنوع اور وسعت سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام مسلم علم و فضل کے کس مرتبے اور مقام پر فائز تھے اور انہوں نے حدیث و علم حدیث کی کتنی زیادہ خدمت کی ہے۔

15.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- حدیث کی چھ صحیح ترین کتابوں کو صحاح ستہ کہتے ہیں ان میں سب سے بلند پایہ کتاب امام بخاری کی صحیح بخاری ہے۔ یہ حدیث کی پہلی کتاب ہے جس میں حدیث کی صحت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا۔ امام بخاری نے انتہائی محنت اور کوشش کے ذریعہ پہلے لاکھوں حدیثیں

جمع کیں، پھر ان پر ناقدانہ نظر ڈالی اور حدیث کے اصول و قواعد کو استعمال کرتے ہوئے ان میں سے تقریباً دس ہزار حدیثوں کا انتخاب کر کے انہیں ایک جلد میں جمع کر دیا۔

- صحیح بخاری میں 22 روایتیں ایسی ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف تین واسطوں کے ذریعے امام بخاری تک پہنچی ہیں۔ جن کو ثلاثیات کہا جاتا ہے۔
- صحیح مسلم مشہور محدث امام مسلم کی تالیف ہے۔ جس میں امام صاحب نے مقدمہ درج کیا ہے جو جرح و تعدیل اور اصول حدیث سے متعلق انتہائی اہم نکتوں کی نشان دہی کرتا ہے تو دوسری طرف امام مسلم نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ صحیح مسلم کے مرتب کرتے وقت احادیث کے معاملے میں عام صورت حال کیا تھی اور کس قدر موضوع حدیثیں عام ہو گئی تھیں۔

15.8 نمونہ امتحانی سوالات

15.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. صحیح بخاری میں ثلاثیات کی تعداد کتنی ہے؟

(a). 22 (b). 32 (c). 86 (d). 12

2. "فتح الباری" کس حدیث کی کتاب کی شرح ہے؟

(a). صحیح بخاری (b). جامع ترمذی (c). سنن ابن ماجہ (d). موطا امام مالک

3. امام بخاری کہاں پیدا ہوئے؟

(a). طوس (b). خرتنگ (c). بخارا (d). ان میں سے کوئی نہیں

4. امام بخاری کا انتقال کب ہوا؟

(a). 875 (b). 870 (c). 810 (d). 970

5. امام بخاری نے اپنی آخری عمر کہاں گزاری؟

(a). بخارا (b). شیراز (c). بغداد (d). خرتنگ

6. امام بخاری کے جد اعلیٰ مذہباً کیا تھے؟

(a). مجوسی (b). مسلم (c). یہودی (d). عیسائی

7. صحیح مسلم کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a) ابو عبد اللہ محمد بن اسمعیل. (b). ابو الحسین مسلم بن حجاج (c). امام مالک بن انس (d). امام احمد بن حنبل

8. صحیح مسلم کا مجموعہ تیار کرنے میں کتنا وقت لگا؟

(a). 12سال | (b). 15 سال | (c). 5سال | (d). ایک بھی نہیں

9. صحیح مسلم کس فن کی کتاب ہے؟

(a). علم رجال | (b). جرح وتعدیل | (c). حدیث | (d). علل الحدیث

10. قشیری کالقب کس امام کے لیے استعمال ہوتا ہے؟

(a). امام مالک | (b). امام مسلم | (c). امام ترمذی | (d). امام نسائی

15.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. امام بخاری کے حالات زندگی کا تذکرہ کیجیے۔
2. صحیح بخاری کی وجہ تالیف و کیفیت تالیف کا بیان کیجیے۔
3. صحیح مسلم کی خصوصیات کا تعارف کرایے۔
4. امام مسلم کے حالات زندگی پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
5. صحیح بخاری و مسلم کی شرحیں اور اس کی قبولیت پر مختصر نوٹ لکھیے۔

15.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. صحیح بخاری کا تعارف اس کی خصوصیات کے حوالہ سے لکھیے۔
2. صحیح مسلم پر ایک تعارفی نوٹ لکھیے۔
3. صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی خصوصیات کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔

15.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تدوین حدیث : مولانا مناظر احسن گیلانی
2. تذکرۃ المحدثین : غلام رسول سعیدی
3. تذکرۃ المحدثین : مولانا ضیاء الدین اصلاحی
4. علم حدیث: ایک تعارف : محمد فاروق خاں

معروضی سوالات کے جوابات

1. A	2.A	3. C	4. B	5. D
6. A	7.B	8.B	9. C	10. B

اکائی 16: سنن اربعہ ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ کا تعارف

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 جامع ترمذی

16.2.1 جامع ترمذی کی خصوصیات

16.2.2 امام ترمذی: مختصر حالات زندگی

16.3 سنن ابی داؤد

16.3.1 سنن ابی داؤد کی خصوصیات

16.3.2 امام ابو داؤد سجستانی: مختصر حالات زندگی

16.4 سنن نسائی

16.4.1 سنن نسائی کی خصوصیات

16.4.2 امام ابو عبد الرحمن نسائی: مختصر حالات زندگی

16.5 سنن ابن ماجہ

16.5.1 سنن ابن ماجہ کی خصوصیات

16.5.2 امام ابن ماجہ: مختصر حالات زندگی

16.6 فرہنگ

16.7 اکتسابی نتائج

16.8 نمونہ امتحانی سوالات

16.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

16.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

16.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

16.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

صحاح ستہ سے مراد حدیث کے چھ مشہور و معروف مستند مجموعے ہیں جن کو عرف عام میں 'صحاح ستہ' یا 'کتب ستہ' کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کے بعد شریعت کا سب سے بڑا اور اہم ماخذ حدیث پاک ہے۔ صحاح ستہ کو اسلامی تعلیم سمجھنے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آپ نے پچھلی اکائیوں میں ان میں سے دو کتب صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور ان کے مصنفین کے بارے میں تفصیلا پڑھا۔ اس اکائی میں ہم صحاح ستہ کی چار دیگر کتابوں و سنن کے نام سے معروف ہیں ان کے بارے میں تفصیلا پڑھیں گے۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ:

- حدیث رسول ﷺ کی ان چار اہم اور بنیادی کتابوں کے بارے میں معلومات ہو جائے جنہیں کتب حدیث میں امہات کا درجہ حاصل ہے اور جو بخاری اور مسلم کے بعد حدیث کی معتبر اور مستند ترین کتابیں باور کی جاتی ہیں۔
- جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کی خصوصیات اور ان کتابوں سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- ان چاروں سنن کے مرتبین کے کارناموں اور کاوشوں سے متعارف ہوں۔

16.2 جامع ترمذی

جامع ترمذی امام ترمذی کی مشہور و معروف تالیف ہے۔ اس کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اس کا نام الجامع الصحیح ہے۔ ترمذی کے جامع ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں ہاں صحیح ہونے پر اعتراض کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں، لیکن چوں کہ زیادہ روایتیں صحیح ہیں اس لیے غالب کا خیال کرتے ہوئے اس کو الجامع الصحیح کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ ترمذی کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، اس لئے کچھ لوگ اسے سنن میں شمار کرتے ہیں اور اس کا نام سنن ترمذی لکھتے ہیں۔ بہر حال جامع ترمذی کو الجامع الصحیح کہا جائے یا سنن ترمذی اس سے اس کے معیار و کمال میں فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ عام طور پر علماء حدیث نے صحیحین کے بعد جامع ترمذی کو صحاح میں تیسرے درجے پر رکھا ہے۔ جب کہ بعض علماء حدیث نے سنن نسائی اور ابو داؤد کے بعد اس کو پانچویں درجے پر رکھا ہے، کیوں کہ ترمذی قوت سند اور صحت کے اعتبار سے ان کے درجے کو نہیں پہنچتی، ہاں حسن ترتیب، جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے یہ

ان سے بہتر ہے۔

جامع ترمذی میں احادیث کو نقل کرنے میں امام ترمذی نے صحاح کی بنیادی شرطوں یعنی راوی کا اسلام، فہم وفراست، صداقت، عدم تدلیس، عدالت مع جملہ شرائط حفظ، ضبط، تیقظ، عدم وہم، سلامت ذہن اور صحت عقیدہ کو عام طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ البتہ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ روایت (حدیث) پر کسی نہ کسی امام یا محدث کا عمل ہونا چاہیے خواہ راوی اور سند اصول حدیث کی رو سے یکسر نقائص سے پاک نہ ہوں، چنانچہ وہ چوتھے طبقے تک کے راویوں کی روایتیں قبول کرلیتے ہیں اور صحیح، مسلسل اور مرفوع راویتوں کے ساتھ ضعیف، مرسل، منقطع اور مضطرب روایتوں کو بھی رد نہیں کرتے۔ البتہ اس طرح کی روایتوں کو امام صاحب کسی صحیح روایت کی تائید اور حمایت میں قبول کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی خوبی یہ ہے کہ ہر روایت کا عیب وہنر اور نقص وکمال بھی ظاہر کردیتے ہیں۔ اس لیے پڑھنے والے کو اس حدیث کی حیثیت اور درجے کا علم ہو جاتا ہے۔ یہ خصوصیت ترمذی کے علاوہ صحاح کی کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ توابع اور شواہد کے ساتھ جامع ترمذی کی روایات کی تعداد 3956 ہے اور اگر انہیں الگ کر دیا جائے تو احادیث مقصودہ کی تعداد 1385 رہ جاتی ہے۔

16.2.1 جامع ترمذی کی خصوصیات

جامع ترمذی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تمام حدیثوں پر کسی نہ کسی امام، فقیہ یا محدث کا عمل رہا ہے یعنی ترمذی کی ہر روایت کسی نہ کسی عالم کے نزدیک قابل عمل اور قابل حجت ہے۔ (دو حدیثیں اس سے مستثنیٰ ہیں)۔ ترمذی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روایت حدیث میں تکرار بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ امام ترمذی حدیث بیان کرنے کے بعد اس سے متعلق احادیث کی طرف اشارہ ضرور کر دیتے ہیں۔ جامع ترمذی کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جس روایت میں بھی جرح وتعدیل کے اصولوں کے مطابق کوئی کمی ہے، صاحب کتاب نے اس کے عیب وہنر کو ظاہر کر دیا ہے۔ مثلاً لکھ دیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، حسن ہے، ضعیف ہے، مرسل ہے، مضطرب ہے، منقطع ہے، سند قوی نہیں ہے، راوی کے بارے میں کلام ہے وغیرہ۔

جامع ترمذی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فقہی حدیثوں کو بیان کرتے ہوئے وہ فقہاء کے مذاہب، ان کے استنباط، دلائل، اختلافات اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ ترمذی کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس سے فقہی فائدہ اٹھانا آسان ہو گیا ہے۔ جامع ترمذی کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی راویوں کا ذکر کرتے وقت ان کے ناموں، کیفیتوں اور القاب وغیرہ کے اجمال کی تفصیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ جامع ترمذی اپنی انہیں خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ علماء اور عوام کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ ابن اثیر جزری نے لکھا ہے کہ حسن ترتیب، مکررات کی کمی اور فائدے کی زیادتی کے لحاظ سے ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک جامع ترمذی، بخاری مسلم اور ابوداؤد تینوں کی بعض اچھی خصوصیات کی جامع ہے اور اس میں ان سے زیادہ مفید باتیں ہیں۔ جامع ترمذی کی ان خصوصیات کے باوجود بعض محدثین نے اس پر تنقید بھی کی ہے جن میں ابن حزم اور ابن الجوزی کے نام نمایاں ہے۔

ترمذی کی شروحات

جامع ترمذی کی اہمیت اور افادیت کا خیال کرتے ہوئے علماو محدثین نے اس کے ساتھ پورا اعتنا کیا۔ جامع ترمذی کو اللہ تبارک وتعالیٰ

نے بے پناہ مقبولیت بخشی چنانچہ اس کے متعدد شرحیں، مستخرجات اور حواشی لکھے گیے۔ جن میں سے چند مشہور و معروف کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ "عارضۃ الاحوذی بشرح جامع الترمذی" یہ قاضی ابو بکر ابن العربی کی تصنیف ہے یہ شرح متقدمین کے طریقہ پر مختصر ہے لیکن بہت سے علمی فوائد پر مشتمل ہے اور بعد کے شروح ترمذی لکھنے والوں کے لیے مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ "قوت المغتذی" یہ علامہ جلال الدین سیوطی کی مختصر شرح ہے۔ "تحفۃ الاحوذی" یہ قاضی عبد الرحمن مبارکپوری کی تصنیف ہے جو چار جلدوں میں مطبوع ہے حل کتاب کے نقطہ نظر سے یہ بہت اچھی شرح ہے۔ "الکوکب الدرّی علی جامع الترمذی" یہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی تقریر ترمذی ہے جسے ان کے شاگرد مولانا محمد یحیٰ صاحب کاندھلوی نے جمع کیا ہے اور ان کے صاحبزادے مولانا زکریا کاندھلوی نے اس پر مفید حواشی لکھے ہیں۔ ا"لعرف الشذی تقریر جامع الترمذی" یہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی تقریر ترمذی ہے جسے مولانا چراغ محمد نے درس میں قلمبند کیا ہے۔

16.2.2 امام ترمذی: مختصر حالات زندگی

امام ترمذی کا پورا نام محمد بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی ترمذی بوغی ہے۔ کنیت ابو عیسیٰ اور وطن خراسان کا مشہور شہر ترمذ ہے۔ امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی 209ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر دریائے جیحون کے کنارے پر آباد تھا جہاں بڑے بڑے علما اور محدثین پیدا ہوئے اس لیے یہ شہر مدینۃ الرجال کے نام سے بھی شہرت رکھتا ہے اس شہر کے کچھ میل کی دوری پر "بوغ" نامی ایک قصبہ تھا جو امام ترمذی کا وطن ہے اسی نسبت سے امام ترمذی کو بوغی بھی کہا جاتا ہے لیکن شہر ترمذ کی مقبولیت کی وجہ سے اس کی نسبت غالب رہی اور اسی نسبت سے دنیا امام ترمذی کو پہچانتی ہے۔ امام ترمذی کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ لیکن اس زمانے تک خراسان اور ماوراءالنہر کے علاقے علم وفن کے بڑے مرکز بن چکے تھے اور چھوٹے بڑے شہروں میں ہر طرف علوم وفنون کا چرچا تھا۔ اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ امام ترمذی کی ابتدائی تعلیم وتربیت یہیں ہوئی ہوگی۔ ابتدائی صدیوں میں علم حدیث کی حفاظت واشاعت کا جیسا اہتمام مسلمانوں نے کیا کوئی بھی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتی۔ حجاز، عراق، خراسان، ماوراء النہر، شام، مصر، مغرب وغیرہ تمام دنیائے اسلام میں جگہ جگہ حدیث کے بڑے بڑے مراکز قائم ہوگئے تھے۔ جہاں پر حدیث اور اس سے متعلق علوم کی تعلیم ہوتی تھی۔ حجاز کے بعد عراق اور خراسان کے علاقے کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہاں اکثر بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان علاقوں میں علم حدیث کا شوق بہت زیادہ تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد امام ترمذی کو بھی حدیث نبوی کو سیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ چنانچہ انہوں نے خراسان اور ماوراء النہر کے علاوہ بھی دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کا سفر صرف اس مقصد سے کیا کہ زیادہ سے زیادہ حدیثیں سنیں اور سیکھیں۔ امام ترمذیؒ کے اساتذہ میں اکثر محدثین وہ ہیں جن سے اصحاب صحاح نے استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، علی بن حجرؒ، قتیبہ بن سعیدؒ اور ابو بکر محمد بن بشارؒ وغیرہ اکابر سے علم حدیث میں انہوں نے استفادہ کیا۔ امام ترمذی امام بخاریؒ کے خاص تلامذہ میں سے تھے اور ان سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔

قوت حافظہ

امام ترمذی نے حافظہ بہت قوی پایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اپنے زمانے کے بڑے بڑے محدثین سے استفادے کا موقع بھی ملا

جس کی وجہ سے انہوں نے علم حدیث میں وہ مہارت اور کمال پیدا کیا کہ ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور مختلف ماہرین فن حدیث نے ان کو حدیث کا امام لکھا ہے۔ حدیث کے علاوہ امام ترمذی کو تفسیر اور فقہ جیسے علوم میں بھی مہارت حاصل تھی اور وہ صحیح معنوں میں امام بخاریؒ کے جانشین تھے۔ امام بخاری نے اپنے لائق شاگرد کے بارے میں فرمایا کہ تم نے مجھ سے جتنا فائدہ حاصل کیا، اس سے زیادہ میں نے تم سے حاصل کیا۔ امام بخاری نے ان سے ایک حدیث بھی روایت کی ہے۔

قوت حافظہ سے متعلق امام ذہبی ایسا ہی ایک عجیب واقعہ خود ان ہی سے سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے تھے: ''میں مکہ کے راستے میں تھا میں نے ایک شیخ کی احادیث کے جزء لکھے تھے، وہ شیخ مجھے مل گیے تو میں نے ان سے احادیث سنانے کی فرمائش کی تاکہ میں ان اجزاء کا مقابلہ کرلوں، میں نے اپنا سامان جاکر دیکھا تو وہ اجزاء مجھے نہ ملے، ان کی جگہ سادے کاغذ موجود تھے میں وہ لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، شیخ نے حدیثیں سنانی شروع کیں، اچانک ان کی نگاہ سادے کاغذات پر پڑی تو فرمایا: تمہیں شرم نہیں آتی؟ تو میں نے ان کو پورا قصہ سنایا اور عرض کیا کہ وہ حدیثیں مجھے یاد ہو گئیں ہیں، انہوں نے کہا کہ سناؤ، تو میں نے سنا دیں، تو بھی ان کو یقین نہ آیا اور انہوں نے فرمایا کہ تم نے آنے سے پہلے یہ حدیثیں دیکھ لیں ہیں! تو میں نے عرض کیا: اس کے علاوہ حدیثیں سنا دیجیے، تو انہوں نے مجھے دوسری چالیس حدیثیں سنائیں پھر فرمایا کہ اب تم سناؤ، تو میں نے ان کے سامنے وہ حدیثیں دہرا دیں، ایک لفظ کا بھی میں نے فرق نہیں کیا۔ (صحاح ستہ اور ان کے مصنفین امتیازات و خصوصیات، بلال عبد الحیٔ حسنی ندوی ص85)

مورخین کے بیان کے مطابق امام ترمذی نے کثرت سے کتابیں بھی لکھیں لیکن ان میں سے ان کی صرف تین کتابوں کا نام ملتا ہے۔ ان میں سے ایک جامع یا سنن ترمذی ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا۔ امام ترمذی کی دوسری کتاب شمائل ترمذی ہے جس میں حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اخلاق کا بیان ہے۔ امام ترمذی کی اس کتاب کو بھی جامع ترمذی کی طرح لازوال شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ تیسری کتاب کا نام ''کتاب العلل'' ہے۔ مشہور روایت کے مطابق 679ھ میں امام ترمذی نے اپنے وطن میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔

16.3 سنن ابی داؤد

سنن ابی داؤد کا شمار حدیث کی امہات (بڑی) کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ صحاح ستہ میں شامل ہے اور علمائے حدیث کی بڑی تعداد نے صحیحین (بخاری و مسلم) کے بعد سنن ابی داؤد کو حدیث کی سب سے اہم کتاب قرار دیا ہے۔ اس کے مؤلف امام ابو داؤد سلیمان ہیں۔ انہوں نے 5 لاکھ حدیثوں میں سے 4 ہزار آٹھ سو حدیثوں کا انتخاب اس کتاب میں کیا ہے۔ سنن ابی داؤد سنن کی پہلی کتاب ہے۔ اس سے پہلے حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں ان کا تعلق جوامع اور مسانید سے ہے۔ امام ابو داؤد نے سب سے الگ ہٹ کر صرف احکامی حدیثیں اپنی سنن میں جمع کی ہیں۔ گویا اس کی تقریباً 5 ہزار احادیث صرف احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔ سنن ابی داؤد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام ابو داؤد نے مرتب کرنے کے بعد جب اسے امام احمد بن حنبل کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اسے بہت پسند کیا۔ یہی وجہ

ہے کہ سنن ابی داؤد ہر دور میں علماء اور محدثین کے درمیان مقبول و متداول رہی ہے۔ اور لوگوں نے اس پر اعتماد کیا ہے۔

امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ میرے اس مجموعہ احادیث میں صرف 4 حدیثیں انسان کو دین پر عمل کرنے کے لئے کافی ہیں:

1۔ إنما الأعمال بالنيات

(اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے / یا اعمال نیتوں کے ساتھ وابستہ ہیں)۔

2۔ من حسن إسلام المرء تركه مالايعنيه

(یہ آدمی کے اسلام کی خوبی ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے)۔

3۔ لايكون المؤمن مؤمناً حتى يرضى لأخيه مايرضى لنفسه

(مومن اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

4۔ الحلال بين والحرام بين وبين ذلک أمور مشتبهات فمن اتقى الشبهات إستبرأ لدينه

(حلال اور حرام دونوں واضح ہیں اور جو کچھ اس کے درمیان ہے مشتبہات ہیں پس جو شخص مشتبہات سے بچا اس نے اپنے دین کو بے داغ رکھا)۔

پہلی حدیث عبادات کی صحت و درستی کے لئے، دوسری عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت کے لئے، تیسری پڑوسیوں، قرابت داروں، متعارف لوگوں اور دوسرے متعلقین وغیرہ کے حقوق کی ادائی کے لئے اور چوتھی ان تمام شکوک و شبہات کے ازالے کے لئے کافی ہے جو علماء کے اختلافات اور دلائل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

16.3.1 سنن ابی داؤد کی خصوصیات

سنن ابی داؤد کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ احکام و مسائل کے احادیث پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے اس قسم کی کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ صحاح ستہ میں فقہی احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ اس کتاب میں ہے۔ فقہ و استنباط مسائل میں سنن ابی داؤد بہت اہم مرتبہ رکھتی ہے کیوں کہ اس کے مؤلف خود بہت بڑے فقیہ و مجتہد ہیں۔ ترمذی کی طرح سنن ابی داؤد کی بھی بیشتر روایتوں پر علماء اور ائمہ مجتہدین کا عمل رہا ہے۔ اس میں صحیح الاسناد، قوی، متصل اور مرفوع حدیثوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ سنن ابی داؤد کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک ہی سند اور ایک ہی متن میں متعدد متون اور اسانید کو جمع کر دیا گیا ہے اور ہر حدیث کے الفاظ کو علاحدہ علاحدہ بیان کر دیا گیا ہے۔ سنن ابی داؤد میں راویتوں کی تکرار بہت کم ہے۔ جامعیت کے ساتھ اس میں حسن ترتیب و تالیف کا بھی خاص اہتمام پایا جاتا ہے۔ سنن ابی داؤد میں ایک روایت ثلاثی بھی ہے۔ اس میں راویوں کے ناموں، کیفیتوں اور القاب وغیرہ کی وضاحت کے ساتھ ان کے حسن و قبح اور صحت و سقم کی وضاحت بھی ہے۔

شروحات ابی داؤد

صحاح کی دیگر کتابوں کی طرح سنن ابی داؤد کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ یہ چیز سنن ابی داؤد کے مرتبے کو بلند کرتی ہیں اور صحاح میں اس کو ایک خاص مقام عطا کرتی ہیں۔ سنن ابی داؤد کی افادیت کے مد نظر ہر دور کے علما کرام نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے سنن ابی داؤد کی شروحات، تلخیصات، تعلیقات اور مستخرجات کثرت سے لکھی گئیں جس کی مجموعی تعداد چالیس کے اوپر شمار کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلی شرح ''معالم السنن'' ہے جس کی تالیف امام ابو سلیمان حمد بن ابراہیم خطابی نے کی۔ بعد کے مشہور شارحین حدیث نے اس سے جابجا استفادہ کیا ہے۔ گرچہ ہر حدیث کی شرح اس تالیف میں نہیں ہے لیکن موضوع سے متعلق امام خطابی نے مکمل کلام کیا ہے۔ ''بذل المجهود في حل ابی داؤد'' مولانا خلیل احمد سہارنپوری پانچ جلدوں میں اس کی شرح لکھی ہے اور یہ مفید علمی وفنی مطالب وابحاث پر مشتمل ہے۔ ''غایۃ المقصود'' اس کو مولانا ابوالطیب شمس الحق عظیم آبادی نے 32 جلدوں میں اس کی شرح لکھی لیکن افسوس یہ طبع نہ ہو سکی اور اس کی صرف پہلی جلد ہی منظر عام پر آپائی۔ ''عون المعبود شرح سنن ابی داود'' اس کی تالیف مولانا شمس الحق ڈیانوی نے کیا ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

16.3.2 امام ابو داؤد سجستانی: مختصر حالات زندگی

امام ابو داؤد کا پورا نام سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمرو بن عمران ہے۔ نام کے مقابلے اپنی کنیت ابو داؤد سے زیادہ مشہور ہیں۔ 202ھ میں خراسان کے مشہور علاقہ سجستان (سیستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کا نسبی تعلق قبیلہ ازد سے تھا۔ اس لئے ازدی بھی کہلاتے ہیں۔ امام ابو داؤد سجستان میں پیدا ہوئے لیکن بصرہ کو اپنی سکونت کے لئے منتخب کیا جہاں اس زمانے میں بڑے ماہرین علم وفن اور فقہا ومحدثین رہتے تھے۔ حدیثوں کو سننے کے لئے کئی بار بغداد بھی گئے۔ اسی طرح حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام، جزیرہ، نیشاپور، مرو اور اصفہان وغیرہ میں مقیم محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بھی استفادہ کیا۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا اور علمائے فن نے ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت کی طرح جرح وتعدیل میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔ اور صحیح وسقیم، قوی وضعیف، مشہور ومنکر اور حسن وشاذ ہر قسم کی روایتوں کے پرکھنے میں ان کو پورا ملکہ حاصل تھا۔ ایک ایسے دور میں جب کہ عالم اسلام میں چاروں طرف بڑے بڑے علماء اور محدثین موجود تھے۔ امام ابو داؤد نے ان کے درمیان نہ صرف اپنی جگہ بنائی بلکہ ائمہ فن میں شمار ہوئے۔ حدیث کے علاوہ فقہ واجتہاد میں بھی انہیں خصوصی بصیرت حاصل تھی۔ 72 سال کی عمر میں 16 شوال جمعہ کے دن 275ھ کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔

امام ابو داؤد نے درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کیا۔ سنن ابی داؤد کے علاوہ متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔
1۔ کتاب الرد علی اہل القدر، 2۔ کتاب الناسخ والمنسوخ، 3۔ کتاب المسائل، 4۔ مسند مالک، 5۔ کتاب المراسیل، 6۔ کتاب المصابیح، 7۔ کتاب المصاحف، 8۔ کتاب البعث و النشور، 9۔ کتاب التفسیر، 10۔ کتاب نظم القرآن، 11۔ کتاب فضائل القرآن، 12۔ کتاب شریعۃ التفسیر، 13۔ کتاب شریعۃ القاری۔

16.4 سنن نسائی

سنن نسائی امام ابو عبد الرحمٰن نسائی کی تالیف ہے۔ امام نسائی نے سنن میں دو کتابیں لکھی تھیں۔ سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ۔ سنن صغری کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور یہی کتاب سنن نسائی کے نام سے صحاح ستہ میں شامل ہے۔ اس کے دوسرے نام 'المجتبیٰ' اور 'المجتنی' بھی ہیں۔ سید ابو الحسن علی ندوی اپنی کتاب 'محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے' میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں کہ امام نسائی جب سنن کبریٰ کی تالیف سے فارغ ہوئے تو اس کو امیر رملہ کی خدمت میں پیش کیا، امیر موصوف نے امام ممدوح سے دریافت کیا کہ اس میں جو کچھ ہے سب صحیح ہے؟ امام صاحب نے فرمایا نہیں! اس پر امیر نے فرمائش کی کہ میرے لیے صرف صحیح روایات کو جمع کر دیجیے، تب امام صاحب نے ان کے لیے سنن صغریٰ تصنیف فرمائی۔ سنن نسائی امام نسائی کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ ہے۔ اور یہی سب سے زیادہ مشہور ہے۔

سنن نسائی کی اہمیت کو بتانے کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کا شمار صحاح ستہ میں ہے۔ عام طور پر صحیحین کے بعد ابو داؤد اور ترمذی کے بعد نسائی کو جگہ دی جاتی ہے۔ تاہم اس کا ذکر بھی ان دونوں کتابوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جس طرح صحاح میں شامل ہر کتاب بعض امتیازی خصوصیات کے سبب دوسروں پر فوقیت رکھتی ہے اسی طرح سنن نسائی بھی بعض ایسی خصوصیات و امتیازات کی حامل ہے جن سے کہ دوسری کتابیں خالی ہیں۔ بعض ائمہ فن نے صحیحین کے بعد نسائی کو رکھا ہے۔ کیوں کہ اس میں سب سے کم ضعیف حدیثیں ہیں۔ اور اس کے رجال زیادہ قوی ہیں۔ اسی طرح بعض علما کے خیال میں قبول روایت کے لئے نسائی کے شرائط امام بخاری اور امام مسلم سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ بہر حال اتنا طے ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم کی طرح امام نسائی نے صرف صحیح سند والی حدیثیں ہی اپنی کتاب میں بیان کی ہیں اور اگر کہیں کم تر درجہ کی حدیثیں بیان کی ہیں تو ان کے ضعف کو بیان کر دیا ہے۔ بعض لوگوں کے مطابق سنن نسائی میں بیان کی گئی حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار سات سو اکسٹھ (5761) ہے۔

16.4.1 سنن نسائی کی خصوصیات

سنن نسائی کی سب سے اہم خصوصیت اس کے شرائط ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ امام بخاری و مسلم سے بھی سخت ہیں۔ امام نسائی نے نہ صرف ان بعض راویوں سے حدیثیں نہیں لی ہیں جن سے کہ ابو داؤد و ترمذی نے روایت کی ہے بلکہ بخاری و مسلم کے راویوں کی ایک جماعت سے بھی حدیثیں لینے سے اجتناب کیا ہے۔ سنن نسائی کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اس میں حدیث کی علتوں کو بیان کر دیا گیا ہے۔ امام نسائی کو اللہ رب العزت کی بارگاہ سے جرح و تعدیل اور نقد و نظر کا غیر معمولی ملکہ عطا ہوا تھا۔ سنن نسائی، بخاری اور مسلم دونوں کے طریقوں کی جامع ہے۔ غریب الفاظ اور مبہم چیزوں کی وضاحت جیسی سنن نسائی میں کی گئی ہے حدیث کی دوسری کتابیں اس سے خالی ہیں۔ اس کتاب میں راویوں اور روایات کا موازنہ کر کے صحیح روایات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ سنن نسائی میں متعدد فوائد کے پیش نظر ایک ہی روایت کو کئی جگہوں پر ذکر کیا گیا ہے۔ سنن نسائی فقہ و اجتہاد اور نظر و استدلال کی حیثیت سے بھی نہایت جامع ہے۔ کیوں کہ امام نسائی خود

بلند پایہ مجتہد اور فقیہ تھے۔ سنن نسائی کی تالیف و ترتیب میں حسن اور موزونیت پائی جاتی ہے۔ ابن رشید کا بیان ہے کہ سنن نسائی تمام کتب سنن میں تصنیف و ترتیب کے لحاظ سے زیادہ بہتر اور عمدہ ہے۔

شروحات و تعلیقات سنن نسائی

صحاح ستہ کی دیگر کتابوں کی طرح سنن نسائی کی بھی متعدد شرحیں اور تعلیقات لکھی گئی ہیں۔ البتہ دوسری کتابوں کے مقابلے میں اس کے شروح و حواشی اور تعلیقات کی تعداد کم ہے۔ اس طرح دنیا کی مختلف زبانوں میں سنن نسائی کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے سنن نسائی پر تعلیق لکھی جس کا نام ''زہر الربی'' رکھا۔ ''تعلیقات سندی'' اس کو علامہ محمد بن عبد الهادی سندی نے دیگر صحاح کتب کی طرح امام نسائی کی سنن کا بھی حاشیہ لکھا ہے جو علامہ سیوطی کی شرح سے جامع اور مفید معلومات پر مبنی ہے۔ محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی ''التعلیقات سلفیہ'' نہایت جامع اور لطیف تعلیقات شمار کی جاتی ہے۔ موصوف نے اس میں زہر الربی سیوطی، حاشیہ سندھی اور شیخ حسین بن محسن انصاری کے حواشی کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ مسائل فقہیہ پر مختصر مگر جامع اور تسلی بخش نوٹ دے کر تعلیقات کو مزید حسن و زیبائش سے آراستہ کیا ہے۔ سنن نسائی کی سب سے موٹی اور تفصیلی شرح محمد بن علی بن آدم الاثیوبی ''ذخیرۃ العقبی فی شرح المجتبی'' کے نام سے لکھی ہے جو دارالمعراج ریاض سے چالیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

16.4.2 امام ابو عبد الرحمن نسائی: مختصر حالات زندگی

امام نسائی کا پورا نام احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار ہے۔ اپنی کنیت ابو عبد الرحمن سے زیادہ مشہور ہیں۔ 214یا 215ھ میں امام نسائی خراسان کے مشہور شہر نساء میں پیدا ہوئے۔ نساء پرانے زمانے سے ہی علم و فن اور ارباب کمال کا مرکز رہ چکا ہے۔ اور وہاں پر بہت سے نامور علماء پیدا ہوئے ہیں۔ نساء کی نسبت سے ہی امام صاحب نسائی کہلاتے ہیں۔ نساء چوں کہ خراسان میں ہے اس لئے انہیں خراسانی بھی کہا جاتا ہے۔

امام نسائی کی ابتدائی زندگی کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ تاہم ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ اس زمانے کے دستور کے مطابق انہوں نے خراسان میں جو کہ علم و فن کا بڑا مرکز تھا تعلیم کے ابتدائی منازل طے کئے۔ بعد ازاں مختلف علاقوں اور شہروں کا سفر کیا۔ ان کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد بے شمار ہے۔ جو مختلف علوم و فنون میں اپنے زمانے کے ماہرین فن تھے۔ صحاح ستہ کے مؤلفین میں سے امام بخاری اور امام ابو داؤد سجستانی سے انہیں شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ تیسری صدی ہجری کا امتیاز یہ ہے کہ اس صدی میں سب سے زیادہ اور بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے۔ امام نسائی کا تعلق بھی اسی صدی سے ہے۔ اور انہوں نے اپنی محنت سے اس علم میں جو تبحر اور کمال پیدا کیا وہ انہیں کا حصہ ہے۔ بارگاہ رب العزت سے انہیں غیر معمولی قوت حافظہ عطا ہوئی تھی۔ وہ فن جرح و تعدیل کے ماہر تھے۔ اور حدیث کے مشہور ناقدوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ علم حدیث کے علاوہ دوسرے دینی علوم میں بھی انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ فقہ و اجتہاد کے علاوہ قرأت و تفسیر کے علوم پر انہیں بھرپور دسترس حاصل تھی۔ فقہ و اجتہاد میں کمال کے سبب ہی امام نسائی حمص میں قضا اور ولایت (گورنری) کے منصب پر بھی فائز ہوئے۔ زہد و تقویٰ اور عبادت و اخلاق میں بھی امام نسائی بلند مقام پر فائز

تھے۔

سن 303ھ میں امام نسائی کی وفات بہت ہی مظلومانہ انداز میں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب میں ایک کتاب ''خصائص علیؓ'' لکھی تھی۔ اسے انہوں نے جامع دمشق میں سنانا شروع کیا۔ ابھی تھوڑا ہی حصہ پڑھا تھا کہ ایک شخص نے پوچھا کہ امیر معاویہ کے مناقب بھی لکھے ہیں۔ امام نسائی نے کہا کہ امیر معاویہ کی شخصیت اور نجات سے انکار نہیں لیکن ان کے مناقب حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ایسے نہیں کہ ان کو لکھوں۔ اس پر شامی (جو زیادہ تر امیر معاویہ کے حمایتی تھے) ان پر ٹوٹ پڑے اور اتنا مارا کہ ان میں اٹھنے کی سکت بھی نہ رہی۔ ابھی جان باقی تھی، لوگ انہیں رملہ (فلسطین) لے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ اور تدفین عمل میں آئی۔

امام نسائی کی تصنیفات یہ ہیں: (1) خصائص سیدنا علیؓ، (2) مسند علیؓ، (3) مسند مالک، (4) کتاب الضعفاء والمتروکین، (5) کتاب الجمعہ، (6) کتاب التمییز، (7) کتاب المدلسین، (8) فضائل الصحابہ۔ خصائص سیدنا علیؓ میں حضرت علی کے فضائل و مناقب بیان ہوئے ہیں۔ اور کتاب الضعفاوالمتروکین میں ضعیف اور متروک الحدیث راویوں کا حروف تہجی کے اعتبار سے ذکر ہوا ہے۔

16.5 سنن ابن ماجہ

امام ابن ماجہ کی تالیف ہے۔ اس کو ان کی زندگی کا سب سے بڑا علمی و تصنیفی اور دینی کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں حدیث کی جو کتابیں رائج اور متداول ہیں ان میں سنن ابن ماجہ ایک اہم کتاب ہے اور اکثر اسلامی مدارس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ سنن ابن ماجہ حدیث کی ان چھ مشہور اور معتبر کتابوں میں شامل ہے جو صحاح ستہ یا کتب ستہ کہلاتی ہیں۔ علماء حدیث نے اس کو اسلامی علوم کی اہم اور علم حدیث کی امہات کتابوں (بڑی) میں شمار کیا ہے۔ سنن ابن ماجہ امام ابن ماجہ کے علمی تبحر اور کثرت معلومات کا مظہر ہے۔ اس کی اہمیت کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ امام ابن ماجہ کے استاذ حافظ ابوزرعہ جو اپنے زمانے کے باکمال محدث گزرے ہیں، کا قول ہے کہ اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی تو حدیث کی سب یا اکثر کتابیں بالکل معطل ہو جائیں گی۔

اسی اہمیت اور عظمت کے پیش نظر سنن ابن ماجہ کو ہر زمانے اور ہر دور میں نہایت مستند اور قابل حجت کتاب مانا گیا ہے۔ محدثین نے اس کتاب کو صحیحین اور سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے۔ اور اس کی روایتوں کو حجت مانا ہے۔ البتہ علمائے حدیث کی ایک مختصر تعداد ہے جو اسے صحاح ستہ میں شامل نہیں کرتی اس کے بجائے ان کی اکثریت مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کرتی ہے جب کہ چند لوگ سنن دارمی کو صحاح میں شمار کرتے ہیں۔ سنن حدیث کی عام کتابوں کی طرح سنن ابن ماجہ میں بھی ایمانیات سے وصایا تک جملہ ابواب فقہی ترتیب کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ سنن 32 کتابوں، 1500 ابواب اور چار ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔ امام ابن ماجہ سے ان کے متعدد شاگردوں نے اسے روایت کیا ہے۔

16.5.1 سنن ابن ماجہ کی خصوصیات

صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کو آخری درجہ پر رکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ کتاب متعدد خصوصیتوں کی حامل ہے۔ سنن ابن ماجہ

میں ایسی بہت سی حدیثیں موجود ہیں جن سے کہ صحاح ستہ کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔ یہی وہ اہم خصوصیت ہے کہ جس کی بنا پر علماء فن حدیث نے اس کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے۔ حسن ترتیب اور ابواب بندی کے لحاظ سے حدیث کی تمام کتابوں اور صحاح ستہ میں یہ نمایاں اور ممتاز ہے۔ یعنی سنن ابن ماجہ میں حدیثوں کو انتہائی خوبی کے ساتھ بغیر کسی تکرار کے اور اختصار کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ یہ خوبی دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔ عدم تکرار اور اختصار کے باوجود سنن ابن ماجہ کی خوبی یہ ہے کہ یہ نہایت ہی جامع کتاب ہے۔ اور دوسری کتابوں کے مقابلہ زیادہ مسائل اور معلومات پر مشتمل ہے۔ سنن ابن ماجہ میں 5 ثلاثی روایتیں شامل ہیں۔ اس خصوصیت میں اس کو صحیح بخاری کے علاوہ صحاح کی تمام کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔ حدیث کی کتابوں کی عام خصوصیات یعنی متعدد اور طرح طرح کی تشریحات اور حدیث کی مختلف قسموں کی وضاحتیں وغیرہ سنن ابن ماجہ میں بھی موجود ہیں۔

شروحات ابن ماجہ

کئی مشہور و معروف محدثین نے سنن ابن ماجہ کی شروحات و تعلیقات لکھی ہیں۔ سنن ابن ماجہ پر سب سے پہلے حافظ مغلطائی نے ایک تفصیلی شرح لکھی لیکن وہ نامکمل رہی۔ عرف عام میں اس شرح کو "شرح مغلطائی" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ "الديباجه في شرح سنن ابن ماجه" یہ شرح کمال الدین محمد بن موسیٰ الدمیری کی ہے جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح سے علامہ سیوطی نے ابن ماجہ کی شرح "مصباح الزجاجه" کے نام سے لکھی ہے جو حاشیہ کی صورت میں ہے۔ "حاشيه بر سنن ابن ماجه" مولانا فخر الحسن گنگوہی یہ مشہور و معروف حاشیہ ہے اس کے اندر علامہ سیوطی اور مولانا عبد الغنی مجددی دونوں کی شرحوں کا مزید اضافہ کے ساتھ جمع کیا ہے۔ "ماتمس اليه الحاجه اور ابن ماجه علم حديث" یہ دونوں مولانا عبد الرشید نعمانی کی تصنیف ہیں ان میں سنن ابن ماجہ اور علم حدیث پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے حدیث کے طالب علموں کے لیے ان کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

16.5.2 امام ابن ماجہ: مختصر حالات زندگی

امام ابن ماجہ کا پورا نام محمد بن یزید بن عبد اللہ ہے۔ ابو عبد اللہ کنیت اور ابن ماجہ لقب ہے۔ ماجہ ان کے والد کا لقب تھا۔ یہ لفظ اصل میں ماہ یا ماہچہ کا معرب ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابن ماجہ اصلاً عجمی نژاد تھے۔ 209ھ میں ایران کے مشہور شہر قزوین میں پیدا ہوئے۔ اس نسبت سے قزوینی بھی کہلاتے ہیں۔ تیسری صدی ہجری ان کا بھی زمانہ ہے۔ اس لئے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں ہر طرف اور ہر جگہ حدیث اور علوم حدیث کا چرچا تھا۔ اور اس کی طلب و تکمیل کو ہی فضل و کمال کا اصل معیار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ابن ماجہ کی توجہ کا مرکز بھی یہی متبرک فن بنا۔ اور انہوں نے اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ ان کی تالیف سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شمار کی گئی۔

امام ابن ماجہ کے ابتدائی حالات کا علم بہت کم ہے۔ 21-22 سال کی عمر تک اپنے وطن قزوین کے علماء و مشائخ سے تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اس زمانے کے دستور کے مطابق انہوں نے بھی دنیائے اسلام کے مختلف ملکوں کا سفر کر کے حدیث اور دیگر علوم حاصل کئے اور اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ حدیث کے در پر حاضر ہو کر ان سے حدیثیں سیکھیں۔ علم و فضل کی طرح تدین و تقویٰ اور زہد و صلاح میں

بھی باکمال تھے اور احکام شریعت کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ 22 رمضان المبارک 273ھ کو 64 سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور دوسرے دن تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ امام ابن ماجہ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں سنن کے علاوہ دو اہم یادگاریں چھوڑی ہیں: (1) تفسیر، یہ ایک اہم ماثور و منقول تفسیر ہے۔ اس میں احادیث اور آثار صحابہ و تابعین کو سند کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ علامہ سیوطی نے اس کا تذکرہ تفسیر ابن جریر کے ساتھ کیا ہے۔ (2) تاریخ، امام ابن ماجہ کو تاریخ میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ یہ عہد صحابہ سے لے کر ان کے اپنے زمانہ تک کی تاریخ ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اسلامی علاقوں اور حدیث کے راویوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ اہم کتاب دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی۔

16.6 فرہنگ

فہم و فراست	:	عقل اور سمجھ
توابع	:	مطیع، فرماں بردار، ماتحت
متداول	:	جس کا چلن ہو، مروج، رائج، عام
تلخیص	:	خلاصہ، خلاصہ کرنا، مختصر ہونا، پاک صاف کرنا، خالص بنانا
مستخرجات	:	نتائج، معلومات

16.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جامع ترمذی امام ترمذی کی مشہور و معروف تالیف ہے۔ جامع ترمذی میں مصنف نے صحاح کی بنیادی شرطوں یعنی راوی کا اسلام، فہم و فراست، صداقت، عدم تالیس، عدالت مع جملہ شرائط حفظ، ضبط، تیقظ، عدم وہم، سلامت ذہن اور صحت عقیدہ کو عام طور پر ملحوظ رکھا ہے۔
- ترمذی کی ہر روایت کسی نہ کسی عالم کے نزدیک قابل عمل اور قابل حجت ہے۔ جامع ترمذی میں روایت حدیث میں تکرار بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس روایت میں بھی جرح و تعدیل کے اصولوں کے مطابق کوئی کمی ہے، مصنف نے اس کے عیب و ہنر کا ظاہر کر دیا ہے۔ مثلاً لکھ دیتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف، مرسل ہے یا مضطرب وغیرہ۔
- امام ترمذی امام بخاری کے خاص تلامذہ میں سے تھے اور ان سے آپ نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ امام ترمذی کی تین کتابوں کا نام ملتا ہے۔ ان میں ایک جامع ترمذی ہے دوسری کتاب شمائل ترمذی ہے جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اخلاق کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسری کتاب "کتاب العلل" ہے۔

- سنن ابی داؤد احکام و مسائل کے احادیث پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب فقہی احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ شمار کی جاتی ہے۔
- سنن نسائی میں صرف صحیح سند والی حدیثیں بیان کی گئی ہیں اور اگر کہیں کم تر درجہ کی حدیثیں ہیں تو امام نسائی نے اس کے ضعف کو بیان کر دیا ہے۔
- سنن ابن ماجہ میں حدیثوں کو انتہائی خوبی کے ساتھ بغیر کسی تکرار کے اختصار کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، یہ کتاب مسائل اور معلومات پر مشتمل ہے اس میں پانچ ثلاثی روایتیں شامل ہیں۔ اس وقت حدیث کی جو کتابیں رائج اور متداول ہیں ان میں سنن ابن ماجہ کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب امام ابن ماجہ کے علمی تبحر اور کثرت معلومات کا مظہر ہے۔

16.8 نمونہ امتحانی سوالات

16.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. امام ترمذی کی ولادت کب ہوئی؟

(a). 209ھ (b). 221ھ (c). 309ھ (d). سب غلط

2. "سنن ترمذی" میں احادیث مقصودہ کی تعداد ہے:

(a). 750 (b). 1171 (c). 1235 (d). 1385

3. عبدالرحمن مبارکپوری کی تصنیف کا نام ہے:

(a). تحفۃ الاحوذی (b). قوت المغتذی (c). الرحیق المختوم (d). عارضۃ الاحوذی

4. "کتاب العلل" کے مصنف کون ہیں؟

(a). امام مسلم (b). امام ابو داؤد (c). امام ترمذی (d). امام مالک

5. میرے اس مجموعے احادیث میں صرف 4 حدیثیں انسان کو دین پر عمل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کس کا قول ہے؟

(a). امام بخاری (b). امام مسلم (c). امام مالک (d). امام ابو داؤد

6. ابو عبدالرحمن کس کی کنیت ہے؟

(a). امام نسائی (b). امام ترمذی (c). امام ابو داؤد (d). سب غلط

7. "خصائص سیدنا علیؓ" کس کی تصنف ہے؟

(a). امام ترمذی (b). امام مالک (c). امام نسائی (d). امام ابن ماجہ

8. سنن ابن ماجہ میں کتنی ثلاثی روایتیں شامل ہیں؟

(a). 12 (b). 03 (c). 05 (d). ایک بھی نہیں

9. امام ابن ماجہ کا کتنی سال کی عمر میں انتقال ہوا؟

(a).64سال (b).53سال (c).50سال (d).60سال

10. امام ابو داؤد کس جگہ پیدا ہوئے؟

(a).ترمذ (b).سجستان (c).نساء (d).بخارا

16.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. امام ترمذی کی حالات زندگی قلم بند کیجیے۔
2. سنن ابن ماجہ کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے امام ابن ماجہ پر نوٹ لکھیے۔
3. امام ابو داؤد سجستانی کی خدمات حدیث پر روشنی ڈالیے۔
4. امام نسائی کی حالات زندگی کو قلم بند کیجیے۔
5. جامع ترمذی و سنن ابی داؤد کی شروحات کا جائزہ لیجیے۔

16.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. جامع ترمذی کی امتیازی خصوصیات کے ساتھ امام ترمذی کی خدمات حدیث کا تذکرہ کیجیے۔
2. سنن ابو داؤد کا تعارف اس طرح پیش کیجیے کہ اس کی خصوصیات واضح ہو جائیں۔
3. سنن نسائی پر ایک تعارف کراتے ہوئے امام نسائی کی خدمات حدیث کا جائزہ لیجیے۔

16.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تدوین حدیث : مولانا مناظر احسن گیلانی
3. تذکرۃ المحدثین : مولانا ضیاء الدین اصلاحی
4. علم حدیث: ایک تعارف : محمد فاروق خاں
5. علم الحدیث : صبحی صالح، اردو ترجمہ غلام احمد حریری
6. معجم اصطلاحات الحدیث : ضیاء الرحمن اعظمی، اردو ترجمہ سہیل حسن

معروضی سوالات کے جوابات

1. A	2.D	3. A	4. C	5. D
6. A	7. C	8.C	9.A	10. B

بی۔اے، اسلامک اسٹڈیز

پہلا پرچہ: دوسرا سمسٹر

(قرآن اور حدیث)

جملہ نمبرات:70 **وقت:3 گھنٹے**

ہدایات:

1. حصہ اول میں 10 لازمی سوال ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ کو پر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے ایک نمبر مختص ہے۔ 10x1=10

i. اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ شخص کون ہے؟

(a). جس کے پاس تقوی ہو (b). مالدار ہو (c). مسلمان ہو (d). عالم دین ہو

ii. قرآن مجید کی نگاہ میں خلیفہ کی زمین میں حیثیت ہے؟

(a). نائب (b). مالک (c). آقا (d). ان میں سے کوئی نہیں

iii. کس سورۃ میں قرآن کے شب قدر میں نازل ہونا ثابت ہے؟

(a). الفاتحہ (b) القیامہ (c) القدر (d) الواقعہ

iv. کس صحابی کے کہنے پر حضرت ابو بکرؓ نے قرآن کی تدوین کا کارنامہ انجام دیا۔

(a). حضرت علیؓ (b). حضرت عثمانؓ (c). حضرت عمرؓ (d). حضرت خالدؓ

v. تفسیر کا دوسرا ماخذ کیا ہے؟

(a). قرآن (b). فقہ (c). اجماع (d). حدیث

vi. "فیہ کل شیء إلا التفسیر" کس تفسیر کے بارے میں کہا گیا ہے۔

(a). تفسیر قرطبی (b). تفسیر بیضاوی (c). تفسیر کبیر (d). تفسیر الکشاف

vii. ترجمان القرآن کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a). غلام رسول مہر (b). ابو الکلام آزاد (c). امین احسن اصلاحی (d). محمود حسن

viii. حدیث کے میدان میں سب سے نمایاں خدمات صحابیات میں سے کس کی ہیں؟

(a). حضرت ام سلمہؓ (b). حضرت عائشہؓ (c). حضرت خدیجہؓ (d). حضرت زینبؓ

ix. تدوین حدیث کا باقاعدہ انتظام کس کے عہد میں ہوا؟

(a). عمر بن خطاب (b). عمر بن عبد العزیز (c). عبد الملک بن مروان (d). سلیمان بن عبد الملک

x. "فتح الباری" کس حدیث کی کتاب کی شرح ہے؟

(a). صحیح بخاری (b). جامع ترمذی (c). سنن ابن ماجہ (d). موطا امام مالک

(ب) حصہ دوم آٹھ سوالات پر مشتمل ہے اور پانچ سوالات کے جوابات دینے ہیں ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبر مختص ہیں۔ **6x1=6**

2. قرآنی تعلیمات میں اخلاق کے نمایاں پہلو پر بحث کریں۔
3. قرآن کے نقطہ نگاہ سے سیاست و حکومت کے مقاصد کو لکھیے۔
4. کاتبین وحی کا تعارف پیش کیجیے۔
5. تفسیر کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالیے۔
6. تفسیر طبری کی خصوصیات پر گفتگو کیجیے۔
7. حدیث کی ضرورت پر روشنی ڈالیے۔
8. صحیح مسلم کی خصوصیات کا تعارف کرایے۔
9. امام بخاری کے حالات زندگی کا تذکرہ کیجیے۔

(ج) حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً 500 لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبر مختص ہیں۔

10. تعلیمات وحی اور اس کی قسموں کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔
11. عہد عثمانی میں تدوین قرآن کا پس منظر بیان کیجئے
12. تفسیر بیان القرآن پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
13. تدوین تفسیر کے مختلف مراحل پر ایک جامع مضمون قلمبند کیجیے۔
14. کتابت حدیث کی اجازت کے بارے میں اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔

اہم نکات